دروس القرآن

۳

متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن حفظہ اللہ

مرکز اہل السنۃ والجماعۃ

نام کتاب .... دروس القرآن جلد سوم

تالیف: .... مولانا محمد الیاس گھمن

تاریخ اشاعت .... مارچ 2020ء

بار اشاعت .... اوّل

تعداد اشاعت 1100

ناشر .... مکتبہ اہل السنۃ والجماعۃ

ملنے کا پتہ

مکتبہ اہل السنۃ والجماعۃ، 87 جنوبی لاہور روڈ سرگودھا

0321-6353540
0335-7500510

www.ahnafmedia.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

سورۃ الفرقان ---------------------- 174

سورۃ القصص ---------------------------- 271

سورۃ الروم ---------------------- 342

سورۃ لقمٰن ---------------------- 356

سورۃ السجدۃ ---------- 373

سورۃ سبا-------------------------- 477

سورۃ الحج

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمۡ ۚ اِنَّ زَلۡزَلَةَ السَّاعَةِ شَىۡءٌ عَظِيۡمٌ‏ ﴿۱﴾﴾

بعث بعد الموت کی دلیل؛ تخلیق انسانی

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّنَ الۡبَعۡثِ فَاِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ مِنۡ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنۡ مُّضۡغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيۡرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَـكُمۡ﴾

اللہ رب العزت نے قیامت کا ذکر فرمایا اور دوبارہ اٹھائے جانے پر بطور دلیل کے انسان کی تخلیق کو بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں کیسے بنایا ہے کہ تمہاری غذا کا بنیادی عنصر مٹی ہے، مٹی سے پھر غذائیں نکلتی ہیں، انسان وہ غذائیں کھاتا ہے تو ان غذاؤں سے پھر نطفہ بنتا ہے، وہ باپ کی پیٹھ سے ہو کر ماں کے رحم میں جاتا ہے، اس کے بعد پھر خون بنتا ہے اور جم کر ایک لوتھڑے کی شکل اختیار کر جاتا ہے، پھر بوٹی بنتی ہے، پھر ان میں ہڈی آتی ہے، پھر اس سے بعض مرتبہ بچے کے اعضاء پورے بن جاتے ہیں اور بعض اوقات پورے نہیں بن پاتے۔ پھر بعض مرتبہ عورت جو بچہ جنتی ہے وہ صحیح سالم اعضاء کے ساتھ جنتی ہے اور بعض مرتبہ اسے انہی ناقص اعضاء کے ساتھ اسقاط

ہو جاتا ہے اور بعض مرتبہ بچہ پیدا ہوتا ہے اور ناقص اعضاء کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ تو اس ترتیب کے ساتھ اور ان مراحل سے گزر کر بچہ ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے۔

جب کوئی نمونہ سامنے نہ ہو تو بنانا مشکل ہوتا ہے اور جب نقشے سامنے آجائیں تو پھر بنانا بہت آسان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ابتدائی تخلیق کی تو دوبارہ اسے بنانا کیا مشکل ہے؟! انسان کی پیدائش اللہ تعالیٰ آناً فاناً فرما سکتے تھے کہ ارادہ فرمائیں اور انسان بن جائے لیکن ایسا نہیں کیا بلکہ تدریجاً نو ماہ میں انسان کو پیدا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات سمجھائی ہے کہ دنیا میں کام اچانک نہیں ہوتے تدریجاً ہوتے ہیں اس لیے جلد بازی کا مزاج مناسب نہیں ہے، بندے کو اپنی باری اور اپنے وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔

پہلے بچپن پھر جوانی پھر بڑھاپا بعض بچپن دیکھتے ہیں تو جوانی نہیں دیکھ پاتے اور بعض جوانی دیکھتے ہیں تو بڑھاپا نصیب نہیں ہوتا لیکن عام معمول یہی ہے۔

پھر اس امت محمدیہ کی اوسطاً عمر 60 اور 70 سال کے درمیان ہے۔ تو ہر انسان کو اپنا بچپن اور جوانی ذہن میں رکھنی چاہیے۔ ہر آنے والا دن انسان کی عمر کو گھٹاتا ہے، گھٹتی ہوئی عمر پر انسان کو خوش نہیں ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے مختصر زندگی دی ہے آخرت کی تیاری کے لیے اس لیے ہمیں اس میں آخرت کی فکر اور آخرت کی تیاری کرنی چاہیے۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سن ہجری کو رواج دیں!

آج یکم جنوری 2019ء ہے۔ دنیا بھر میں سارے لگے ہوئے ہیں علماء بھی اور غیر علماء بھی اور ہر کوئی معافیاں مانگتا پھر رہا ہے کہ پچھلے سال کے گناہ معاف کر دیں۔ معافی مانگنا تو ٹھیک ہے، اپنے اعمال کا احتساب کرنا بھی ٹھیک ہے، غور بھی کرنا چاہیے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سارا زور یکم جنوری پر کیوں ہوتا ہے! یکم محرم پر کیوں نہیں ہوتا! یکم محرم کے موقع پر بھی سال ختم ہو رہا ہے اور نیا سال شروع ہو رہا ہے۔ تو دیکھو! اتنی

محنت کی ہے اغیار نے سن عیسوی کو عام کرنے کی اور ہمارے مسلمانوں کا جو اصل حساب ہے وہ سن ہجری پر ہی ہے، ہجری شمسی بھی ہوتا ہے اور ہجری قمری بھی ہوتا ہے۔ اس وقت افغانستان میں جو سن کی ترتیب ہے وہ ہجری شمسی ہے اور شریعت میں اصل ہجری قمری ہے۔ تو ہجری شمسی بھی دنیا میں چل رہے ہیں لیکن اصل ہجری قمری ہے جس پر احکام شریعت کا مدار ہے۔ تو ہمیں اپنے سالِ ہجری کو ہی رواج دینا چاہیے اس کا تذکرہ کرنا چاہیے اور اغیار سے بالکل متاثر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے، متاثر وہ ہوتا ہے جس نے اپنی فکر آئندہ نسلوں کو نہ دینی ہو اور جب اپنی فکر آئندہ نسلوں میں منتقل کرنی ہو تو پھر بندہ کسی سے متاثر نہیں ہوتا۔ ہم نے اپنے اکابر کی میراث محفوظ کرنی ہے اور اسے اگلی نسلوں یعنی اصاغر میں منتقل کرنا ہے، ہم اکابر اور اصاغر کے درمیان میں ہیں، بعد والوں کے لیے اکابر بن جائیں گے اور پہلے والوں کے اصاغر بن جائیں گے، خود کو چھوٹا سمجھتے رہیں گے تو کل والوں کے لیے اللہ بڑا بنادیں گے اور اگر خود کو بڑا سمجھتے رہیں گے تو کل والے بڑا سمجھنا تو بہت دور کی بات ہے آپ کو چھوٹا سمجھنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوں گے۔

عمر انسانی کے مراحل اور احوال:

یہ جو انسان کی عمر کے مختلف مراحل ہیں ان کے بارے میں ایک روایت میں آتا ہے کہ جب بچہ نابالغ ہوتا ہے اور کوئی نیک کام کرتا ہے تو اس کا ثواب اس کے والد یا والدین کے نامہ اعمال میں لکھا جاتا ہے اور اگر وہ بچہ کوئی گناہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ یہ گناہ نہ اس بچے کے نامہ اعمال میں لکھتے ہیں اور نہ ہی اس کے والدین کے نامہ اعمال میں لکھتے ہیں۔ جب یہ بچہ بالغ ہو جاتا ہے تو حساب کا قلم اس کے لیے جاری ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ دو فرشتوں کو مقرر کر دیا جاتا ہے اور انہیں کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کی حفاظت کرو اور اعمال کرنے میں اس کو قوت اور طاقت پہنچاؤ۔ جب یہ چالیس سال کی عمر کو پہنچ

جائے اور ایمان کی حالت میں گزارے تو اللہ تعالیٰ اس کو تین امراض سے محفوظ رکھتے ہیں: جنون، جذام اور برص سے۔

پچاس سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اللہ تعالی اس کے حساب کو ذرا ہلکا فرما دیتے ہیں۔ جب ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالی پھر اس کو اپنی طرف محبت کی توفیق دے دیتے ہیں، ساٹھ سے اوپر ستر سال تک پہنچ جائے تو سب آسمان والے اس کو اپنا محبوب بنا لیتے ہیں، جب یہ اَسی سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کے نیک اعمال لکھے جاتے ہیں اور گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں اور جب یہ نوے سال کی عمر تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے سارے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں اور اس کو یہ حق دے دیا جاتا ہے کہ اپنے گھر والوں کی شفاعت کرے۔ اللہ رب العزت اب اس بندے کو ”امین اللہ“ اور ”اسیر اللہ“ کا لقب دیتے ہیں اور جب اگلی عمر کو پہنچ جاتا ہے جسے ”اَرْذَل عمر“ کہتے ہیں تو اس کے وہ اعمال جو وہ جوانی میں کیا کرتا تھا وہ اب برابر اس کے نامہ اعمال میں لکھے جاتے ہیں البتہ جوانی میں جو گناہ کرتا تھا وہ گناہ نہیں لکھے جاتے۔ یہ حالتِ ایمان میں بڑھاپے کی برکت ہے۔

یہ روایت حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ذکر فرمائی ہے۔ روایت اگر چہ ضعیف ہے لیکن امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں اس روایت کو مرفوع اور موقوف دونوں طرح سے نقل کیا ہے۔

سفید بالوں سے حیا:

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ جب انسان اسلام کی حالت میں بوڑھا ہو جاتا ہے، اس کے بال سفید ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کا حیا کرتے ہیں اور اسے

عذاب نہیں دیں گے۔ [1]

مجھے ایک ساتھی نے کہا کہ بندہ اگر سفید بالوں کے ساتھ فوت ہو جائے تو اللہ رب العزت اس کا حیا کرتے ہیں اور اسے عذاب نہیں دیتے لیکن اگر کوئی شخص سفید بالوں پر کلر لگا لے تو کیا اللہ تعالیٰ پھر بھی اس کا حیا کرتے ہیں؟

میں نے کہا کہ جب بندے کو حدیث سمجھ میں آ جائے تو پھر کوئی اشکال نہیں ہوتا، سمجھ میں نہ آئے تو پھر اشکال ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے یہ سمجھا کہ یہاں بال کا سفید ہونا رنگ مراد ہے حالانکہ اس سے انسان کے بڑھاپے کی عمر مراد ہے۔ اب اگر کوئی آدمی بوڑھا ہو جائے اور اس کے بال سفید ہی نہ ہوں تو پھر اس کو یہ فضیلت تو ملنی ہی نہیں چاہیے حالانکہ ایسا نہیں۔ تو سفید بالوں سے یہاں بڑھاپے کی حالت مراد ہے۔ اور ایسا ہوتا ہے کہ بعض مرتبہ بندہ بڑی عمر کا ہوتا ہے لیکن بال سفید نہیں ہوتے بلکہ سیاہ رہتے ہیں۔ حضرت مولانا خالد محمود سومرو شہید رحمۃ اللہ علیہ سندھ والے مجھ سے عمر میں بڑے تھے، ان کے پوتے اور نواسے ہیں لیکن آپ دیکھیں تو ان کے سارے بال سیاہ تھے۔ میں نے ان سے پوچھا تھا کہ ایسا کیوں ہے؟ انہوں نے فرمایا تھا کہ بس میرے بال ہیں ہی سیاہ!

سیاہ خضاب کے علاوہ کا جواز:

اصل چیز ہوتی ہے حدیث پاک کو سمجھنا۔ کل بھی ہندوستان سے ایک عالم نے مجھ سے رابطہ کیا کہ حدیث پاک میں بال کالے کرنے کی ممانعت آئی ہے اور آپ بال کالے کرتے ہیں، اس پر کوئی ایسا جواب دیں کہ ہم مطمئن ہو جائیں۔ میں نے کہا: مطمئن ہونا تو بہت آسان ہے اگر مطمئن ہونا چاہیں تو! سورۃ الرحمٰن میں جنت کے

1۔ کنز العمال: ج15 ص284 رقم الحدیث 42675

باغات کی صفت بیان کی گئی ہے:﴿مُدۡهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾﴾... پودے کا کالا ہونا کمال نہیں ہے بلکہ سبز ہونا یہ کمال ہے۔ تو وہ باغات اتنے گہرے سبز ہوں گے کہ سبز ہونے کے باوجود سیاہ نظر آئیں گے، یہ کمال ہے۔ تو میں نے ان سے کہا کہ میں بال کالے نہیں کرتا بلکہ براؤن کلر لگاتا ہوں، یہ براؤن کلر اتنا ڈارک اور گہرا ہوتا ہے کہ دیکھنے میں میرے بال کالے لگتے ہیں۔ تو کالا ہونا اور ہے اور کالا لگنا اور ہے۔ اب میں نے کہا کہ دلیل تو میں نے دے دی ہے، مطمئن ہوں آپ کی مرضی، مطمئن نہ ہوں آپ کی مرضی۔

پیغمبر پاک کے مخالف کا غیظ و غضب میں جلنا:

﴿مَنۡ كَانَ يَظُنُّ اَنۡ لَّنۡ يَّنۡصُرَهُ اللّٰهُ فِى الدُّنۡيَا وَ الۡاٰخِرَةِ فَلۡيَمۡدُدۡ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لۡيَقۡطَعۡ فَلۡيَنۡظُرۡ هَلۡ يُذۡهِبَنَّ كَيۡدُهٗ مَا يَغِيۡظُ ﴿۱۵﴾﴾

اللہ تعالیٰ جب کسی کو نبوت عطا فرماتے ہیں تو اس نبی کی مدد بھی فرماتے ہیں۔
اس نبی کی مدد کو دیکھ کر پیغمبر کا مخالف حسد کی آگ میں مزید جلتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ سمجھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اپنے نبی کی مدد نہیں کرے گا تو اسے چاہیے کہ وہ ایک رسی لے آسمان پر چڑھ جائے اور وہاں جا کر آنے والی وحی اور رابطے کو کاٹ ڈالے تاکہ نبوت کو ملنے والی اللہ کی مدد آنا ختم ہو جائے اور اگر یہ شخص ایسا نہیں کر سکتا تو پھر اپنے گلے میں رسی ڈال لے اور خودکشی کر کے مر جائے لیکن خدا کی مدد ختم نہیں ہو گی۔ میں نے آیت کی وہ تفسیر کی ہے جس میں ساری روایات جمع ہو جاتی ہیں کیونکہ بعض مفسرین نے یہ رائے قائم فرمائی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ حاسد رسی لے کر آسمان پر چڑھے اور اوپر جا کر اللہ کی آنے والی مدد کو ختم کرے یا وحی کو ختم کرے تاکہ نہ نبی ہو اور نہ مدد آئے اور بعض نے کہا کہ چھت

سے رسی لٹکائے اور گلے میں ڈال لے اور غیظ وغضب میں آکر خودکشی کرکے مر جائے۔ تو میں نے خلاصہ عرض کردیا ہے۔

حق ہمیشہ غالب رہتا ہے:

یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ حق ہمیشہ غالب ہو کر رہے گا اور حق اپنے راستے خود بناتا ہے۔ میں ابھی کراچی میں تھا اور وہاں ہماری خانقاہ کا کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ اندرون سندھ کے دورے پر میرے ساتھ مفتی محمد حسنین صاحب تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کام کے لیے پیسا نہیں بلکہ کام کے لیے بندے کا کام کا ہونا ضروری ہے۔ جب انسان کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ خود اسباب پیدا فرماتے ہیں اور کبھی کبھار آزمائش بھی آتی ہے تو اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ اسباب بھی عطا فرماتے ہیں۔

تمام مخلوق خدا کو سجدہ کرتی ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ﴾

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کو وہ ساری مخلوق سجدہ کرتی ہے جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ نیز سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے اور بہت سارے انسان بھی۔

کتا صاحبِ کمال ہو گیا پر اعتراض کا جواب:

اس آیت کو بطورِ جواب کے میں نے کئی جگہوں پر پیش کیا ہے۔ ”امداد المشتاق الی اشرف الاخلاق“ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ہے۔ مَیں ایک بار ہری پور میں تھا۔ بیان کے بعد دو نوجوان آئے۔ ان کے پاس دو تین کتا

بیں تھیں۔ ان میں سے ایک امداد المشتاق بھی تھی۔ تو وہ کہنے لگے کہ امداد المشتاق میں کچھ واقعات ایسے ہیں جو صریح قرآن کریم کے خلاف ہیں۔ میں نے کہا: کوئی بیان کریں۔ انہوں نے کہا کہ حضرت تھانوی صاحب نے حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کا ایک ملفوظ لکھا ہے کہ حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادی بیٹھے تھے۔ ایک کتا سامنے سے گزرا۔ جنید بغدادی کی نگاہ اس کتے پر پڑ گئی تو وہ کتا اتنا صاحبِ کمال ہو گیا کہ شہر کے کتے اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ وہ کتا ایک جگہ بیٹھا تو باقی کتے اس کے ارد گرد حلقہ بنا کر بیٹھے اور مراقبہ کیا۔[2]

تو وہ نوجوان مجھے کہنے لگے کہ کتے کا کامل ہونا اور کتوں کا مراقبہ کرنا یہ صریح قرآن کریم کے خلاف ہے۔

میں نے کہا: جہاں تک کتے کے کامل ہونے کی بات ہے تو اس کا ذکر تو خود قرآن میں ہے۔ اصحاب کہف تھے اور ان کے ساتھ ایک کتا بھی تھا۔ قرآن کریم نے مقامِ مدح میں اصحاب کہف کے کتے کا ذکر کیا:

﴿وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ﴾[3]

کہ اصحاب کہف کا کتا دہلیز پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے بیٹھا تھا۔

تو اچھا ذکر کرنا یہ کمال کی وجہ سے ہوتا ہے۔ باقی آپ کو شبہ اس لیے پڑا کہ آپ نے کتے کا مقابلہ انسان سے کر دیا۔ جب کتا بمقابلہ انسان ہو گا تو کتا واقعی ناقص ہو گا اور جب کتا بمقابلہ کتا ہو گا تو کوئی کتا کامل ہو گا اور کوئی کتا ناقص ہو گا۔

باقی حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے جو فرمایا تو اس کا معنی یہ

2۔ امداد المشتاق: ص107

3۔ الکہف 18:18

نہیں کہ وہ کتا؛ انسانوں سے کامل ہو گیا بلکہ وہ کتا باقی کتوں سے کامل ہو گیا۔ تو کسی بھی چیز کا مقابلہ کرنا ہو تو اس کا مقابل دیکھا جاتا ہے کہ اس کا مقابلہ کرنا کس سے ہے؟

جنرل کا مقابلہ جنرل سے کریں!

ہم جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد میں پڑھتے تھے۔ ان دنوں جنرل ضیاء الحق کا حادثہ ہوا اور وہ شہید ہو گئے۔ ہمیں استاذ جی شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جمع کیا اور فرمایا کہ آج ایک بہت بڑے ولی کا جنازہ اٹھ گیا ہے۔ پھر فرمانے لگے کہ میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے ذہن میں آئے گا کہ جنرل ضیاء الحق ولی کیسے تھا؟ وہ تو ڈاڑھی منڈاتا تھا، صاحبِ حکومت ہونے کے باوجود بھی اسلام نافذ نہیں کیا تو وہ ولی کیسے؟ پھر خود ہی جواب ارشاد فرمایا کہ آپ کو وہ ولی اس لیے نہیں لگتا کہ آپ اس کا مقابلہ اپنے اساتذہ اور شیوخ سے کرتے ہیں۔ جب اس کا مقابلہ دوسرے صدور سے کریں کہ جو اس سے پہلے پاکستان کے صدر رہتے، انہیں بھی دیکھ لیں اور پھر جنرل ضیاء الحق کو بھی دیکھ لیں تو آپ کو سمجھ میں آئے گا کہ وہ ولی تھا یا نہیں؟

آپ کے علاقہ میں ایک ایس ایچ او آجائے، وہ ڈاڑھی بھی منڈاتا ہو اور شراب بھی پیتا ہو۔ آپ جلسے کی منظوری لینے کے لیے اس کے پاس جائیں اور وہ کہے کہ مولانا صاحب! بیٹھیں اور چائے پییں۔ پھر وہ پوچھے کہ آپ کیسے آئے؟ آپ کہیں جی جلسہ ہے، اجازت لینے آئے ہیں، آپ اجازت دے دیں۔ ایس ایچ او کہے کہ مولانا صاحب! آپ جلسہ کریں، اجازت کی بالکل پروانہ کریں، یہ ہماری ذمہ داری ہے، ہم حفاظت کریں گے۔ آپ بتائیں کہ جب آپ واپس آئیں گے تو آکر کیا کہیں گے؟ ایس ایچ او بہت گندہ ہے یا اچھا ہے؟ (اچھا ہے۔ سامعین) آپ نے کہنا ہے کہ بہت اچھا ہے۔ حالانکہ وہ تو شراب پیتا ہے تو پھر اچھا کیسے ہو گیا؟ اب آپ نے خود کہنا ہے کہ ہم جو اچھا کہہ رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایس ایچ او دین کے راستے میں رکاوٹ

نہیں اور اس سے پہلے جو ایس ایچ او تھا وہ بہت خراب کرتا تھا، یہ اس کے مقابلہ میں بہت اچھا ہے۔

اسی طرح کتے کا کامل ہونا یہ انسان کے مقابلہ میں نہیں بلکہ کتے کے مقابلہ میں ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ کتا مراقبہ کرتا ہے۔ تو میں نے کہا کہ ایک ہے مراقبہ اور ایک ہے سجدہ۔ سجدے کا معنی ہوتا ہے پیشانی زمین پر رکھنا اور مراقبہ کا معنی ہوتا ہے کہ پیشانی کو جھکا دینا۔ قرآن تو کتے کے سجدے کی بات کرتا ہے اور تم کہتے ہو کہ مراقبہ قرآن کے خلاف ہے؟ اس نوجوان نے کہا: قرآن میں کہاں پر ہے کہ یہ چوپایہ بھی سجدہ کرتا ہے؟ میں نے کہا کہ سورۃ الحج میں ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ كَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ﴾[4]

کہ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کو وہ ساری مخلوق سجدہ کرتی ہے جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ نیز سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے اور بہت سارے انسان بھی۔

تو قرآن ﴿وَ الدَّوَآبُّ﴾ کہتا ہے کہ چوپائے بھی خدا کو سجدہ کرتے ہیں اور تم کہتے ہو کہ یہ مراقبہ بھی نہیں کرتے۔ اب بتاؤ کہ امداد المشتاق قرآن کے خلاف کیسے ہوئی؟ اس پر وہ نوجوان لاجواب ہو گئے۔ ماننا نہ ماننا الگ بات ہے۔

جنتی مردوں کا کنگن پہننا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ

4۔ الحج 18:22

تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ یُحَلَّوۡنَ فِیۡهَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَهَبٍ وَّ لُؤۡلُؤًا ؕ وَ لِبَاسُهُمۡ فِیۡهَا حَرِیۡرٌ ﴿۲۳﴾

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اللہ تعالیٰ انہیں ایسے باغات میں داخل فرمائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ وہاں انہیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور موتیوں کے۔ ان باغات میں ان کا لباس ریشم ہو گا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ جنت کو اللہ تعالیٰ جنت میں سونے کے کنگن پہنائیں گے اور موتیوں کے کنگن پہنائیں گے اور سورۃ الدھر میں ہے:

﴿وَّ حُلُّوۡۤا اَسَاوِرَ مِنۡ فِضَّةٍ﴾[5]

کہ ان کو چاندی کے کنگن پہنائیں گے۔

تو تین قسم کے کنگن اہلِ جنت مردوں کو پہنائیں جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کنگن تو زیور ہے اور زیورات عورتیں پہنتی ہیں۔ یہاں جنتی مردوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہیں کنگن پہنائے جائیں گے حالانکہ مردوں کا زیورات پہننا معیوب ہوتا ہے تو ان کو کیوں پہنائے جائے گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے عام لوگوں کا لباس اور ایک ہوتا ہے بادشاہوں کا لباس۔ عام لوگ تاج نہیں پہنتے لیکن بادشاہ تاج پہنتے ہیں کیونکہ یہ شاہی اعزاز ہوتا ہے، دنیا میں عام لوگ کنگن نہیں پہنتے لیکن بادشاہ پہنتے ہیں کیونکہ یہ بھی شاہی اعزاز ہوتا ہے، تو جنتی مردوں کو بھی جنت میں جو کنگن پہنائے جائیں گے تو یہ شاہی اعزاز کی وجہ سے ہو گا اور شاہی اعزاز کی وجہ سے کنگن پہننا معیوب نہیں بلکہ عزت کی بات ہے۔

5۔ الدھر 21:76

کنگن پہننا شاہی اعزاز ہے:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے مدینہ ہجرت کر کے جا رہے تھے۔ ابو جہل اور اس کے ساتھیوں نے اعلان کیا تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سر کی قیمت سو سو اونٹ ہیں۔ انہیں کوئی زندہ لائے یا ان کا سر لائے تو اسے سو اونٹ ملیں گے۔ تو جو انعام اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر رکھا وہی انعام صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر رکھا۔ دشمن بھی جانتا تھا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اہمیت کتنی ہے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر کی قیمت کا لگ جانا یہ عیب نہیں ہے بلکہ یہ پیغمبر کی سنت سے ثابت ہے، ہم اس کو اعزاز نہیں سمجھتے اس لیے اس پر بہت پریشان ہوتے ہیں۔ تو کئی لوگ ان کی تلاش میں نکلے۔ سراقہ بن مالک بھی نکلے۔ اس وقت تک وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ ان کا گھوڑا بحکم خداوندی گھٹنوں سمیت زمین میں دھنس گیا۔ انہوں نے یہ معاملہ دیکھ کر توبہ کی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے گھوڑا نکل آیا۔ اس وقت اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ بشارت دی کہ سراقہ ایک وقت آئے گا کہ فارس کے بادشاہ کسریٰ کے کنگن مالِ غنیمت میں مسلمانوں کے پاس آئیں گے جو تمہیں ملیں گے۔

سراقہ بن مالک رضی للہ عنہ مسلمان ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ دنیا سے تشریف لے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور آیا۔ فارس فتح ہو گیا اور کسریٰ کا مال غنیمت کے طور پر مسلمانوں کے پاس آیا تو سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ آئے اور کہا کہ بادشاہ کے کنگن مجھے دے دیں کیونکہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ وہ کنگن تمہیں ملیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مال غنیمت جمع کرو، جمع کیا تو اس میں کنگن نہیں تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کنگن لاؤ، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اس لیے اس میں کنگن ضرور ہوں گے۔ جب کچھ بوریوں

کو جھاڑا گیا تو ان میں سے کنگن نکل آئے۔ چنانچہ وہ کنگن حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کو دے دیے گئے۔

اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ بادشاہ کنگن پہنتے تھے۔ تو جنت کا ماحول بھی بادشاہوں کی طرح ہو گا۔ ہر آدمی کی اپنی جنت ہو گی اور وہ اس کا بادشاہ ہو گا۔ ایسا بادشاہ کہ ﴿وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿٣١﴾﴾ [6] یعنی بندہ جس چیز کی خواہش کرے گا اور جو مانگے گا اسے وہی ملے گا۔ تو بادشاہ تاج بھی پہنتے ہیں اور کنگن بھی پہنتے ہیں اس لیے جنت میں کنگن پہننا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

دین کی فہم بہت بڑی نعمت ہے:

یہ بات میں پہلے بھی سمجھا چکا ہوں کہ دین کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ یہ جو آواز لگتی ہے کہ دل تھوڑا سا بڑا رکھو! کسی اور کو بھی جنت میں جانے دو! اللہ کی جنت بہت بڑی ہے! صرف تم نے ہی جنت میں جانا ہے؟ کیا اتنی بڑی جنت کا خدا نے اچار ڈالنا ہے؟!- العیاذ باللہ- یہ نا سمجھی کی بات ہے۔ سب سے آخری شخص جو جنت میں جائے گا اس کی جنت دنیا سے دس گنا بڑی ہو گی لیکن اس دس گنا بڑی جنت میں بندہ ایک ہی ہو گا، دو نہیں ہوں گے۔ کوئی فرشتہ یہ نہیں کہے گا کہ یا اللہ! دنیا سے دس گنا بڑی جنت ہے، اس میں دو چار اور بندے بھی اس میں بھیج دیں! ایسا نہیں ہو گا بلکہ اس میں صرف ایک ہی بندہ ہو گا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ شاید جنت کمروں کا نام ہے کہ ایک جنت ہے جس میں ہزاروں کمرے ہیں، تم نے جانا ہے تو چلو دو چار بندے اور بھی ساتھ ہو جائیں تو کیا فرق

6۔ حٰم السجدۃ 31:41

پڑتا ہے؟! ایک کمرے میں اکیلا بندہ نہ ہو بلکہ دو بندے سو جائیں۔ یاد رکھو! جنت رہنے کی جگہ نہیں ہے بلکہ عیش کی جگہ ہے، رہنے کی جگہوں پر گزارا کرنا ہوتا ہے اور عیش کی جگہوں پر گزارا نہیں ہوتا بلکہ وہاں من مانی کی زندگی ہوتی ہے۔

یہ بات یاد رکھ لیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص دنیا میں سونے اور چاندی کے برتن میں پیے گا اللہ اس کو آخرت میں برتن نہیں دے گا، جو شخص دنیا میں ریشم استعمال کرے گا اللہ اسے آخرت میں ریشم نہیں دے گا، جو شخص دنیا میں شراب پیے گا اللہ اسے آخرت میں شراب نہیں دے گا۔[7]

تو جنت کے احوال الگ ہیں اور دنیا کے احوال الگ ہیں۔ وہاں اگر مرد کنگن پہنیں گے تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ وہ جہان ہی الگ ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ دل بڑا رکھو! کسی اور کو بھی جنت میں جانے دو! تو یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ جنت میں آدمی ایسے رہے گا جیسے سلطنت کا بادشاہ اور سلطنت کا بادشاہ ایک ہوتا ہے یا دس ہوتے ہیں؟ (ایک ہوتا ہے۔ سامعین) آپ کسی دنیا کے بادشاہ سے کہیں نا کہ دل بڑا رکھو! بادشاہ اپنی سلطنت میں کسی اور کو برداشت نہیں کرتا، ہاں مہمان بن کر آؤ تو ٹھیک ہے تو جنتی ایک دوسرے سے ملیں گے، آئیں جائیں گے، بتاؤ یہ آنا جانا رہنے کے لیے ہوگا یا مہمان نوازی کے لیے؟ (مہمان نوازی کے لیے۔ سامعین) مہمان بن کر آؤ تو ٹھیک ہے۔ یہ میں نے دفع دخل مقدر کیا ہے تاکہ اشکال سارے ختم ہو جائیں۔

حورانِ جنت کا تذکرہ:

دنیا کے بادشاہوں کی کنیزیں ہوتی ہیں اور جنتی جنت میں بادشاہ ہوں گے جن کی کئی باندیاں ہوں گی یعنی جنت کی حوریں۔ کتنی راحت، سکون اور آرام کی جگہ ہو

7۔ سنن الترمذی، رقم: 1861، 1878

گی جنت! بس دنیا میں تھوڑا سا ضبط کر لو تو آگے مزے ہی مزے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ نے حور کی اٹھارہ صفات بیان فرمائی ہیں اور حدیث مبارک میں تو جماع اور جماع کی کیفیات تک کو بیان کیا ہے کہ جنتی حور کے پاس کیسے جائے گا! اللہ نے حوروں کا حسن بیان کیا ہے، دنیا والی بیوی کا حسن بیان نہیں کیا، یہ تو وہاں جنت میں حوروں کی ملکہ ہو گی، اس کے حسن کو بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ خیر جنت میں سونے کے کنگن ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عطا فرمائے۔ (آمین)

حرم؛ امن و سلامتی کی جگہ

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ِۨ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَ الْبَادِ﴾

مسجد حرام وہ جگہ ہے جو باہر سے آنے والے اور وہاں کے رہنے والے سب کے لیے برابر ہے۔ مسجد حرام اور حرم کی وہ جگہ جس کا تعلق افعالِ حج کے ساتھ ہے دنیا میں کسی کی ملکیت نہیں ہے جیسے صفا و مروہ کے درمیان کی جگہ، طواف کرنے کی جگہ مطاف، مزدلفہ کا میدان، منیٰ کا میدان، عرفات کا میدان وغیرہ۔

حضرت ابراہیم کا کعبہ تعمیر کرنا:

﴿وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآىِٕفِيْنَ وَ الْقَآىِٕمِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴿۲۶﴾﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے وہ جگہ بتادی جہاں احاطہ کعبہ تھا یعنی خانہ کعبہ کی جگہ بتائی کہ اس کو تعمیر کرو۔ اس کی پہلی تعمیر تو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں ہوئی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں جب طوفان آیا تھا تو کعبہ کی ہ تعمیر اٹھالی گئی تھی البتہ اس کی بنیادیں اور وہ جگہ متعین تھی۔ یہ حکم ﴿وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ

لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ کہ میرے گھر بیت اللہ کو طواف کرنے والوں، عبادت کے لیے کھڑے ہونے والوں اور رکوع سجدے کرنے والوں کے لیے پاک رکھیے! یہ نام اس وقت دیا گیا تھا جب بیت اللہ کی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیت اللہ در و دیوار کا نام نہیں بلکہ اس جگہ اور زمینی ٹکڑے کا نام ہے جس پر بیت اللہ کی تعمیر ہوئی ہے۔ ظاہر ہے وہ جگہ اس وقت بھی موجود تھی جب یہ حکم ہوا تھا۔

حضرت ابراہیم کا اعلانِ حج:

﴿وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿٢٧﴾﴾

اور پھر فرمایا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کرو کہ وہ تمہارے پاس پیدل آئیں اور دور کے راستوں سے ان سواریوں پر سوار ہو کر آئیں جو لمبے سفر کی وجہ سے دبلی پتلی ہو گئی ہوں۔

روایات میں ہے ابراہیم علیہ السلام مقام ابراہیم پر پتھر پر کھڑے ہوئے اور اللہ نے پتھر کو بہت اونچا کر دیا کہ اب آواز لگاؤ! بعض روایات میں ہے جبل ابو قبیس پر کھڑے ہو کر آواز لگاؤ۔ دونوں روایتیں جمع ہو سکتی ہیں کہ آپ پہلے مقام ابراہیم پر پتھر پر کھڑے ہوئے اور وہ پتھر جبل ابو قبیس پر چلا گیا ہو۔ تو اللہ نے فرمایا کہ اعلان کرو! عرض کیا: یا اللہ! یہاں تو ویرانہ ہے، کون سنے گا اور جہاں آبادی ہے وہاں میری آواز کیسے پہنچے گی؟ اللہ نے فرمایا: آواز لگانا آپ کے ذمہ ہے اور آپ کی آواز کو ساری دنیا میں پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے مشرق، مغرب، شمال، جنوب چاروں طرف منہ کر کے آواز لگائی کہ خانہ کعبہ بن گیا ہے، حج کرنے کے لیے آؤ! یہ

آواز اللہ نے - بعض روایات میں ہے کہ - عالم ارواح میں جو روحیں تھیں ان کے کانوں تک بھی پہنچائی۔ جس جس کے مقدر میں حج کرنا لکھا تھا اس اس نے جواب دیا۔

مرکز کی بنیاد اور مشکلات کا سامنا:

جب ہم نے یہاں مرکز اھل السنۃ والجماعۃ کا کام شروع کیا تو چھوٹی سی جگہ تھی۔ میں نے کہا کہ دو بیت الخلاء بناؤ! میرے ساتھ مجھ سے چھوٹے بھائی شعیب اور ان سے چھوٹے بھائی خبیب تھے۔ ہم تازہ تازہ جیلوں سے نکلے ہوئے تھے، ستم رسیدہ تھے، غمزدہ تھے، کوئی پرسان حال بھی نہیں تھا، کوئی ہمارے سر پر ہاتھ رکھنے کے لیے تیار بھی نہیں تھا۔ تو میں نے کہا کہ یہاں دو بیت الخلا بناؤ۔ مجھ سے چھوٹے بھائی شعیب نے کہا کہ دو بنا کے کیا کرنا ہے؟ تو بھائی خبیب نے بھائی شعیب سے کہا کہ پیسے تو بھائی جان نے لگانے ہیں، تمہیں کیا ضرورت ہے انکار کرنے کی؟ تم بنا دو۔ بھائی جان نے پہلے دنیا کا بہت ظلم سہا ہوا ہے، ہمارا بھائی ہے، جو کہتا ہے وہی کر دو، اس ایک کو تو خوش رکھو، نہ ہمارے پاس باپ ہے نہ ہمارے پاس خاندان ہے نہ جماعت ہے نہ پیسا ہے، کچھ بھی نہیں ہے، ایک بھائی بچتا ہے ہمارے پاس... خیر میں بتا رہا تھا کہ وہ دو بیت الخلاء بنانے کے لیے تیار نہیں تھے کہ یہاں آئے گا کون؟ لیکن آپ آج مرکز کا نظام دیکھو اور لوگوں کا رجوع دیکھو! اب حالت یہ ہے کہ بیت الخلاء بہت ہیں لیکن پھر بھی کم پڑ جاتے ہیں۔

ہم نے یہاں کام شروع کیا۔ میں دنیا کے نقشے بنا کر بیٹھتا تھا۔ میرے ساتھ کام کرنے والے میرا مذاق اڑاتے اور کہتے کہ جیل میں رہ رہ کر مار کھا کھا کر اس کا دماغ ہل گیا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میں نے پوری دنیا میں کام کرنا ہے۔ میں ان کی باتوں پر پھر یہ آیت پڑھتا تھا ﴿وَ اَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ﴾ میں نے ان سے کہا کہ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ لوگوں میں آواز لگاؤ۔ میں بھی آج کام کی آواز لگاتا ہوں،

اگر اللہ کو منظور ہوا تو ہماری یہ آواز دنیا کے کچے پکے گھر تک پہنچے گی اور پھر ہم نے آواز لگائی۔

جب ہم نے کام شروع کیا تھا تو میں بس پر سفر نہیں کرتا تھا، میں ہمیشہ رینٹ کی کار لے کر جاتا، کبھی کسی سے کرایہ کا مطالبہ بھی نہیں کرتا تھا، میں نے کہا: یااللہ! بس والی خطابت ہم سے نہیں ہوتی، ہماری ٹکر دشمن سے ہے، اللہ تو اپنے کرم سے اسباب عطا فرما۔ ہمارے ساتھ ڈرائیور میاں مشتاق ہے، یہ بدعتی تھا، اب الحمدللہ بہت بدل گیا ہے، اس کی گاڑی تھی میں ہفتہ ہفتہ اس کو ساتھ رکھتا تھا، اب اللہ نے اس کو دو اپنی گاڑیاں دے دیں۔ ہمارے ساتھ جو بھی ملا ہے اللہ نے اس کو بہت نوازا ہے۔ میں آپ کو بھی گارنٹی کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں لیکن چلیں اخلاص سے، تو تھوڑی دیر لگے گی، آپ دیکھنا کہ اللہ نوازتا کیسے ہے!

ہم یہاں سے چلے مظفر آباد کشمیر، ایک ہفتہ کا دورہ تھا، اس کی بیوی کا فون آتا کہ کب واپس آرہے ہیں تو یہ مذاق میں بیوی سے کہتا کہ ہم دین پھیلا رہے ہیں، بس ایک پہاڑ رہ گیا ہے اس کے پار دین پہنچا کر واپس آجائیں گے اور مجھے مذاق میں کہتا کہ مولوی صاحب! بس پوری دنیا میں آپ ہی نے دین پھیلانا ہے اور کوئی نہیں ہے دین پھیلانے والا؟ میں اسی رینٹ کی گاڑی پر سندھ تک جایا کرتا تھا اور کرایہ کسی سے نہیں مانگتا تھا، بس چلتے رہے۔

اللہ اس سے بھی بڑی گاڑی دے:

میں ایک مرتبہ جنوبی پنجاب دورہ پر تھا۔ مولانا زبیر صاحب شجاع آبادی جنوبی پنجاب وفاق کے مسئول ہیں، میں نے پوچھا کہ کہاں پر ہیں؟ کہا: ملتان وفاق المدارس کے دفتر میں ہوں۔ میں نے کہا: میں بھی ابھی ملتان میں ہوں اور آگے سفر پر جارہا ہوں۔ میں اور مولانا ایک ہی مدرسے میں پڑھتے رہے ہیں، وہ مجھ سے آگے تھے

اور میں پیچھے تھا، وہ مجھ سے بڑے ہیں اور میں چھوٹا ہوں۔ تو میں نے ان سے کہا کہ میں ایک جلسے پر لودھراں جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا: میں نے بھی اس جلسہ میں جانا ہے۔ میں نے کہا کہ میری گاڑی میں آ جائیں، گپ شپ لگائیں گے، آپ کی گاڑی پیچھے آ جائے گی۔ تو باتوں باتوں میں میں نے تذکرہ کیا کہ میں نے آج تک کسی جلسہ والے سے پیسہ نہیں مانگا، دیں... نہ دیں... تھوڑا دیں... زیادہ دیں... ان کی مرضی۔ مولانا مجھ سے فرمانے لگے کہ نہ مانگنے کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ کے پاس وہ گاڑی ہے جو مانگنے والے خطیبوں کے پاس بھی نہیں ہے، اور ہماری خواہش ہے کہ اللہ اس سے بھی بڑی گاڑی دے۔

قربانی کے صرف تین دن ہیں:

﴿وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ﴾

متعین دنوں میں ان مخصوص چوپائیوں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ نے انہیں عطا فرمائے ہیں۔ یہ مخصوص دن دس، گیارہ اور بارہ ذوالحجہ ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"فَالْمَعْلُوْمَاتُ يَوْمُ النَّحْرِ وَيَوْمَانِ بَعْدَهُ."[8]

کہ ایام معلومات سے مراد یوم نحر یعنی دس ذوالحجہ اور اس کے بعد دو دن ہیں یعنی گیارہ اور بارہ ذوالحجہ۔ یوں قربانی کے کل دن تین بنتے ہیں۔

﴿لَنْ يَّنَالَ اللهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾

اللہ تعالیٰ کے ہاں قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ اللہ کے ہاں تمہارا

8۔ تفسیر ابن ابی حاتم الرازی: ج6، ص261

تقویٰ اور اخلاص پہنچتا ہے۔

یہ بات ذہن نشین فرمالیں کہ ہم جو قربانی کرتے ہیں اس سے مقصود جانور کو ذبح کرنا ہے۔ جانور کا گوشت مقصود نہیں ہے۔ لہٰذا قربانی کرنے والا شخص اگر جانور کا سارا گوشت خود کھالے، جانور کی کھال کا مصلی بنالے تو قربانی کے اجر میں معمولی سا فرق بھی نہیں آئے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ جو اجر قربانی کے گوشت کو تقسیم کرنے پر ہے وہ نہیں ملے گا اور غریبوں کی ہمدردی کا عنوان ختم ہو جائے گا، مروت کے خلاف ہو گا اور مزاج شریعت کے بھی خلاف ہو گا لیکن اگر کوئی شخص سارا گوشت استعمال کرنا چاہے تو کر سکتا ہے کیونکہ مقصد جانور کو ذبح کرنا ہے، مقصد جانور کا گوشت تقسیم کرنا نہیں ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آجائے تو پھر یہ اشکال خود بخود ختم ہو جائے گا جو بعض لوگ کرتے ہیں کہ قربانی کے دن جانور ذبح کرنے کے بجائے اگر ہم جانور کی قیمت کو صدقہ کر دیں تو غریبوں کا فائدہ زیادہ ہو گا! کروڑوں جانور ایک دن میں ذبح ہوتے ہیں۔ اگر ہم ان کروڑوں جانوروں کے پیسوں سے جو اربوں کی مقدار میں بنتے ہیں یتیم خانہ بنادیں، اسکول بنادیں، شفاخانہ بنادیں، فلاحی سینٹر بنادیں، مدرسہ بنادیں، غریب بچیوں کے نکاح کرادیں تو کتنا کام ہو سکتا ہے اور ہم جانور ذبح کر کے اس مال کو ختم کر دیتے ہیں۔

اس کا جواب ہے: ﴿لَنْ يَّنَالَ اللهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ کہ گوشت تو مقصود ہی نہیں ہے، اللہ تو صرف چاہتے ہیں کہ جانور کو ذبح کرو اور بس! یہی مقصود ہے۔ باقی دیگر ضروریات کے لیے شریعت کا ایک مستقل نظام ہے۔ ایک حکم زکوٰۃ کا ہے۔ اب ہر آدمی جو صاحب نصاب ہے اگر مکمل زکوٰۃ ادا کر دے تو لوگوں کی ضرورتیں پوری ہو جائیں گی۔ اس کے بعد پھر عشر ہے، وہ ادا کیا جائے۔ پھر صدقۃ الفطر ہے وہ ادا کریں۔ پھر صدقات نافلہ ہیں وہ ادا کیے جائیں۔

یہ سارے صدقات صحیح طریقے سے ادا ہو جائیں تو لوگوں کی تمام ضرورتیں پوری ہو جائیں گی اور کوئی اشکال پیدا ہی نہ ہو گا۔

اللہ رب العزت چاہتے ہیں کہ بندہ مالی قربانی بھی دے یعنی اگر سونا چاندی اور مال تجارت ہے تو زکوٰۃ دے، اگر زمین ہے تو پیداوار سے عشر دے اور اگر جانور ہیں جن پر زکوٰۃ آتی ہے تو ان میں سے زکوٰۃ ادا کر دے اور اس کے علاوہ بھی اللہ کے نام پر دے۔ تو اللہ رب العزت ہر قسم کی قربانی ہم سے مانگتے ہیں۔

صحابہ کرام کو جہاد کی اجازت:

﴿أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ﴿٣٩﴾﴾

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آنے کے بعد سب سے پہلی آیت جو جہاد اور قتال کے بارے میں نازل ہوئی وہ یہی آیت ہے: ﴿أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا﴾، مکہ مکرمہ میں مشرکینِ مکہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر حد سے زیادہ ظلم کیا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ حکم تھا کہ ﴿كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ﴾[9] اپنے ہاتھ روکے رکھو، تم نے ابھی قتال نہیں کرنا، جہاد نہیں کرنا بلکہ تم نے صبر کرنا ہے۔ تو مکہ مکرمہ میں تیرہ سال تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سختیاں برداشت کرتے رہے، مصائب جھیلتے رہے اور مقابلہ نہیں کیا۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ ہمیں اجازت ملے کہ ہم مشرکین کو جواب دیں۔ تو مدینہ منورہ آنے کے بعد یہ آیت نازل ہوئی کہ وہ لوگ جن پر ظلم کیا گیا ان کو اجازت ہے کہ وہ قتال کریں اور یہ یقین کریں کہ اللہ رب العزت ان کی مدد کرنے پر قادر ہیں۔ وہ یہ نہ دیکھیں کہ ہم

9۔ النساء 77:4

تعداد میں تھوڑے ہیں، ہمارے پاس اسباب کم ہیں بلکہ اللہ کے بھروسے پر میدان میں نکلیں۔

اس لیے تاریخ اسلام میں سب سے پہلی باضابطہ جنگ جو کفر اور اسلام کے درمیان ہوئی وہ جنگ بدر ہے۔ مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی اور کفار کی تعداد ایک ہزار تھی۔ ان کی افرادی طاقت بھی زیادہ تھی اور اسلحہ بھی زیادہ تھا۔ اس کے باوجود اللہ رب العزت نے مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ اس موقع پر ستر بڑے بڑے کافر قتل ہوگئے اور مشرکین مکہ کی کمر ٹوٹ گئی۔

کیا جہاد کے لیے ایمان مضبوط ہونا شرط ہے:

یہاں ایک مسئلہ بھی اچھی طرح سمجھیں۔ بعض لوگ جہاد کے فرض ہونے کے لیے یہ شرط لگاتے ہیں کہ جہاد فرض تب ہوگا جب ایمان بہت مضبوط ہو اور اس کی دلیل یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں تیرہ سال تک ایمان بنانے کی کوشش ہوئی اور اس کے بعد مدینہ منورہ میں جہاد فرض ہوا۔

اگر مان لیا جائے کہ یہ دلیل ٹھیک ہے تو اس سے شریعت کے تقریباً نوے فیصد سے زیادہ احکام ختم ہو جائیں گے کیونکہ احکام مکہ مکرمہ میں نازل نہیں ہوئے تھے بلکہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئے۔ مکہ مکرمہ میں صرف نماز فرض ہوئی ہے باقی نماز کی تفصیلات، پانچ وقت جماعت کا اہتمام وغیرہ یہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئے۔ حج فرض ہو رہا ہے سن 8 ہجری میں۔ تو اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ تیرہ سال مکہ میں گزارنے کے بعد مدینہ میں جہاد فرض ہوا اس لیے فرضیت جہاد کے لیے ایمان مضبوط ہونا ضروری ہے تو پھر یہ بھی کہنا پڑے گا کہ حج ہجرت کے آٹھ سال بعد فرض ہوا، تیرہ سال مکے والے اور آٹھ سال مدینہ والے یہ کل ملا کر اکیس سال ہوئے تو پھر جہاد کی فرضیت کے لیے ایمان تھوڑا چاہیے اور حج کی فرضیت کے لیے ایمان زیادہ چاہیے کیونکہ حج تو اس

کے بھی بعد فرض ہوا ہے۔ اسی طرح زکوۃ کب فرض ہوئی... پردہ کب فرض ہوا... شراب کب حرام ہوئی... تو بہت سی چیزیں ہیں جن کا حکم مدینہ میں آیا۔ تو پھر ان سب کو ماننے کے لیے ایمان کی مضبوطی کی شرط لگانا ہوگی۔ اس لیے یہ دلیل انتہائی غلط ہے۔

دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین فرمالیں کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾[10]

اے ایمان والو! دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!

جب کلمہ پڑھا ہے تو آپ کو پورے اسلام میں داخل ہونا پڑے گا۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اب یہ فرض ہے یہ فرض نہیں ہے، ہمارا کرنا یا نہ کرنا الگ مسئلہ ہے اور جہاد کا فرض ہونا یا نہ ہونا الگ مسئلہ ہے۔ اب اگر کسی شخص سے آپ کہیں کہ حج کرو! وہ کہتا ہے کہ میں حج نہیں کرتا۔ آپ اس سے پوچھیں کہ حج کیوں نہیں کرتے؟ وہ کہتا ہے کہ حج کب فرض ہوا؟ آپ کہتے ہیں کہ 8 ہجری میں۔ وہ کہتا ہے کہ پہلے ایمان کی محنت ہے، میرا ایمان ابھی تک اس حالت پر نہیں کہ حج فرض ہو جائے۔ تو جہاد پہلے فرض ہوا ہے اور حج بعد میں فرض ہوا ہے، ہر سال لاکھوں بندے حج پر چلے جاتے ہیں تو کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ حج پر جانے کے لیے پہلے تیرہ سال کی محنت چاہیے تو جہاد کا کیا قصور ہے کہ اس کے لیے ایسی باتیں کی جائیں۔ اس لیے یہ دلیل پیش نہ کریں۔ بس سیدھی سی بات کریں کہ جہاد فرض ہے۔ ہم جہاد نہیں کرتے تو اپنا فسق بیان کریں کہ ہم نہیں کرتے، اپنے فسق کو چھپانے کے لیے اور اپنا جھوٹا تقویٰ بیان کرنے کے لیے احکاماتِ شریعت کو تبدیل نہ کریں۔

10۔ البقرۃ 208:2

حضرت بشیر بن خصاصیہ اور بیعت علی الجہاد:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جی ہم کمزور ہیں۔ حضرت جی مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے "حیات الصحابہ رضی اللہ عنہم "کتاب لکھی ہے۔ اس میں ایک عنوان قائم کیا ہے:"اعمالِ اسلام پر بیعت ہونا"

ایک ہوتی ہے "بیعت اسلام" کہ کافر بیعت کریں اور مسلمان ہو جائیں اور ایک ہوتی ہے "بیعت جہاد" کہ مسلمان بیعت کریں کہ ہم مر جائیں گے لیکن ساتھ نہیں چھوڑیں گے اور ایک بیعت ہوتی ہے "بیعت علی ارکان الاسلام" کہ ہم بیعت کرتے ہیں کہ شریعت کے احکام پر عمل کریں گے۔ یہ بیعت آج بھی ہوتی ہے۔

تو حضرت جی مولانا محمد یوسف کاندھلوی "اعمالِ اسلام پر بیعت ہونا" کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں کہ بشیر بن خصاصیہ رضی اللہ عنہ صحابی تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا کہ میں نے بیعت کرنی ہے، آپ مجھے کن چیزوں پر بیعت کریں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت میں چھ چیزیں گنوائیں:

اس بات کی گواہی دو اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں، پانچوں نمازیں وقت پر ادا کرو۔ فرض زکوٰۃ ادا کرو۔ رمضان کے روزے رکھو۔ بیت اللہ کا حج کرو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔

حضرت بشیر بن خصاصیہ نے کہا: یارسول اللہ! میں باقی کام تو کر لوں گا لیکن جہاد اور زکوٰۃ میرے لیے مشکل ہیں، میں یہ دو کام نہیں کر سکتا۔ ایک تو زکوٰۃ ادا نہیں کر سکتا کیونکہ میرے پاس دس اونٹنیاں ہیں، ان کے دودھ پر ہی ہمارا گزارا ہوتا ہے اور یہی ہماری سواری کے کام بھی آتے ہیں اور دوسرا جہاد نہیں کر سکتا کیونکہ میں بزدل آدمی ہوں، لوگوں سے سنا ہے کہ جو میدان جہاد سے پشت پھیرے گا تو وہ اللہ کے غضب کا مستحق قرار پائے گا، مجھے خوف ہے کہ اگر میں دشمن سے لڑتے لڑتے میدان

جنگ سے بھاگ گیا تو کہیں اللہ کے عذاب کا مستحق نہ بن جاؤں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور فرمایا: اے بشیر! جب تم زکوٰۃ بھی نہیں دو گے اور جہاد بھی نہیں کرو گے تو جنت میں کیسے جاؤ گے؟ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بیعت نہیں فرمایا۔ حضرت بشیر بن خصاصیہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ اپنا ہاتھ بڑھائیں، میں آپ سے بیعت ہوتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو حضرت بشیر بن خصاصیہ نے ان تمام چھ کی چھ باتوں پر بیعت کی۔ [11]

مشروعیت جہاد کی وجہ:

مکہ مکرمہ میں جہاد فرض نہیں تھا مدینہ منورہ میں فرض ہوا اور اس کی وجہ اللہ رب العزت نے یہ بیان کی ہے:

1: ﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا﴾

جہاد کی اجازت ہے اس لیے دی ہے کہ تم مظلوم ہو۔

2: ﴿الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ﴾

نیز یہ اجازت اس لیے ہے کیونکہ تم کو کفار نے مکہ سے نکال دیا ہے، تمہارے گھروں سے نکال دیا گیا ہے، تمہیں ہجرت پر مجبور کیا گیا ہے، اب تم بھی بدلہ لے لو۔

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا﴾

دنیا میں چار قسم کی جگہیں ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نام لیا ہے:

11۔ حیات الصحابہ: ج1 ص367

1: "صَوَامِعُ" یہ صَوْمَعٌ کی جمع ہے۔ عیسائیوں کے ان راہبوں کی مخصوص عبادت گاہ کا نام ہے جو دنیا سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ یہ راہب ان خلوت خانوں میں قیام پذیر ہو کر اپنی عبادت میں مشغول رہتے تھے۔

2: "وَبِيَعٌ" یہ بیعۃ کی جمع ہے، عیسائیوں کی عام عبادت گاہ کو بیعۃ کہتے ہیں۔ اسے کنیسہ اور گرجا بھی کہتے ہیں۔

3: "صَلَوٰتٌ" اس جگہ کو کہتے ہیں کہ جہاں یہودی عبادت کرتے ہیں۔

4: "مَسٰجِدُ" یہ مسجد کی جمع ہے، وہ جگہ جہاں مسلمان عبادت کرتے ہیں۔

تو اللہ رب العزت نے فرمایا کہ ان عبادات گاہوں کا تحفظ تب ہو گا جب مسلمان جہاد کریں گے، جہاد نہیں کریں گے تو عبادت گاہوں کا تحفظ نہیں ہو گا۔ آج بھی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ جو ہم سب کا ماویٰ اور ملجا ہے لوگ اس پر میزائل گرانے کا سوچ رہے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ حرمین کو ختم کریں مگر ان شاء اللہ حرمین ختم نہیں ہو گا، مکہ بھی رہے گا اور مدینہ بھی رہے گا، ان شاء اللہ ان کے ماننے والے بھی رہیں گے۔ یہ سب ان لوگوں کی حماقتیں ہیں.. جہالتیں ہیں.. غفلتیں ہیں.. اپنی دنیا وآخرت تباہ کرنے والی باتیں ہیں۔ قرآن کریم نے کعبہ کو ﴿قِيٰمًا لِّلنَّاسِ﴾[12] کہا ہے کہ لوگوں کی دنیا میں رہنے کی وجہ یہ کعبہ ہے۔ جب کعبہ ختم ہو جائے گا اللہ تعالیٰ کائنات کا نظام ہی ختم کر دیں گے۔ تو جب تک کعبہ ہے ہم بھی موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کعبہ کی حفاظت فرمائیں اور ہم اس حفاظت کے لیے استعمال ہو جائیں تو یہ اللہ کا ہمارے اوپر بہت بڑا احسان ہے۔ اس لیے فرمایا کہ جب تک یہ جہاد ہو گا عبادت گاہوں کا تحفظ ہو گا اور جب جہاد نہیں ہو گا تو عبادت گاہوں کا تحفظ بھی نہیں ہو گا۔

12۔ المائدۃ 97:5

حکومت اسلامی کے بنیادی کام:

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾﴾

اب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہم نے جہاد کی اجازت دی ہے کیونکہ ان پہ ظلم ہوا تھا اور ان کو گھر سے نکالا گیا تھا تو جب یہ جہاد کریں گے اور ان کو حکومت ملے گی تو یہ لوگ چند کام کریں گے:

1: ﴿اَقَامُوا الصَّلٰوةَ﴾ لوگوں سے نماز کی پابندی کروائیں گے۔

2: ﴿اٰتَوُا الزَّكٰوةَ﴾ زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے۔

3: ﴿اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ﴾ نیکی کا حکم دیں گے۔

4: ﴿نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ گناہوں سے روک دیں گے۔

معلوم ہوا کہ اسلامی حکومت کے بنیادی طور پر چار کام ہیں؛ لوگوں سے نمازوں کا اہتمام کروائیں، لوگوں سے زکوٰۃ کا اہتمام کروائیں۔ ان سے نیک کام کروائیں اور انہیں گناہوں سے روک دیں۔

خلفائے راشدین کا سنہری دور:

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں بعض لوگوں نے خلیفہ وقت کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے زکوٰۃ کا انکار نہیں کیا بلکہ خلیفہ وقت کو زکوٰۃ دینے سے انکار کیا ہے۔ انہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ہم زکوٰۃ خود ادا کریں گے، آپ کو نہیں دیں گے کیونکہ ہم لوگ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں انہی کو دیتے تھے، حضور دنیا سے چلے گئے تو اب آپ کو کیوں دیں؟ ان کے جواب میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

لَوْ مَنَعُوْنِيْ عِقَالًا كَانُوْا يُؤَدُّوْنَهُ إِلٰى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَاتَلْتُهُمْ عَلٰى مَنْعِهٖ.[13]

اللہ کے نبی کے دور میں جو لوگ زکوٰۃ میں ایک رسی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے اگر وہ مجھے نہیں دیں گے تو میں ایک رسی پر بھی ان سے جہاد کروں گا۔ زکوٰۃ کا معاملہ اتنا اہم ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عُمّال اور گورنروں کو خط لکھتے تھے۔ فرماتے کہ نماز کا بہت اہتمام کیا کرو۔ اگر کسی گورنر اور عامل کی نماز ٹھیک ہے تو باقی سب معاملات ٹھیک ہیں، نماز ہی ٹھیک نہیں تو باقی چیزیں ہم نہیں دیکھتے اور قیامت کے دن بھی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے نامہ اعمال میں نماز کو دیکھیں گے تو حاکم وقت کی ذمہ داری ہے کہ نیکی پر لوگوں کو مجبور کر دیں اور گناہوں سے جبراً روک دیں۔

ایک ہے میرا اور آپ کا کام... ہم جبر نہ کریں بلکہ ہم منت سماجت کریں، فضائل سنائیں جیسے ہم تبلیغ کرتے ہیں لیکن حاکم وقت امر بالمعروف کرتا اور نہی عن المنکر کرتا ہے۔ دو باتوں میں فرق اچھی طرح سمجھ لیں۔

فضائل، دلائل اور ترغیب سے کسی کو دین پر لانا یہ امر بالمعروف نہیں ہے، اسی طرح فضائل، دلائل اور ترغیب سے کسی کو گناہ سے روکنا یہ نہی عن المنکر نہیں ہے بلکہ یہ وعظ و نصیحت ہے، دعوت ہے، تبلیغ ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کسے کہتے ہیں؟ امر کہتے ہیں: "قَوْلُ الْقَائِلِ لِغَيْرِهٖ عَلٰى سَبِيْلِ الْاِسْتِعْلَاءِ اِفْعَلْ" کہ بندہ طاقت کے ساتھ یہ کہے کہ تم نے یہ کام کرنا ہے، اسے "امر" کہتے ہیں یعنی سامنے والا بندہ آپ کے سامنے انکار نہ کر سکے اور نہی کہتے ہیں: "قَوْلُ الْقَائِلِ لِغَيْرِهٖ عَلٰى

13۔ صحیح البخاری، رقم: 7284

سَبِيْلِ الْاِسْتِعْلَاءِ، لَاتَفْعَلْ" کہ طاقت کے ساتھ کسی کو یہ کہنا کہ تم نے یہ کام نہیں کرنا اور وہ اس کا انکار بھی نہ کر سکے۔ اسے کہتے ہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یہ طاقت کے بغیر نہیں ہوتا اور طاقت یہ حکومت کی ذمہ داری ہے۔

اس لیے حدیث پاک میں ہے: "مَنْ رَأَىٰ مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ" جو شخص گناہ کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے روک دے۔ اگر اس کی طاقت نہیں رکھتا تو "فَبِلِسَانِهٖ" اپنی زبان سے روک دے۔ زبان سے بھی نہیں روک سکتا تو "فَبِقَلْبِهٖ" پھر دل سے برا سمجھے، "وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ" فرمایا کہ یہ ایمان کا کمزور اور آخری درجہ ہے۔[14]

صحیح بندے کا انتخاب ہماری ذمہ داری:

خیر میں عرض یہ کر رہا ہوں کہ نماز کی پابندی کروانا، زکوٰۃ ادا کروانا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یہ حکومت کی ذمہ داری ہے اور ایسے بندے منتخب کر کے اسمبلی میں بھجوانا کہ وہ یہ کام سرانجام دیں یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ اگر ہم ایسا بندہ منتخب نہیں کرتے اور سامنے ایسا بندہ موجود بھی ہو جو یہ کام کر سکتا ہو لیکن ہم دوسرے بندے کو ووٹ دیں تو عند اللہ ہم مجرم ہوں گے، قیامت کے دن ہم سے مواخذہ ہو گا کہ ہم نے غلط بندے کا انتخاب کیوں کیا ہے؟ ووٹ ایک شرعی امانت ہے، اس کو معمولی بات نہ سمجھا کریں کہ جس کو دل چاہا دے دیا، جس کو دل نہ چاہا نہ دیا اور ہمیں امانت میں خیانت اور بددیانتی کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

خیر میں عرض یہ کر رہا تھا کہ یہ جو مظلومین ہیں ان کو جب حکومت ملے گی تو

14۔ صحیح مسلم، رقم: 49

یہ نمازوں کا اہتمام بھی کروائیں گے، زکوٰۃ کا اہتمام بھی کروائیں گے، امر بالمعروف بھی کریں گے اور نہی عن المنکر بھی کریں گے۔ یہ جو ہم کرتے ہیں یہ التماس ہے، گزارش ہے، وعظ ہے لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں ہے۔

میں یہ گزارش اس لیے کرتا ہوں کہ التماس اور گزارشات کو امر بالمعروف کا نام نہ دینا، احکام اور شریعت کی اصطلاحات کو کبھی نہ بدلنا، یہ جرم کبھی نہ کرنا وگرنہ لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا معنی بدل دیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

خلفائے راشدین چار ہیں:

یہاں ایک اہم مسئلہ سمجھیں۔ ہمارے ہاں "خلافت راشدہ" چار افراد پر بند ہے۔ خلفائے راشدین چار ہیں؛ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ خلفائے راشدین سات ہیں؛ چار مذکورہ اور حضرت حسن، حضرت معاویہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم۔

ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح یہ چار حضرات خلفاء بنے ہیں اسی طرح باقی تین بھی خلیفہ بنے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جانے کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ چھ ماہ تک جانشین بنے ہیں، پھر حضرت حسن نے بھی حضرت امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور خود دستبردار ہوئے ہیں لیکن چھ ماہ تک خلیفہ تو رہے ہیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت حسن کے بعد خلیفہ بنے ہیں۔ پھر جب یزید نے حکومت کی ہے تو عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس سے بغاوت کی اور مکہ پر حکومت کی ہے۔ تو یہ تین حضرات حضرت حسن، حضرت معاویہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم صحابہ بھی ہیں اور خلفاء بھی ہیں اور صحابہ کے بارے میں اللہ نے قرآن

میں فرمایاہے: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝﴾ [15] کہ یہ صحابہ سارے راشد ہیں۔ تو یہ تین بھی خلفاء راشدین ہوئے۔

اس کا جواب سمجھیں کہ ہم جب "خلافت راشدہ" کہتے ہیں تو اس کا معنی ہوتا ہے "خلافت راشدہ موعودہ فی القرآن" یعنی ایسی خلافت جس کا وعدہ قرآن میں ہے۔ جب ہم کہتے ہیں خلفائے راشدین تو اس سے مراد وہ خلفاء ہیں کہ جن کی خلافت کا اللہ نے قرآن میں وعدہ فرمایاہے اور وہ چار ہیں، سات نہیں۔ دلیل سمجھیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان صحابہ کو جہاد کی اجازت دی ہے جن میں دو باتیں ہیں:

- ایک ﴿بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا﴾ کہ جن پر ظلم ہوا ہے،
- اور دوسری ﴿الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ کہ جن کو مکہ سے نکال کر ہجرت پر مجبور کر دیا گیا۔

یہی وہ لوگ ہیں کہ ﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ کہ جن کو ہم خلافت دیں گے۔ تو خلافت اور حکومت کا وعدہ ان لوگوں سے ہوا ہے کہ جن پر ظلم ہوا ہے اور جن کو مکہ مکرمہ سے نکالا گیاہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابو بکر پر ظلم بھی ہوا ہے اور انہوں نے ہجرت بھی کی ہے، حضرت عمر پر ظلم بھی ہوا ہے اور ہجرت بھی کی ہے، حضرت عثمان پر ظلم بھی ہوا ہے ہجرت بھی ہے اور حضرت علی پر ظلم بھی ہوا ہے اور ہجرت بھی ہے - رضی اللہ عنہم - تو ان چار پر ظلم بھی ہوا اور انہوں نے ہجرت بھی کی ہے کہ ان کو گھر سے نکال دیا گیاہے۔

اب ہم باقی تین کو دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ

15۔ الحجرات 7:49

نے اسلام قبول کیا ہے فتح مکہ کے موقع پر یا فتح مکہ سے ایک سال پہلے سن سات ہجری میں عمرۃ القضاء کے موقع پر، تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی ہی نہیں تو اس آیت کا مصداق کیسے بنیں گے؟! اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ تو پیدا ہی مدینہ منورہ میں ہوئے ہیں، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح بھی مکہ مکرمہ میں ہوا ہے تو انہوں نے ہجرت کیسے کی ہے؟ اسی طرح حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما وہ صحابی ہیں جو مسلمانوں کی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے بعد سب سے پہلے پیدا ہوئے۔ تو یہ تین حضرات وہ ہیں جن کو ہجرت کا موقع ہی نہیں ملا۔ لہذا خلافت کا یہ وعدہ ان کے ساتھ ہے جنہوں نے ہجرت کی ہے اور وہ صرف چار ہیں۔

ہم تو نہ نعرہ لگوا رہے ہیں، نہ جھگڑا کر رہے ہیں بلکہ دلیل سے اپنا مؤقف عوام کو سمجھا رہے ہیں اور اپنی عوام کو دلیل سے اپنا عقیدہ سمجھانا چاہیے۔ اس لیے میں نے کہا کہ خلفائے راشدین چار ہیں۔

ترتیبِ خلافت کی وجہ:

اور میں ایک بات بتایا کرتا ہوں کہ خلفائے راشدین چار ہیں اور ان چار میں ترتیب بھی یہی ہے؛ پہلے حضرت ابو بکر، پھر حضرت عمر، پھر حضرت عثمان اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہم اور ان کی خلافت کی یہ ترتیب اس لیے ہے کہ ان میں جو پہلے دو ہیں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سسر ہیں اور باقی دو حضرت عثمان اور حضرت علی یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ہیں۔ سسر؛ باپ کی جگہ ہے جو کہ پہلے ہوتا ہے اور داماد؛ بیٹے جگہ ہے جو بعد میں ہوتا ہے۔ پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سسر ہیں اور بڑے ہیں اور حضرت عمر سسر ہیں اور چھوٹے ہیں، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسلام پہلے قبول کیا ہے اور حضرت عمر

رضی اللہ عنہ نے بعد میں قبول کیا ہے، تو حضرت ابو بکر کا نمبر پہلا ہے اور حضرت عمر کا نمبر دوسرا ہے۔ پھر حضرت عثمان داماد ہیں اور دوہرے ہیں، حضرت علی داماد ہیں اور اکہرے ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے حضرت رقیہ کا نکاح پہلے ہوا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت فاطمہ کا نکاح بعد میں ہوا ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دوہرے داماد ہیں اور یہ اکہرے داماد ہیں، عثمان حضور کے داماد پہلے بنے ہیں، علی بعد میں بنے ہیں تو حضرت عثمان کا نمبر تیسرا ہے اور حضرت علی کا نمبر چوتھا ہے۔ رضی اللہ عنہم (سبحان اللہ۔ سامعین)

ہم ترتیب کے ساتھ قائل ہیں اور دلیل کے ساتھ قائل ہیں اور بغیر دلیل کے محض ہٹ دھرمی سے بات نہیں کرتے۔

کام کرنے والے کا دل بڑا ہونا چاہیے!

﴿وَاِنْ یُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ ثَمُوْدُ ﴿۴۲﴾ وَ قَوْمُ اِبْرٰهِیْمَ وَ قَوْمُ لُوْطٍ ﴿۴۳﴾﴾

اے پیغمبر! یہ آپ کی بات نہیں مانتے اور آپ کو جھٹلاتے ہیں تو آپ اس پر دل چھوٹا نہ کریں۔ اگر یہ آپ کی تکذیب کرتے ہیں، آپ کو جھٹلاتے ہیں تو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے بھی حضرت نوح کو جھٹلایا تھا، قوم عاد نے اپنے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کو جھٹلایا تھا، قوم ثمود نے اپنے نبی حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلایا تھا، حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کی اقوام نے بھی اپنے اپنے نبی کو جھٹلایا تھا، تو یہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے، لہذا آپ اپنے کام کو جاری رکھیں۔

اس سے یہ بات بڑی اچھی طرح سمجھ آتی ہے کہ علماء کرام؛ انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں تو جس طرح انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا گیا اور ہمارے نبی سے فرمایا گیا کہ آپ نے دل چھوٹا نہیں کرنا بلکہ اپنا کام جاری رکھنا ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے

وارث علماء کو جھٹلایا جائے اور عالم کو اپنے موقف کی حقانیت پر پورا یقین ہو تو اس عالم کو بھی دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنے کام کو جاری رکھنا چاہیے، اس سے اللہ تعالیٰ کام کے نتائج بہت جلد عطا فرماتے ہیں۔

آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے عثمانیہ مسجد والوں کو ایک بات کئی بار کہی ہے جو ہمارے تبلیغ والے دوست کہتے ہیں کہ برف کوئٹہ برستی ہے اور ٹھنڈی ہوائیں کراچی چلتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ درس قرآن عثمانیہ مسجد میں ہوتا ہے اور پڑھنے والے باہر کی دنیا سے ہوتے ہیں۔ درس یہاں پر ہوتا ہے، چھپتا کراچی سے ہے اور تقسیم پوری دنیا میں ہوتا ہے اور تمہیں پتا بھی نہیں ہوتا کہ تمہارا درس قرآن کہاں کہاں پر جارہا ہے۔ ہم سے لوگ پوچھتے ہیں کہ مولانا صاحب! درسِ قرآن کی تیسری جلد کب آرہی ہے؟ آپ ایسے بڑے لوگ ہیں کہ آپ کے پاس پہلی دو جلدیں بھی نہیں ہیں، کبھی آپ کو احساس بھی نہیں ہوا کہ ہمارے ہاں درس ہوتا ہے تو درس قرآن کی کتاب ہمارے پاس بھی تو ہونی چاہیے، کبھی ہم بھی پوچھیں کہ مولانا صاحب! دو جلدیں کہاں سے ملتی ہیں، ہم ان کا مطالعہ تو کرلیں۔

میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ ایک مرتبہ پڑھے ہوئے درس کو آپ گھر میں دیکھ لیں تو پھر آپ کو اس کی اہمیت کا احساس ہو گا، سنتے ہوئے بندے کو محسوس نہیں ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے؟! جب چیز لکھی ہوئی سامنے آتی ہے پھر احساس ہوتا ہے کہ درس قرآن میں کتنے عقائد بیان ہوئے ہیں!

تو کام کرنے والے بندے کو دل بہت بڑا رکھنا چاہیے تب جا کے کام ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

محبت سب سے لیکن اتباع اپنے شیخ کی:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سورۃ البقرۃ کے

پہلے رکوع میں ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ہم تمام انبیاء علیہم السلام کا اعتقاد رکھتے ہیں لیکن اتباع اپنے نبی کی کرتے ہیں، فرمایا کہ اس سے ثابت ہوا کہ مشائخ اور علماء جتنے ہیں اعتقاد سب کے ساتھ رکھنا چاہیے لیکن اتباع اپنے شیخ اور عالم کی کرنی چاہیے۔ اس سے بات سمجھنی اور سمجھانی بہت آسان ہو جاتی ہے۔

قیامت کے دن کی مقدار:

آگے مشرکین اور کفار کو یہ بات سمجھائی ہے کہ ذرا یہ بھی سوچا کرو کہ ایک دن آنے والا ہے ﴿وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿٤٧﴾﴾ وہ ایک دن دنیا کے ہزار سالوں کے برابر ہو گا۔ یہاں جو تم نے پیغمبر کی مخالفتیں کی ہیں تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ یہاں کے دن چھوٹے ہیں اور قیامت کا دن بہت بڑا دن ہے، وہاں کا ایک دن دنیا کے ہزار سالوں جتنا۔

یہاں ایک بات سمجھ لیں۔ قرآن کریم میں دوسرے مقام پر ہے:

﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ﴿٤﴾﴾[16]

کہ وہاں کا ایک دن پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔ قرآن کریم کا خاصہ یہ ہے کہ قرآن میں اختلاف نہیں ہوتا، قرآن کی آیتوں میں ٹکراؤ اور تعارض نہیں ہوتا۔ اب اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ قیامت کا ایک دن دنیا کے ایک ہزار سالوں کے برابر ہے اور دوسری آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ ایک دن پچاس ہزار

16۔ المعارج 4:70

سال کے برابر ہے۔ تو بظاہر ٹکراؤ معلوم ہو رہا ہے حالانکہ ٹکراؤ نہیں ہے۔

اس کا ایک جواب تو ایسا ہے کہ ہر بندہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور ایک جواب ایسا ہے کہ اسے سمجھنا ہر بندے کے بس کی بات نہیں ہے۔ جو جواب ہر بندہ سمجھ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ دن ایک ہی ہے، اپنے حالات کے مطابق کسی کے لیے وہ ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے اور کسی کے لیے پچاس ہزار سال کے برابر۔ جس طرح بندہ اگر راحت میں ہو تو پتا ہی نہیں چلتا گھنٹوں گذر جاتے ہیں اور آدمی جب تکلیف میں ہو تو ایک گھنٹا ایک سال کے برابر ہو جاتا ہے۔ تو جن کے اعمال بہت اچھے ہیں تو ان کے لیے تو ایک ہزار سال بھی نہیں ہو گا اور جن کے اعمال گندے ہیں تو ان کے لیے ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہو جائے گا اور جن کے بہت ہی گندے ہوں گے تو ان کے لیے وہ مرحلہ اتنا مشقت کا ہو گا کہ ان کو ایسے لگے گا جیسے پچاس ہزار سال گزرے ہوں۔ تو یہ آدمی کے احوال کے مطابق ہے۔ اس کو حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ لفظ اشتداد سے تعبیر فرماتے ہیں یعنی کسی کے لیے شدت کم ہو گی اور کسی کے لیے زیادہ ہو گی۔

اور دوسرا جواب نظام فلکیات کی روشنی میں سمجھیں اور اس کا سمجھنا ہر بندہ کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس کو آسان لفظوں میں سماعت فرمائیں۔ ہمارے ہاں سورج ہمارے سر سے گزرتا ہے. جہاں سے سورج گزرتا ہے اسے ”خطِ استواء“ کہتے ہیں۔ تو زمین کے وہ حصے جو خطِ استواء پر ہیں یعنی جب سورج نکلتا ہے تو اس کے نیچے آنے والی جو زمین ہے وہاں پر دن اور رات چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے اور جو لوگ سورج سے قطب شمالی پر ہیں وہاں ایک دن اور ایک رات ایک سال کا ہوتا ہے۔ تو ہمارے لیے ایک دن اور ایک رات چوبیس گھنٹے کا اور قطب شمالی والوں کے لیے ایک دن اور ایک رات ایک سال کا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بالکل اسی طرح قیامت کے

دن ہو گا کہ جہاں سورج آہستہ آہستہ گزرے گا وہاں پچاس ہزار سال کا ایک دن ہو گا اور جہاں سے تیزی سے گزرے گا وہاں کا دن ایک ہزار سال کے برابر ہو گا۔

نزولِ وحی کے وقت شیطان کا لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالنا:

﴿وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّ لَا نَبِیٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤی اَلۡقَی الشَّیۡطٰنُ فِیۡۤ اُمۡنِیَّتِهٖ ۚ فَیَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا یُلۡقِی الشَّیۡطٰنُ ثُمَّ یُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیۡمٌ حَكِیۡمٌ ﴿۵۲﴾﴾

میں جو جو آیات پڑھتا جاتا ہوں اور ان کی تفسیر کرتا جاتا ہوں بطور خاص طلبہ اور علماء سے عرض کرتا ہوں کہ آپ جب تفاسیر دیکھیں گے اور ان آیات کو پڑھیں گے تو پھر اندازہ ہو گا کہ میں کتنے آسان انداز میں سمجھا رہا ہوں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب کسی نبی یا کسی رسول پر وحی آتی ہے تو ایک طرف نبی پر وحی اتر رہی ہوتی ہے اور وہ لوگوں کے سامنے بیان کر رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف شیطان کفار کے دل میں اس وحی کے بارے میں اشکالات پیدا کر رہا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان اشکالات کا جواب دیتے ہیں، چنانچہ ان جوابات کو قبول نہ کرنے والوں کا مرض بڑھ جاتا ہے اور قبول کرنے والوں کا ایمان اور پختہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

دو موتیں اور دو حیاتیں:

﴿وَ هُوَ الَّذِیۡۤ اَحۡیَاكُمۡ ۫ ثُمَّ یُمِیۡتُكُمۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡكُمۡ ؕ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَكَفُوۡرٌ ﴿۶۶﴾﴾

اللہ رب العزت نے تمہیں حیات دی، پھر اللہ تمہیں موت دیں گے، پھر اللہ تمہیں زندہ کریں گے۔ اس آیت میں ایک حیات، پھر موت اور پھر حیات دینے کا

ذکر ہے۔ تو اس میں دو حیاتوں اور ایک موت کا ذکر ہے اور قرآن کریم میں دوسری جگہ پر ہے:

﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾﴾ [17]

تم اللہ تعالیٰ کو کیسے جھٹلاتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تمہیں زندگی دی، پھر وہی تمہیں موت دے گا پھر وہی تمہیں زندہ کرے گا اور پھر تم اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے۔

اس آیت میں دو موتیں اور دو حیاتیں مذکور ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ موتیں اور حیاتیں کتنی ہیں؟ ہمارا اھل السنۃ والجماعۃ کا موقف یہ ہے کہ ظاہری اور کھلی دو موتیں اور دو حیاتیں ہیں اور ایک موت اور حیات ایسی ہے جو کھلی ہوئی نہیں ہے بلکہ مخفی ہے، وہ آنکھوں سے نظر نہیں آتی بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھانے سے سمجھ میں آتی ہے۔ پہلے بچہ عدم میں ہوتا ہے اور ماں کے پیٹ میں آجاتا ہے، جب تک روح نہیں آتی تو مردہ ہوتا ہے، یہ مردہ ہونا ایسا ہے جو ماں کو بھی محسوس ہو رہا ہوتا ہے، اس کے بعد جب اس میں روح آتی ہے تو بیٹا ماں کے پیٹ میں زندہ ہوتا ہے اور ماں اس کو محسوس بھی کرتی ہے، اس کے بعد یہی بچہ جب دنیا میں آتا ہے تو اس میں حیات ہوتی ہے اور یہ حیات ہر کسی کو نظر آرہی ہوتی ہے۔ اس کے بعد بندے پر موت آتی ہے، ہر کسی کو پتا چل جاتا ہے کہ موت آگئی ہے، اس کے بعد قیامت کے دن جو حیات ہوگی وہ حیات ہر کسی کو نظر آجائے گی۔

اس کے درمیان کا جو وقت ہے یعنی موت کے بعد اور قیامت کے دن اٹھنے

17۔ البقرۃ 28:2

سے پہلے تک اب اس میں جو حیات ملتی ہے اعادۂ روح کے ساتھ تو یہ ایسی حیات ہے کہ جو بندے کو نظر نہیں آتی اور اس کے نظر نہ آنے کی وجہ قرآن کریم نے بیان کی ہے:

﴿وَمِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿١٠٠﴾﴾[18]

یہ اس لیے نظر نہیں آتی کہ اس حیات پر پردہ ہے اور جو چیز پردے میں ہو وہ موجود تو ہوتی ہے لیکن نظر نہیں آتی۔ تو بعض لوگ پردہ کے نیچے والی چیز کا انکار کر دیتے ہیں، وجہ کہ وہ نظر نہیں آرہی ہے اس لیے نہیں مانتے، حالانکہ وہ ہوتی ہے اگرچہ نظر نہیں آتی۔ تو قبر والی حیات کھلی حیات نہیں ہوتی، قبر والی حیات مخفی حیات ہوتی ہے، اسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر ماننا پڑتا ہے اور وہ حیات کیسی ہے؟ میں صرف اس پر ایک حدیث سناتا ہوں۔

حدیث پاک میں ہے کہ جب انسان کو قبر میں رکھا جاتا ہے تو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں۔ ایک کا نام منکر اور دوسرے کا نام نکیر ہے۔ وہ اس میت سے سوال کرتے ہیں۔ ایک سوال یہ کرتے ہیں: "مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ؟" تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تمہارا کیا نظریہ ہے؟ بندہ کہتا ہے کہ وہ اللہ کے بندے اور رسول تھے۔ یہ ٹھیک جواب دے دیتا ہے تو قبر اس کے لیے وسیع کر دی جاتی ہے اور نور سے بھر دی جاتی ہے۔ فرشتے اسے کہتے ہیں: "نَمْ كَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ" سو جا جس طرح پہلی رات کی دلہن سوتی ہے۔[19]

اب اس کو جو موت ملی ہے یہ موت ایسی ہے جو بصورت نیند ہے لیکن وہ نیند

18۔ المؤمنون 100:23

19۔ سنن الترمذی، رقم: 1071

عالمِ دنیا کی نہیں ہے بلکہ عالمِ برزخ کی ہے، عالمِ دنیا کی نیند نظر آتی ہے اور عالمِ برزخ کی نیند نظر نہیں آتی، صرف پیغمبر کے فرمانے پر مانی جاتی ہے۔ اس لیے قرآن کریم میں فرمایا گیا:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾﴾[20]

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ کہو! بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں ہے۔

یہ حیات کسی خاص شہید کے لیے ہے یا ہر شہید کے لیے؟ اگر خاص شہید کے لیے ہوتی تو ہم کہتے کہ یہ خرقِ عادت ہے، یہ اس شہید کی کرامت ہے بلکہ یہ حیات ہر شہید کے لیے ہے کہ اللہ اسے موت کے بعد حیات دیتے ہیں۔ اب یہ حیات قیامت کے بعد والی نہیں ہے بلکہ قیامت سے پہلے قبر والی حیات ہے لیکن یہ حیات کیسی ہے؟ فرمایا: ﴿لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ تم اس حیات کو اپنے آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے، تم اس کو محسوس نہیں کر سکتے۔ معلوم ہوا کہ قبر والی جو حیات ہے یہ مخفی حیات ہے یہ کھلی حیات نہیں ہے، کھلی حیات کو مشاہدے والی حیات کہتے ہیں اور مخفی حیات کو غیب والی حیات کہتے ہیں۔ اس لیے دنیا والی حیات کا کوئی انکار کر بھی دے تو اسے کہیں گے کہ تو اندھا ہے تجھے نظر نہیں آرہا لیکن قبر والی حیات کا کوئی انکار کر دے تو اسے یہ نہیں کہتے کہ تو اندھا ہے تجھے نظر نہیں آرہا ہے بلکہ اسے یہ کہتے ہیں کہ تو بے ایمان ہے، پیغمبر کی بات پر یقین نہیں کر رہا۔ اس لیے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر یقین کرتے ہیں اور قبر والی حیات جو مخفی ہے اسے مانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سارے عقائد سمجھنے

20۔ البقرۃ 154:2

کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین)

معبودانِ باطلہ کے باطل ہونے کی مثال:

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ ۖ وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ ۚ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ ﴿٧٣﴾﴾

اے لوگو! ایک مثال بیان کی جارہی ہے اسے غور سے سنو! تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی نہیں بناسکتے اگرچہ سارے اس کام کے لیے اکٹھے بھی ہو جائیں تب بھی نہیں کر سکتے اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو یہ اسے واپس بھی نہیں لا سکتے۔ تو جو لوگ پکار رہے ہیں اور جن کو پکارا جارہا ہے یہ دونوں کتنے کمزور ہیں!

یہاں ایک مثال دی ہے کہ یہ مشرک جن جھوٹے اور پتھر کے بنائے ہوئے بتوں کی پوجا کرتے ہیں ان کو یہ ذہن بنالینا چاہیے کہ یہ سارے معبود مل کر بھی ایک مکھی کو پیدا نہیں کر سکتے۔ مکھی کو پیدا کرنا تو دور کی بات ہے اگر مکھی ان سے کوئی چیز اچک کر لے جائے تو سارے مل کر مکھی سے وہ چیز واپس بھی نہیں لے سکتے۔ ان میں سے کسی بت کی آنکھ پر مکھی بیٹھ جائے تو یہ اڑا بھی نہیں سکتے۔ ان کے منہ سے کوئی چیز لے جائے تو یہ واپس لے بھی نہیں سکتے۔ ان کی حالت یہ ہے ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ﴾ کہ مانگنے والا بھی کمزور ہے یعنی مشرک اور جن سے مانگ رہے ہیں یعنی بت وہ بھی کمزور ہیں۔ تو کمزوروں سے نہیں مانگا جاتا بلکہ قوی اور طاقت ور سے مانگا جاتا ہے، اسی لیے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾ کہ اللہ طاقت والا بھی ہے اور غالب بھی ہے، تو کمزوروں کو چھوڑو اور طاقت والے کی طرف رجوع کرو۔

مناقبِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ:

یہاں پر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ ذہن میں رکھ لیں۔
حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ کے والد حضرت ابو قحافہ ان کو بت خانے میں لے گئے اور وہاں جا کر حضرت ابو بکر سے کہا کہ ان بتوں کی عبادت کرو! یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت سے پہلے کی بات ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وہ شخص ہیں جنہوں نے زمانہ جاہلیت میں بھی کبھی شرک نہیں کیا۔ آپ ایسے سلیم الفطرت انسان تھے۔ باپ نے کہا کہ بتوں کی عبادت کرو۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس بت سے فرمانے لگے: مجھے بھوک لگی ہے، کھانا دو! مجھے پیاس لگی ہے، پانی دو! حضرت ابو بکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے والد نے یہ معاملہ دیکھ کر انہیں تھپڑ مارا اور کہنے لگے: یہ سن سکتے ہیں؟ یہ تمہیں کھانا دے سکتے ہیں؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ابا جان! اگر یہ کھانا نہیں دے سکتے تو میں ان کو سجدہ کیسے کروں؟ جب یہ بات صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی والدہ کو پتا چلی تو انہوں نے اپنے خاوند حضرت ابو قحافہ سے کہا: اس بیٹے کو مارا نہ کرو کیونکہ جب یہ پیدا ہوا تھا تو بوقتِ پیدائش میرے کان میں غیب سے ایک آواز آئی تھی:

يَا أَمَةَ اللهِ عَلَى التَّحْقِيقِ! أَبْشِرِيْ بِالْوَلَدِ الْعَتِيقِ! اسْمُهٗ فِي السَّمَاءِ الصِّدِّيقُ، لِمُحَمَّدٍ صَاحِبٌ وَرَفِيقٌ.[21]

اے اللہ کی بندی! تجھے ایسے بچے کی بشارت ہو جو جہنم کی آگ سے آزاد ہے، اس کا نام آسمان میں صدیق لکھ دیا گیا، یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دوست ہو گا اور ان کا صحابی ہو گا۔

21۔ مرقاۃ المفاتیح: ج 11 ص 179، باب مناقب عمر رضی اللہ عنہ

تمہارا خواب میری نبوت کی دلیل ہے:

ابھی اعلانِ نبوت بھی نہیں ہوا کہ صدیق اکبر کے لیے بشارت آرہی ہے۔ بات چل پڑی ہے تو میں اس پر ایک واقعہ اور سنا دیتا ہوں۔ ”الخصائص الکبریٰ“ میں امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی جوانی میں اعلانِ نبوت سے قبل تجارت کے لیے شام میں گئے۔ وہاں ایک خواب دیکھا اور عیسائی راہب سے اس خواب کی تعبیر پوچھی۔ اس عیسائی راہب نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اس کی تعبیر یہ ہے:

يَبْعَثُ نَبِيٌّ مِنْ قَوْمِكَ تَكُوْنُ وَزِيْرَهٗ فِيْ حَيَاتِهٖ وَخَلِيْفَتَهٗ بَعْدَ مَوْتِهٖ.

کہ تمہاری قوم میں سے ایک نبی مبعوث ہو گا، تم زندگی میں اس کے نائب اور اس کی وفات کے بعد اس کے خلیفہ ہو گے۔

یہ تعبیر تھی سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس خواب کی۔ آپ نے تعبیر کو سنا۔ آگے لکھا ہے:

فَأَسَرَّهَا أَبُوْ بَكْرٍ حَتّٰى بُعِثَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

اس تعبیر کو چھپا لیا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، تو ابو بکر نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

يَا مُحَمَّدُ! مَا الدَّلِيْلُ عَلٰى مَا تَدَّعِيْ؟

آپ کے اس دعوی نبوت پر کیا دلیل ہے؟ کیونکہ ابھی تک کلمہ نہیں پڑھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلرُّؤْيَا الَّتِيْ رَأَيْتُ بِالشَّامِ.

میری نبوت پر دلیل تیرا وہ خواب ہے جو تو نے شام میں دیکھا ہے۔ صدیق اکبر نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گئے۔ اس روایت میں ہے: فَعَانَقَهٗ وَ قَبَّلَ مَا بَيْنَ

عَیۡنَیۡہِ. کہ سینے سے لگ گئے اور پیشانی کا بوسہ لیا۔ [22]

محدثین نے لکھا ہے صدیق اکبر کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ آپ پہلے صحابی ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حالت ایمان میں پہلی بار ملے ہیں تب بھی پیشانی چومی ہے اور جب آخری بار ملے ہیں تب بھی پیشانی چومی ہے، چوم کے آیا ہے اور چوم کے رخصت کیا ہے۔

آپ بتائیں! صدیق نے نبی کی پیشانی چومی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین) آج کسی عالم کی پیشانی کو بوسہ دینا بدعت کیسے ہوا؟ تو لوگ ان چیزوں پر پتا نہیں بدعات کے فتوے کس طرح لگا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

سورۃ حج کے آخر میں سجدہ تلاوت نہ ہونے کی دلیل:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ارۡکَعُوۡا وَ اسۡجُدُوۡا وَ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمۡ وَ افۡعَلُوا الۡخَیۡرَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿ؕ۷۷﴾﴾

اس آیت پر امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں سجدۂ تلاوت ہے۔ ہمارے ہاں سجدہ تلاوت نہیں ہے۔ آپ حاشیہ میں دیکھیں گے یہاں لکھا ہوگا "السجدۃ عندالشافعی" امام شافعی اس پر سجدہ کرتے ہیں، امام ابو حنیفہ کے ہاں اس پر سجدہ نہیں ہے۔ ہماری امام شافعی سے کوئی لڑائی نہیں ہے۔ ہم اس بارے میں اپنی دلیل پیش کرتے ہیں۔ ہمارے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت پر سجدہ اس لیے نہیں کہ اس میں ہے: ﴿ارۡکَعُوۡا وَ اسۡجُدُوۡا﴾ تو رکوع اور سجدہ دونوں کا حکم ہے اور

22۔ الخصائص الکبریٰ: ج1 ص51

جہاں رکوع اور سجدہ دونوں کا حکم ہو تو وہ سجدہ تلاوت نہیں ہوتا بلکہ سجدہ نماز ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا تعلق سجدہ تلاوت سے نہیں بلکہ اس کا تعلق سجدہ نماز سے ہے۔

دین میں حرج نہ ہونے کا مطلب:

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾

اللہ رب العزت نے فرمایا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کا حق ہے، اس کے لیے اللہ نے تمہارا انتخاب کیا ہے اور اللہ نے دین میں حرج نہیں رکھا۔ دین میں بہت آسانی ہے لیکن آسانی کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ جہاں تھوڑی سی سختی آئے تو شریعت کا حکم بدل ڈالو! دین میں حرج نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا حکم اپنے بندے کو نہیں دیتے جس پر عمل کرنا بندے کے بس میں نہ ہو۔ ایک ہوتا ہے مشکل نہ ہو اور ایک ہوتا ہے بندے کے بس میں نہ ہو... تو مشکل ہونا اور ہوتا ہے اور بس میں نہ ہونا اور ہوتا ہے، اور جہاں بس میں نہیں ہوتا وہاں اللہ تعالیٰ تخفیف کا فیصلہ فرما کر سہولت اور رعایت بھی عطا فرماتے ہیں۔

تو حرج کا معنی یہ نہیں ہے کہ کسی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اور کہتا ہے کہ دین میں تو حرج نہیں لہٰذا اس کو ایک شمار کرو! کسی نے بندے کو قتل کر دیا اور اب کہتا ہے کہ مجھے قصاص میں نہ مارو کیونکہ شریعت میں حرج نہیں ہے۔ یاد رکھو! اس طرح سے "حرج نہ ہونے" کی تشریح کر کے احکامِ شریعت کو تبدیل کر دینا ہمارے بس میں نہیں ہے، ہم کیسے احکام کو بدلیں؟! حرج نہ ہونے کا معنی یہ ہے کہ شریعت کے کہنے پر صرف ایک طلاق دو اس میں آسانی ہے اور اس میں حرج اور تنگی نہیں ہے۔ اب تم نے تین اکٹھی دی ہیں تو شریعت نے جو آسانی رکھی تھی اس کو تم نے خود ہی ختم کر دیا ہے تو اس میں شریعت کا کیا قصور! حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہی بات فرماتے تھے:

إِنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوا فِي أَمْرٍ كَانَتْ لَهُمْ فِيهِ أَنَاةٌ.[23]

لوگوں کو جس کام میں آسانی تھی انہوں نے اس میں جلد بازی سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔

ملت اور امت کا معنیٰ:

﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ﴾

دوسری بات یہ فرمائی کہ تم ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہو۔ اس پر میں پہلے بات کر چکا ہوں کہ ہم امت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں اور ملت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہیں۔ "ملت" اسے کہتے ہیں کہ ان کے اصولوں میں اشتراک ہو اور "امت" اسے کہتے ہیں کہ ان کے اصول اور فروع دونوں میں اتفاق ہو۔ اصولوں میں ہمارا اشتراک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہے لیکن اصول اور فروع دونوں میں اشتراک اللہ کے نبی کے ساتھ ہے۔ تو ہم ملت ابراہیمی ہیں اور امت محمدی ہیں۔

امت دعوت اور امت اجابت:

مزید ایک بات سمجھیں کہ ایک امت دعوت ہوتی ہے اور ایک امت اجابت۔ جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کریں انہیں امتِ اجابت کہتے ہیں اور جو حضور کا کلمہ نہ پڑھے اسے امت دعوت کہتے ہیں۔ یہ جو ہمارے ہاں آواز لگ رہی ہے کہ "بھائیو! سارے امتی بن کر جیو!" تو میں بھی کہتا ہوں کہ بن کر جیو لیکن امتِ اجابت بن کر جیو، امتِ دعوت بن کر نہ جیو! امتِ اجابت اور ہوتی ہے اور امتِ دعوت اور ہوتی ہے۔ دونوں امت ایک کیسے ہو سکتی ہیں؟! بتاؤ کہ کافر اور مسلمان ایک ہو جائیں یہ کیسے ممکن ہے؟ کافر امت دعوت ہیں اور ہم امتِ اجابت ہیں۔ قیامت کے

23۔ صحیح مسلم، رقم: 1472

دن جنت میں صرف اسی نے جانا ہے جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو قبول کیا ہو گا۔

"مسلمان یا حنفی؟" کا آسان جواب:

﴿هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾

ابراہیم علیہ السلام نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔ ہم بھی اپنا نام مسلمان رکھتے ہیں لیکن ہمارا نام مسلمان ہونے کے باوجود ہم اپنے آپ کو "حنفی" بھی کہتے ہیں۔ اس پر لوگ کہتے ہیں کہ حنفی نہ رکھو، یہ قرآن کے خلاف ہے۔

اب اگر کوئی بندہ آپ سے پوچھے کہ آپ کی قومیت کیا ہے؟ سرگودھا یا پاکستان؟ تو آپ اپنے آپ کو سرگودھا کا کہتے ہو؟ (نہیں بلکہ پاکستانی کہتے ہیں۔ سامعین) آپ کی کوئی جماعت رائے ونڈ جائے اور وہاں حضرات پوچھیں کہ تم کہاں سے آئے ہو تو آپ کہتے ہو کہ سرگودھا سے لیکن جب آپ پاکستان سے باہر حج پر گئے ہوں اور اب کوئی شخص آپ سے پوچھے کہ کہاں سے آئے ہو؟ تو آپ کیا جواب دیں گے؟ (پاکستان سے۔ سامعین) اور اگر دو پاکستانی اکٹھے ہو جائیں اور وہ پوچھیں تو اب کیا جواب دیں گے؟ (سرگودھا۔ سامعین)

اسی طرح جب آپ سے کوئی پوچھے کہ آپ مسلمان ہو یا کافر؟ تو جواب ہو گا مسلمان! تو یہ جو فرمایا: ﴿هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ یہ کافروں کے مقابلے میں فرمایا ہے اور کفار کے مقابلے میں ہم مسلمان ہیں۔

اب مسلمانوں میں چار امام ہیں؛ امام اعظم ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ۔ تو آپ سے کوئی پوچھے کہ کس امام کے مقلد ہو؟ اور آپ جواب دیں کہ امام اعظم ابو حنیفہ کے تو آپ کا اپنے آپ کو حنفی کہنا یہ ﴿هُوَ سَمّٰكُمُ

﴿الْمُسْلِمِيْنَ﴾ کے خلاف نہیں ہو گا۔

دین ایک اور مذہب کئی:

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی کر دوں۔ یاد رکھیں کہ دین اور مذہب میں فرق ہے۔ دین کہتے ہیں ان مسائل کو جو منصوصات ہیں، منصوصات کا معنی کہ جو صاف صاف قرآن اور حدیث میں ہیں، اور مذہب کہتے ہیں اجتہادات کو۔ تو دین ایک ہے اور مذہب چار ہیں۔ اب میں آپ کو یہ بات سمجھاؤں تو بات لمبی ہو جائے گی کہ دین ایک ہو تو مذہب چار کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس کے لیے مختصراً آپ ایک حدیث ذہن میں رکھ لیں۔ سنن نسائی میں روایت موجود ہے۔ دو صحابی سفر پہ تھے۔ نماز کا وقت ہو گیا تو ان دونوں نے تیمم کیا اور نماز پڑھ لی کیونکہ پانی نہیں تھا۔ ابھی نماز کا وقت باقی تھا کہ پانی مل گیا۔ اب کیا کریں؟ پہلی نماز کافی ہے یا اب دوبارہ پڑھیں۔ ان میں سے ایک صحابی نے وضو کیا اور نماز کا اعادہ کیا اور دوسرے صحابی نے وضو نہیں کیا بلکہ پہلی نماز کو کافی سمجھا۔ اب ان کی دلیل کیا تھی؟ میں سمجھانے کے لیے کہتا ہوں کہ جن صحابی نے وضو نہیں کیا اور پہلی نماز کو کافی سمجھا ان کی دلیل یہ تھی کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا﴾[24] کہ جب پانی نہ ملے تو تیمم کر لو، میں نے تیمم کر لیا اور نماز بھی پڑھ لی تو حکم پورا ہو گیا، اب پانی مل بھی جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دوسرے صحابی نے دوبارہ وضو کر کے نماز پڑھی تو ان کی دلیل یہ تھی کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا﴾ کہ پانی نہیں ملا تب تیمم کرو، میں نے تیمم کیا اور نماز پڑھ لی لیکن اب وقت میں اندر چونکہ پانی مل گیا ہے تو

24۔ النساء 4:43

اب وضو کر کے دوبارہ نماز پڑھنی پڑے گی۔

اجتہادی اختلاف کی مثالیں:

اب دیکھو! دین ایک ہی ہے، آیت ایک ہی ہے لیکن مذہب دو ہو گئے۔ ایک نے ایک مسئلہ نکالا اور دوسرے نے دوسرا مسئلہ نکالا، اجتہاد دونوں نے کیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم لڑنے والے نہیں تھے۔ انہیں الجھن پیش آئی تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حل پوچھ لیا۔ خیر جب یہ دونوں مدینہ منورہ آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ! ہمارے ساتھ یہ مسئلہ پیش آیا تھا، میں نے تو نماز دوبارہ لوٹائی تھی وضو کر کے اور اس نے نہیں لوٹائی۔ حدیث پاک میں ہے کہ جس آدمی نے نماز دوبارہ نہیں پڑھی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا:

"أَصَبْتَ السُّنَّةَ."[25]

کہ اصل مسئلہ تیرا ہے۔ یہ اصل مسئلہ ہے کہ دوبارہ نماز لوٹانے کی ضرورت نہیں تھی اور فرمایا کہ جس نے دوبارہ نماز پڑھ لی مسئلہ نکالنے میں تو اس سے خطا ہو گئی لیکن چونکہ اس نے اجتہاد کیا ہے اس لیے اللہ اسے دو نمازوں کا ثواب دے گا۔

اب مذہب ایک ہو گیا یا دو ہو گئے؟ (دو ہو گئے۔ سامعین) اگر امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہا اللہ کے دو مذہب ہو جائیں تو لوگ کہتے ہیں کہ دین تو ایک ہے اور مذہب دو کیسے ہو گئے؟

صحیح بخاری میں روایت موجود ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خندق سے فارغ ہو گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنو قریظہ پر حملہ کرنا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

25۔ سنن النسائی، رقم: 433

"لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ الْعَصْرَ إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ."

عصر کی نماز تم نے بنی قریظہ میں پڑھنی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم راستے میں تھے کہ سورج غروب ہونے کا وقت قریب ہو گیا۔ بعض صحابہ نے کہا کہ ہم تو ابھی نماز پڑھیں گے، نماز قضا نہیں کریں گے۔ دوسروں نے کہا کہ نماز قضا ہوتی ہے تو ہونے دو ہم تو بنی قریظہ کے محلے میں جا کے ہی پڑھیں گے۔ اب یہ اختلاف کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تم نے عصر کی نماز بنو قریظہ کے محلے میں پڑھنی ہے تو ہم کون ہوتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو بدلنے والے! نماز قضا بھی ہو جائے تب بھی ہم نے تو وہیں جا کر پڑھنی ہے۔ تو انہوں نے حدیث کا مطلب یہ سمجھا اور دوسرے صحابہ کہنے لگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ جلدی جلدی جاؤ تاکہ عصر تک وہاں پہنچ جاؤ، اب چونکہ ہمیں دیر ہو گئی ہے تو نماز کو تو قضا نہیں کرنا، اس لیے ہم نے تو نماز پڑھنی ہے۔ جب واپسی ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تو آپ علیہ السلام نے کسی کی بھی سرزنش نہیں کی بلکہ دونوں کو ٹھیک قرار دیا۔[26]

یہاں بھی حدیث ایک ہے لیکن مذہب کتنے ہو گئے؟ (دو۔ سامعین)

اس پر قرآن کریم سے بھی مثال سن لیں تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ ان کے پاس قرآن نہیں ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے دور میں ایک آدمی کی بکریوں نے کسی کا کھیت چر لیا تھا۔ اب یہ لوگ اپنا قضیہ لے کر حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس گئے تو داؤد علیہ السلام نے فرمایا کہ کھیت کی قیمت لگاؤ اور بکریوں کی قیمت لگاؤ۔ قیمت لگی تو بکریوں کی قیمت کھیت کے برابر تھی۔ فرمایا کہ کھیت والے کو بکریاں دے دو۔ پھر یہ

26۔ صحیح البخاری، رقم: 4119

فیصلہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس لے جایا گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام چھوٹے ہیں اور بیٹے ہیں۔ انہوں نے فیصلہ یہ کیا کہ جس آدمی کی یہ بکریاں ہیں اس کو کھیت دے دو اور جس کا کھیت ہے اس کو یہ بکریاں دے دو۔ کھیت والا بکریاں چراتا رہے اور دودھ پیتا رہے اور بکریوں والا کھیت پر محنت کرے۔ جب کھیت اپنی اصلی حالت پر آجائے تو کھیت کو مالک کے حوالے کر کے اپنی بکریاں لے لے۔

اب دیکھو! ایک اجتہاد حضرت داؤد علیہ السلام کا ہے اور ایک اجتہاد حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ اس وقت یہ مخلوق نہیں تھیں ورنہ انہوں نے تو یہ کہنا تھا کہ ایک ہی سچا ہے، دونوں سچے نہیں ہو سکتے – معاذ اللہ –

آج لوگ کہتے ہیں کہ یا تو امام ابو حنیفہ ٹھیک ہیں یا امام شافعی ٹھیک ہیں، دونوں ٹھیک کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ جب دونوں نبی ٹھیک ہو سکتے ہیں اور دونوں صحابی ٹھیک ہو سکتے ہیں تو چاروں امام بھی ٹھیک ہو سکتے ہیں!

چاروں بر حق اور مسئلہ ایک کا ٹھیک:

آج کے دور کی ایک مثال سمجھو۔ بارہ آدمی تبلیغی جماعت میں نکلے ہیں یا دین پڑھنے کے لیے نکلے ہیں یا کسی خانقاہ میں اپنے شیخ سے ملنے کے لیے نکلے ہیں۔ راستے میں ایسی جگہ سے گزرے ہیں جہاں آبادی نہیں ہے۔ نماز کا وقت ہو گیا اور مطلع ابر آلود ہے۔ کچھ پتا نہیں چل رہا کہ قبلہ کس طرف ہے؟! اب ان میں اختلاف ہو گیا کہ قبلہ کدھر ہے۔ نہ تو ان کے پاس کمپاس ہے، نہ شمال کا پتا ہے اور نہ کوئی بتانے والا ہے۔ ان میں سے تین بندے کہہ رہے ہیں کہ ہم نے بہت غور کیا ہے کہ قبلہ اِس طرف ہے تو انہوں نے اسی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لی۔ دوسرے تین کہنے لگے کہ ہمارا دل مانتا ہے کہ قبلہ اس طرف ہے تو انہوں نے اسی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ تیسرے تین

کہتے ہیں کہ ہمارا دل کہتا ہے کہ اس طرف ہے تو انہوں نے اسی طرف رخ کیا۔ باقی جو تین بچ گئے تھے وہ کہنے لگے کہ ہمارا دل مانتا ہے کہ قبلہ اس جانب ہے تو انہوں نے اسی رخ کو لیا۔ اب آپ بتائیں کہ نماز کس کی ہوئی؟ (چاروں کی۔ سامعین) قبلہ کس کا ٹھیک ہے؟ (ایک کا۔ سامعین) اور یہ کون جانتا ہے؟ (اللہ جانتا ہے۔ سامعین)

تو ہم ان چاروں کو ٹھیک کہیں گے کہ ان چاروں کی نماز صحیح ہے، ہم کسی کے خلاف فتویٰ نہیں دیں گے لیکن حقیقت میں مسئلہ کس کا ٹھیک ہے یہ ہم نہیں جانتے بلکہ یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ اسے علماء کی زبان میں کہتے ہیں کہ چاروں میں سے عند اللہ ایک امام ٹھیک ہے اور عند الناس چاروں بر حق ہیں یعنی ہم سب کو بر حق کہیں گے لیکن جس سے خطا ہو گئی اجر اسے بھی ملے گا جیسے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مسئلہ تو اس کا ٹھیک ہے جس نے تیمم کر کے نماز ادا کرنے کے بعد دوبارہ ادا نہیں کی لیکن جس نے وضو کر کے دوبارہ ادا کی ہے اسے دو نمازوں کا ثواب ملے گا۔

اللہ ہم سب کو شریعت سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ المؤمنون

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۝۱ الَّذِيۡنَ هُمۡ فِيۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۝۲﴾

سورت کے فضائل وخصوصیات:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی آتی تھی تو عام طور پر ایسی آواز ہوتی جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہیں، ان کے اڑنے سے ایک آواز پیدا ہوتی ہے، جب وہ آواز ختم ہوتی تو ہم سمجھ جاتے کہ آپ پر وحی آ چکی ہے۔ ایک بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے آواز آنا شروع ہوئی تو ہم بھی قریب ہو گئے تا کہ دیکھیں کہ نئی وحی کیا آئی ہے۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ رخ ہو کر یہ دعا مانگی:

"اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَأَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا وَأَعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا وَآثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا وَأَرْضِنَا وَارْضَ عَنَّا." [27]

کہ اے اللہ! ہمیں زیادہ عطا فرما، کمی نہ فرما، ہمیں عزت عطا فرما ہمیں ذلت سے محفوظ فرما، ہمیں بخشش عطا فرما ہمیں محروم نہ فرما، ہمیں دوسروں پر ترجیح دے دوسروں

27۔ سنن الترمذی، رقم: 3173

کو ہم پر ترجیح نہ دے، ہم سے راضی ہو جا اور ہمیں بھی اپنی رضا سے راضی کر دے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابھی مجھ پر دس آیات ایسی نازل ہوئی ہیں کہ جو شخص ان پر پورا پورا عمل کرے وہ سیدھا جنت میں جائے گا۔[28]

مومنین کی سات صفات:

سورۃ المؤمنون کی پہلی دس آیات میں ایمان والوں کی سات خاص صفات ذکر کی گئی ہیں:

[1]: ﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲﴾

کہ نماز عاجزی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

[2]: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳﴾

کہ فضول کاموں اور فضول باتوں سے بچتے ہیں۔ یہ بات خود حدیث مبارک میں بھی ہے کہ "إِنَّ مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكَهُ مَا لَا يَعْنِيْهِ"[29] کہ یہ آدمی کے اسلام کی خوبی ہے کہ فضولیات سے بچتا رہے۔

[3]: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝۴﴾

کہ وہ لوگ زکوٰۃ پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

[4]: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۵﴾

کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شرمگاہ کی حفاظت پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ ایک حدیث مبارک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

28۔ تفسیر ابن کثیر: ج4ص463

29۔ سنن الترمذی، رقم:2318

"مَنْ يَضْمَنْ لِيْ مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ."[30]

کہ جو شخص مجھے اپنی زبان اور اپنی شرمگاہ کی ضمانت دے تو میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

گناہ شروع ہوتا ہے دیکھنے سے، آنکھ دیکھتی ہے اور ہاتھ پکڑتا ہے پھر شرمگاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے اور انجام بہت برا ہوتا ہے۔ اس لیے جو بدکرداری سے بچنا چاہے اس کا سب سے پہلا حل یہ ہے نامحرموں سے بچے، اپنی نگاہ کی حفاظت کرے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

ہمارے مشائخ نے بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا اور فرمایا ہے کہ جب تک بچے کے چہرے پر ڈاڑھی نہ آئے بلاوجہ اس کے چہرے پر نگاہ نہیں ڈالنی چاہیے، اس سے بچنا چاہیے۔ جب تک چہرے پر ڈاڑھی نہ ہو ایسے بچے کو امرد کہتے ہیں۔ اس سے بچنا ضروری ہے، خلوت میں اس کے ساتھ کبھی نہ بیٹھیں۔ اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔

امام محمد کا ایک ہفتے میں حفظ قرآن:

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ اس بارے میں معروف ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ بہت خوبصورت تھے اور بچپن میں پڑھنے کے لیے حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے پاس آئے۔ امام اعظم دوران سبق ان کو سامنے نہیں بٹھاتے تھے بلکہ پشت کے پیچھے بٹھاتے تھے۔ یہ کون ہیں! امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت۔

اور امام محمد کون ہیں؟ ذرا ان کی قابلیت کو دیکھنا کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے والد اپنے بیٹے امام محمد کو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے پاس لائے کہ ان کو درسگاہ میں بٹھائیں اور پڑھائیں۔ فرمایا: کیا یہ قرآن کا حافظ ہے؟ عرض کیا کہ نہیں۔ فرمایا: میری

30۔ صحیح البخاری، رقم:6474

درسگاہ میں بیٹھنے کی شرط یہ ہے کہ طالب علم قرآن کا حافظ ہو۔ امام محمد کے والد ایک ہفتے کے بعد پھر اپنے بیٹے کو لائے کہ میرے بیٹے کو کلاس میں بٹھالیں! فرمایا تم پچھلے ہفتے بھی لائے تھے تو میں نے بتایا تھا میری شرط ہے کہ طالب علم قرآن کا حافظ ہو، اس لیے پہلے اس کو حفظ کراؤ! تو امام محمد کے والد نے کہا "جی میرا بیٹا قرآن حفظ کر کے آگیا ہے۔ یہ تھے امام محمد۔ ایک ہفتے میں مکمل قرآن حفظ کرنے والا آدمی لیکن امام صاحب نے اپنے سامنے نہیں بٹھایا بلکہ پشت کے پیچھے بٹھایا۔ اس لیے جب انسان بے احتیاطی کرتا ہے تو گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو ان گناہوں سے بچاؤ! یہ گناہ ایسے ہیں کہ دنیا میں بھی ذلت اور آخرت میں بھی ذلت اٹھانی پڑتی ہے اور ایمان تباہ ہو جاتا ہے، اعمال تباہ ہو جاتے ہیں، حافظہ کمزور ہو جاتا ہے، پڑھائی سے دل اچاٹ ہو جاتا ہے اور یہ ایسا عجیب گناہ ہے کہ جب لگ جائے پھر انسان کی جان نہیں چھوڑتا۔

خود کو گناہوں سے بچایئے!

ہمارے حضرت عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جو شخص زمانہ طالب علمی میں اس گناہ میں مبتلا ہو جائے وہ مہتمم اور شیخ الحدیث بھی بن جائے تب بھی اس گناہ سے جان نہیں چھوٹتی، اس لیے زمانہ طالب علمی سے ہی احتیاط کرو اور جبر کے ساتھ خود کو سنبھالو۔

﴿اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝﴾

ایمان والے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرتے ہیں، ہاں اپنی بیوی ہو یا اپنی باندی ہو تو پھر جائز ہے۔ آپ اندازہ فرمائیں کہ شرمگاہ کا استعمال ان دو کے علاوہ کرنا حرام ہے، زنا ہو تب بھی حرام ہے، مشت زنی ہو تب بھی حرام ہے، لواطت ہو تب بھی حرام ہے، بیوی کا پچھلا حصہ استعمال کرو تب بھی حرام ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَلْعُونٌ مَنْ أَتَى امْرَأَةً فِيْ دُبُرِهَا."[31]

کہ جو شخص عورت کا پیچھے والا حصہ استعمال کرے تو وہ ملعون ہے۔

اپنی ہی بیوی ہو اور حالتِ حیض اور حالتِ نفاس میں ہمبستری کرے تب ہی حرام ہے۔ تو دیکھو! شریعت نے کس حد تک منع کیا ہے۔ اس لیے یہ ساری صورتیں اس میں شامل ہیں۔ نا محرم عورت سے زنا کرنا بھی شامل ہے، لواطت بھی شامل ہے، اپنی عورت کا پچھلا حصہ استعمال کرنا بھی شامل ہے، حالتِ حیض اور نفاس میں اگلا حصہ استعمال کرنا بھی شامل ہے۔ اس لیے ان تمام قسم کے گناہوں سے بچنا ضروری ہے۔

مسائل میں جھجک سے کام نہ لیں:

اور مسائل بیان کرتے وقت جھجک سے کام نہیں لینا چاہیے۔ مسائل کھل کر بیان کرنے چاہییں۔ ہمارے حضرت حکیم محمد اختر رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے- میں نے اپنے کانوں سے حضرت کی مجالس میں سنا ہے- فرمایا کہ تم شلواریں اتارتے ہو اور تمہیں شرم نہیں آتی اور جب میں کہتا ہوں کے شلوار مت اتارو تو کہتے ہو کہ اختر کیسی باتیں کرتا ہے! تم بلیو پرنٹ اور ننگی فلمیں بند کمرے میں دیکھتے ہو تمہیں شرم نہیں آتی اور جب میں کہتا ہوں یہ کام نہ کرو تو تم کہتے ہو کہ اختر کیسی باتیں کرتا ہے! تم دوسروں کے بچوں کو گندی نگاہ سے تاڑتے ہو تمہیں شرم نہیں آتی اور جب میں کہتا ہوں کہ مت تاڑو! تو کہتے ہو کہ اختر کیسی بات کرتا ہے! اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

[6،5]: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۸﴾﴾

ایمان والے امانات کا خیال کرتے ہیں اور معاہدات کا خیال کرتے ہیں۔

[7]: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۹﴾﴾

31۔ مسند احمد: ج9ص416رقم الحدیث10158

اور نماز کی پابندی کرتے ہیں۔

اللہ رب العزت نے یہ سات اوصاف بیان کیے ہیں۔ شروع بھی نماز سے کیا ہے اور ختم بھی نماز پر کیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ فرمالیں کہ نماز کتنی اہم چیز ہے۔ جو لوگ نوافل کا اہتمام کرتے ہیں وہ سنن اور واجبات کا بھی اہتمام کرتے ہیں اور جو سنن اور واجبات کا اہتمام کرتے ہیں وہ فرائض کا بھی اہتمام کرتے ہیں، فرض کی حفاظت کے لیے نوافل کا اہتمام بہت ضروری ہے، نوافل کا اہتمام نہ کریں تو فرض کا اہتمام نہیں ہوتا۔

نماز میں رفع یدین نہ کرنے کی دلیل:

﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲﴾

جہاں خشوع کی اور تفسیریں ہیں ان میں سے ایک تفسیر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ بھی مروی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں:

مُخْبِتُوْنَ مُتَوَاضِعُوْنَ لَا يَلْتَفِتُوْنَ يَمِيْنًا وَّلَا شِمَالًا وَّلَا يَرْفَعُوْنَ أَيْدِيَهُمْ فِي الصَّلَاةِ.[32]

کہ خشوع و خضوع والے وہ لوگ ہیں جو نماز میں عاجزی اور انکساری کرتے ہیں اور دائیں بائیں نہیں دیکھتے اور نماز میں رفع الیدین نہیں کرتے۔

تو ہم کہتے ہیں کہ ہم اھل السنۃ والجماعۃ احناف دیوبند نماز پڑھتے ہیں اور نماز میں رفع الیدین نہیں کرتے۔ ہماری دلیل قرآن کریم کی یہی آیت ہے: ﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲﴾ جو لوگ رکوع جاتے، رکوع سے اٹھتے اور تیسری رکعت سے اٹھ کر رفع یدین کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہماری دلیل بھی قرآن کریم میں ہے:

32۔ تفسیر ابن عباس: ص 212

﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾[33]

یہاں ''مسجد'' سے مراد ہے ''صلوٰۃ'' یعنی ''عند کل صلوٰۃ'' کہ نماز کے وقت زینت کا خیال کیا کرو اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہاں زینت سے مراد رفع الیدین ہے یعنی نماز میں رفع الیدین کا اہتمام کرو۔ تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ایک صحابی عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ایک آیت کی تفسیر کریں جس کا معنی ہو کہ نماز میں رفع الیدین نہ کرو تو احناف کہتے ہیں کہ رفع الیدین نہ کرنا قرآن سے ثابت ہو گیا اور اگر ایک صحابی عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب رفع الیدین کرنے کی تفسیر کرتے ہیں تو رفع الیدین کرنا بھی تو قرآن سے ثابت ہو گیا۔

ہم کہتے ہیں کہ بات سمجھو! دو لفظ الگ الگ ہیں؛ ایک ہے لفظ ''فِيْ'' اور ایک ہے لفظ ''عِنْدَ'' ہے۔ لفظ ''فِيْ'' کا معنی ہوتا ہے میں اور اندر، اور لفظ ''عِنْدَ'' کا معنی ہوتا ہے پاس۔ تو نماز میں دو قسم کے رفع یدین ہیں؛ ایک رفع یدین ہے تکبیر تحریمہ کے وقت، یہ ہے ''عند'' اور ایک ہے رکوع کرتے وقت، یہ ہے ''فی''۔ یعنی ایک ہے رفع یدین نماز میں کرنا اور ایک ہے رفع یدین نماز کے پاس کرنا۔ تو عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

وَلَا يَرْفَعُوْنَ أَيْدِيَهُمْ فِي الصَّلَاةِ.

خشوع والے نماز میں رفع یدین نہیں کرتے۔ یہ جو رکوع والا رفع الیدین ہے یہ نماز میں والا رفع یدین ہے لہذا اسے نہ کیا جائے اور ﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ میں مسجد سے مراد نماز ہے اور بقول آپ کے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق نماز کے پاس رفع الیدین کرو تو یہ نماز کے پاس والا رفع یدین وہ ہوتا

33۔ الاعراف 7:31

ہے جو نماز کے شروع میں ہو یعنی تکبیر تحریمہ والا رفع یدین۔ اب اس کا معنی یہ ہے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رفع یدین کرو یعنی تکبیر تحریمہ والا رفع یدین اور ادھر عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نہ کرو یعنی رکوع والا رفع یدین۔ تو تمہارا ایک رفع یدین بھی قرآن سے ثابت نہیں ہے، جو کرنا ثابت ہے وہ بھی ہمارے والا ہے اور جو نہ کرنا ثابت ہے وہ بھی ہمارے والا ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

میں نے کل بھی کہا تھا کہ بات سمجھانا سیکھو! اپنی زبان میں فصاحت پیدا کرو، فصاحت اور بلاغت کا معنی لفاظی نہیں ہے، فصاحت اور بلاغت کا معنی ہے کہ اس طرح گفتگو کرو کہ سامع اور مخاطب کے دل و دماغ میں بات اتر جائے، یوں بات کیا کرو!

عیدین میں رفع یدین کیوں؟

پھر وہ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اچھا! احناف نماز میں رفع الیدین کے قائل نہیں لیکن جب تم عیدین کی نماز پڑھتے ہو تو چھ مرتبہ رفع الیدین نماز میں کرتے ہو ہر تکبیر کے ساتھ اور جب وتر پڑھتے ہو تو تیسری رکعت میں دعائے قنوت کے وقت جب اللہ اکبر کہتے ہو تو رفع الیدین کرتے ہو تو یہ رفع یدین بھی تو نماز میں ہوا، پھر یہ عمل بھی تو تمہارے مسلک کے خلاف ہوا۔

ہم نے کہا: نماز نام ہے اذکار اور افعال کا لیکن اصل نام ہے اذکار کا – یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں، پھر دوسروں کو سمجھائیں – ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ﴿۱۴﴾﴾[34] کہ نماز پڑھو تاکہ تم میرا ذکر کرو۔ نماز کا مقصد ہے اللہ کا ذکر کرنا۔ میں بارہا کہتا ہوں کہ ترجمہ کرنا سیکھو۔ اس آیت کا ترجمہ یوں کرو! ”نماز پڑھو تاکہ تم نماز کے ذریعے میرا ذکر کرو!“ لام تعلیل کا ہے۔ معلوم ہوا کے نماز سے مقصود

34۔ طٰہٰ 14:20

اللہ کا ذکر ہے۔ اب نماز میں کچھ اقوال ہوتے ہیں، ان کو ذکر کہنا اور سمجھنا بہت آسان ہے۔ مثلاً "سُبْحَانَكَ اللّٰھُمَّ " یہ ذکر ہے، "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" یہ ذکر ہے، "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى" یہ ذکر ہے، "اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ" یہ ذکر ہے لیکن جو افعال ہیں وہ کیسے ذکر بنیں؟ ہم کہتے ہیں کہ نماز کے وہ افعال جو مقرون بذکر اللہ ہیں وہ ذکر ہی ہیں۔ جیسے ہم نے ہاتھ اٹھائے اور کہا اللہ اکبر، یہ ہاتھ اٹھانا ذکر ہو گیا کیونکہ ہم نے اس کے ساتھ اللہ اکبر کہہ دیا ہے۔ ہم ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوئے اور "سُبْحَانَكَ اللّٰھُمَّ " پڑھا تو یہ قیام بھی ذکر ہو گیا کیونکہ اس کے ساتھ اللہ کا ذکر مل گیا ہے۔ پھر ہم نے کہا "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" اور کھڑے ہوئے اور ساتھ اللہ کا نام بھی لیا تو گویا کہ کھڑا ہونا بھی ذکر ہو گیا۔ پھر ہم رکوع میں گئے تو کہا اللہ اکبر، ہم سجدے میں گئے تو کہا اللہ اکبر۔ اب جو افعال کے ساتھ ذکر ہے تو اس ذکر کی وجہ سے وہ افعال بھی ذکر ہو گئے۔

اسی طرح جب ہم تکبیراتِ عیدین کہتے ہیں تو ہاتھ اٹھاتے وقت ساتھ کہہ دیتے ہیں اللہ اکبر۔ یہ ہاتھ اٹھانا ایک فعل ہے لیکن ساتھ اللہ کا نام لیا تو یہ بھی ذکر بن گیا۔ وتر کی تیسری رکعت میں ہاتھ اٹھاتے ہیں اور ساتھ کہتے ہیں اللہ اکبر، تو یہ فعل کے ساتھ اللہ کا نام لیا تو یہ بھی ذکر بن گیا۔ تو تکبیراتِ عیدین کے وقت اور وتر کی تیسری رکعت میں دعائے قنوت کے وقت جب ہم ہاتھ اٹھاتے ہیں، رفع الیدین کرتے ہیں تو ساتھ اللہ کا نام بھی لیتے ہیں۔ لہذا یہ حرکات اور افعال بھی اللہ کا ذکر بن جاتے ہے، اور غیر مقلدین جب رکوع میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں اللہ اکبر، انہوں نے یہاں پر دو کام کیے ہیں؛ ایک رکوع میں گئے اور دوسرا ہاتھ اٹھائے۔ اب یہ اللہ اکبر کس کے لیے ہے؟ رکوع میں جانے کے لیے ہے یا رفع یدین کے لیے ہے؟ تو یہاں پر ذکر ایک ہے اور افعال دو ہیں تو یہ ذکر کس فعل کے لیے ہے؟ اب ان افعال میں سے ایک ہے رکوع جانا اور ایک ہے ہاتھ اٹھانا۔ رکوع جانا تو فرض ہے اگر رکوع نہ کریں تو نماز نہیں ہوتی

اور ہاتھ اٹھانا یعنی رفع الیدین کرنا یہ تمہارے ہاں بھی فرض نہیں ہے تو اس اللہ اکبر والے ذکر کو کس فعل کے لیے شمار کرو گے؟ رکوع کے لیے شمار کرو گے تو ٹھیک ہے اس سے رکوع اللہ کا ذکر بن جائے گا اور نماز کا حصہ بن جائے گا۔ اگر آپ کہتے ہیں کہ اللہ اکبر کہنا رفع الیدین کے لیے ہے تو پھر ہاتھ اٹھانا تو اللہ کا ذکر بن جائے گا لیکن رکوع کرنا اللہ کا ذکر نہ بنے گا تو جب اللہ کا ذکر نہ بنا تو نماز کا حصہ نہ ہوا اور رکوع نماز کا حصہ نہیں ہو گا تو نماز ادا نہیں ہو گی۔ اگر اللہ اکبر کہنے کو رکوع کا حصہ بنالیں اور رفع الیدین کا نہ بنائیں تو رفع الیدین نماز کا حصہ نہ بنے گا تو نماز تمہارے ہاں پھر بھی ہو جائے گی۔ اس لیے آپ جو رفع الیدین کرتے ہیں اس کے ساتھ اللہ کا ذکر موجود نہیں ہوتا، جب اس رفع الیدین کے ساتھ اللہ کا نام نہیں لیا گیا تو یہ ذکر اللہ نہ بنا اور قرآن کہتا ہے: ﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ کہ نماز پڑھو تاکہ تم میرا ذکر کرو۔ اس لیے ہمارے والا جو رفع الیدین ہے وہ تو نماز کا حصہ بن جاتا ہے اس پر تو کوئی اشکال ہی نہیں اور تمہارے والے رفع الیدین نماز کا حصہ نہیں بنتے اس لیے اشکال اس پر رہتا ہے، ہمارے رفع الیدین پر اشکال بالکل نہیں ہوتا۔

تخلیقِ انسانی کے سات مراحل:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿١٢﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿١٣﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿١٤﴾﴾

اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کے سات مراحل بنائے۔ پہلا مرحلہ ﴿مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ﴾ ہے کہ انسان کی تخلیق کا پہلا مرحلہ مٹی کا خلاصہ ہے۔ پوری مٹی

سے تو بندہ پیدا نہیں ہوتا البتہ مٹی کے خلاصے سے پیدا فرمایا۔ دوسرا مرحلہ ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ﴾ اس کے بعد مٹی کے خلاصے سے نطفہ یعنی پانی کا قطرہ بنا۔ تیسرا مرحلہ ﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً﴾ کہ اس پانی کے نطفے کو علقہ یعنی جما ہوا خون بنا دیا۔ چوتھا مرحلہ ﴿فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً﴾ کہ اس جمے ہوئے خون کا لوتھڑا بنایا۔ پانچواں مرحلہ ﴿فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا﴾ پھر اس لوتھڑے کو ہڈیوں میں تبدیل کر دیا۔ چھٹا مرحلہ ﴿فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا﴾ پھر ہڈیوں کے اوپر گوشت چڑھا دیا۔ ساتواں مرحلہ ﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ﴾ کہ پھر مکمل انسان بنا دیا۔ یہ جو ساتواں مرحلہ ہے یہ انسان کے بدن میں روح ڈالنا ہے۔

روح دو قسم کی ہے: ایک ہے روحِ حیوانی اور ایک ہے روحِ حقیقی۔ روحِ حقیقی تو اللہ نے عالمِ ارواح میں ہر کسی کی پیدا فرمادی ہے، ایک ہے ہر عضو میں روح تو یہ روحِ حیوانی ہوتی ہے۔ عالمِ ارواح اور روحِ حقیقی کا تعلق جیسے ہی جڑ جاتا ہے تو بندے میں حیات پیدا ہوتی ہے۔ جب اس کا تعلق ختم ہو جاتا ہے تو انسان پر موت آجاتی ہے۔

حیات فی القبر کا ثبوت:

﴿ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿١٥﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿١٦﴾﴾

اللہ نے تمہیں ان سات مراحل سے گزار کر زندگی دی، پھر تمہیں موت دیں گے اور پھر قیامت کے دن تمہیں دوبارہ کھڑا کریں گے۔

اب بعض لوگوں کا اس آیت سے یہ استدلال کرنا کہ قبر میں حیات نہیں ہے بہت بڑی حماقت اور نادانی کی بات ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پہلے موت دیں گے، پھر قیامت کے دن اٹھائیں گے۔ اگر قبر میں حیات ہوتی تو اس کا بھی ذکر ہوتا، معلوم ہوا کہ قبر میں حیات نہیں ہے۔

اس کا جواب اچھی طرح سمجھ لیں کہ ایک ہے حیاتِ ظاہری اور ایک ہے حیاتِ باطنی اور حیاتِ مخفی۔ ایک وہ حیات ہے جو نظر آرہی ہوتی ہے اور ایک وہ حیات ہے جو نظر نہیں آتی۔ موت کے بعد قبر میں جو حیات ملتی ہے وہ حیاتِ ظاہری نہیں ہوتی بلکہ یہ حیاتِ مخفی ہوتی ہے، اسی لیے فرمایا کہ ﴿لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾[35] کہ یہ حیات ایسی ہے کہ تمہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جب قیامت کے دن دوبارہ کھڑا کریں گے تو وہ حیات ایسی ہو گی جو مخفی نہیں ہو گی بلکہ ظاہری اور واضح ہو گی۔ اب آیت کا مطلب اور تفسیر یہ ہو گی کہ اللہ تعالیٰ بندے کو پہلے موت دیں گے، اس کے بعد قبر میں حیات دیں گے لیکن یہ حیات مخفی ہو گی ظاہری اور آنکھوں سے نظر آنے والی نہیں ہو گی، پھر جب قیامت قائم ہو گی تو اسی مخفی حیات کو ظاہری حیات بنا کر بندے کو کھڑا کر دیں گے۔ اسی لیے قران کریم میں موت کے بعد اٹھنے کے لیے کبھی لفظ ”بعث“ استعمال ہوا ہے اور کبھی لفظ ”حیات“ استعمال ہوا ہے۔ لفظ ”بعث“ کا معنی ہوتا ہے کہ بندے میں حیات تو تھی لیکن نظر نہیں آرہی تھی، مخفی تھی اور جب بندے کو کھڑا کر دیا تو جو حیات پہلے سے ہے اب وہ نظر آنے لگی ہے۔

اس کو مثال سے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک آدمی سویا ہوا ہے لیکن ہے زندہ، اب کوئی کہے: اس کو اٹھاؤ۔ تو اٹھانے کا معنی کیا ہے کہ اس کو زندہ کرو یا نیند سے بیدار کرو؟ (نیند سے بیدار کرو۔ سامعین) لیکن وہ نیند سے اٹھتے ہی کہتا ہے: ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَحْیَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَیْهِ النُّشُوْرُ“ کہ تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں موت کے بعد زندہ کیا اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اب دیکھیں کہ ہم نے تو کہا تھا کہ اس سوئے ہوئے کو بیدار کرو اور وہ سویا ہوا شخص اٹھ کر

35۔ البقرۃ 154:2

کہتا ہے کہ میں زندہ ہو گیا۔ حالانکہ اسے کہنا چاہیے کہ میں بیدار ہو گیا ہوں لیکن وہ کہتا ہے کہ میں زندہ ہو گیا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جو نیند میں حیات ہے یہ بیداری کی نسبت کم ہے اس لیے اس کو نیند بھی کہہ دیتے ہیں اور موت بھی کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح قبر میں جو حیات ہے یہ حیات ایسی ہے جو دنیاوالی حیات کی نسبت کم ہے اور اتنی حیات ہے کہ "قَدْرَ مَا يَتَلَذَّذُ وَ يَتَأَلَّمُ" جس سے بدن راحت کو محسوس کرے اور خدانخواستہ اگر کافر ہے تو دکھ کو محسوس کرے کیونکہ حیات بہت کم درجے کی ہے۔ اس لیے اس حیات کو موت کی طرح سمجھ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بندے کو دوبارہ زندہ کر دیا گیا ہے۔

تو کبھی لفظِ بعث آتا ہے اور کبھی لفظِ احیاء۔ احیاء کا معنی کہ پہلے اس کی حیات مخفی تھی اب اس کو حیات ظاہری مل گئی ہے تو کہہ دیا گیا کہ اس کو زندہ کر دیا اور بعث کا معنی کہ حیات پہلے سے تھی لیکن اس کے اجزاء منتشر تھے، اب اکٹھے کیے اور اس کو کھڑا کر دیا۔ اس لیے یہ استدلال کرنا کہ اس آیت سے قبر کی حیات کی نفی ہوتی ہے بالکل غلط ہے۔ قبر کی حیات کی نفی کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں بارہا کہتا ہوں کہ بندے پر مسئلہ کھل جائے تو پھر الجھن نہیں رہتی، جب تک مسئلہ نہ کھلے تو پھر الجھنیں ہی رہتی ہیں۔

قوم کسے کہتے ہیں؟

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٢٣﴾﴾

ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا۔ انہوں نے جا کر کہا کہ اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو جس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

ایک ہے لفظِ "امت" اور ایک ہے لفظِ "قوم"۔ قوم کا مفہوم الگ ہے اور

امت کا مفہوم الگ ہے۔ پیغمبر کو جس کی طرف بھیجا جاتا ہے وہ پیغمبر کی امت ہوتی ہے اور پیغمبر جس میں پیدا ہوتا ہے وہ پیغمبر کی قوم ہوتی ہے۔ پیغمبر کی امت میں تو کئی قومیں ہوتی ہیں لیکن پیغمبر کی اپنی قوم ایک ہوتی ہے کئی قومیں نہیں ہوتیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ﴾[36]

ہم نبی کو وحی کی وہ زبان دیتے ہیں جو نبی کی قوم کی زبان ہوتی ہے۔

اگر ہم دنیا کے سارے مسلمان ایک قوم ہوتے تو ہم سب کی زبان عربی ہوتی حالانکہ ہم سب کی زبان عربی نہیں ہے۔ پتا چلا کہ ہم مسلمان کئی قومیں ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو اس کی قوم کی زبان میں وحی دیتا ہے تاکہ نبی اپنی قوم کو اسی کی زبان میں اللہ کے احکام سمجھا سکے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم قریش تھی جس کی زبان عربی تھی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عربی زبان میں وحی دی گئی ہے۔

میں عوام کو سمجھانے کے لیے یہ بات کہا کرتا ہوں آپ مرزائیوں سے پوچھیں کہ تم لوگ مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی مانتے ہو، یہ بتاؤ کہ اس پر وحی آتی تھی؟ وہ کہیں گے کہ جی آتی تھی۔ اس کی وحی کس زبان میں آتی تھی؟ آپ جب اس کی نام نہاد وحی کی زبانیں گنیں وہ سات یا نو بنتی ہیں، کبھی عربی میں وحی، کبھی فارسی میں وحی، کبھی انگریزی میں وحی، کبھی سنسکرت میں وحی، کبھی کسی اور زبان میں وحی حالانکہ نبی کی وحی کی زبان نبی کی قوم کی زبان ہوتی ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ مرزا قادیانی کی قومیں سات تھیں نو تھیں یا ایک تھی؟ کہتے ہیں: جی ایک تھی۔ تو جب قوم اس کی ایک ہے تو

36۔ ابراہیم 4:14

وحی کی زبان بھی ایک ہونی چاہیے، جب اس کی وحی کی زبانیں کئی ہیں تو اس کی قومیں بھی کئی ہونی چاہییں نا! اور جس آدمی کی قومیں کئی ہوتی ہیں وہ حلال زادہ نہیں ہوتا بلکہ وہ حرام زادہ ہوتا ہے۔ حرام زادے آدمی کو شریف انسان ماننا مشکل ہے ہم اس کو نبی کیسے مان لیں؟! بات سمجھ میں آگئی؟ (جی ہاں۔ سامعین)

ربوہ کا معنی اور قادیانی دھوکہ:

﴿وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّ اٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾﴾

حضرت مریم علیہا السلام جبرائیل امین علیہ السلام کے پھونکنے سے امید سے ہو گئیں۔ جب بچہ جننے کا وقت آیا تو اپنی بستی سے نکل گئیں اور ایک اونچی جگہ پر ٹھہریں۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَاۤ اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾ وَ هُزِّیْۤ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾﴾[37]

کہ فرشتے نے ان کے نیچے ایک جگہ سے انہیں آواز دی کہ آپ غم نہ کریں۔ آپ نے رب نے آپ کے نیچے ایک چشمہ پیدا کر دیا ہے۔ ایک کھجور کا درخت ہے۔ اس کے تنے کو اپنی طرف ہلائیں تو پکی ہوئی تازہ کھجوریں گریں گی۔ انہیں کھاتی پیتی رہیں۔ کھجوریں کھانے اور چشمے کا پانی پینے سے معلوم ہوتا ہے کھجور نہایت طاقتور چیز ہے۔ ولادت کے بعد عورت کو بہت طاقت والی خوراک دیتے ہیں تاکہ کمزوری دور ہو جائے۔ تو مریم علیہا السلام نے اس مقام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جنا۔

37۔ مریم 19:24،25

"رَبْوة" عربی زبان میں اونچی جگہ کو کہتے ہیں۔ اس آیت سے قادیانی دھوکہ دیتے ہیں، ربوہ کا معنی ربوہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے شہر کا ذکر قرآن میں ہے۔ دیکھو کفر کتنی محنت کرتا ہے۔ ان لوگوں نے ایسی جگہ کو تلاش کیا جو عام زمینوں سے اونچی ہے۔ یہ چناب نگر میں اونچی جگہ پر ہے۔ پہاڑ ہیں اور ساتھ میں دریا کا جو پانی بہہ رہا تھا اس کو انہوں نے چشمہ بنا دیا کہ قرآن کریم میں ہے۔ اب دنیا کے کافر جن کو انہوں نے مرزائی بنا کر ایک کفر سے دوسرے کفر میں لانا ہے ان کو یہ سمجھانے کے لیے کہ مرزا قادیانی نبی ہے اور اس کا ذکر قرآن میں ہے۔

ہمارے اکابر کو اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق اجر عطا فرمائے۔ حضرت مولانا منظور احمد چینوٹی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات پہ محنت شروع کی کہ اس شہر کا نام تبدیل کرانا ہے۔ مولانا چینوٹی بہت محنتی آدمی تھے۔ بس جس کام میں لگ جاتے اس کو چھوڑتے نہیں تھے جب تک منزل تک نہ پہنچا دیتے۔ ربوہ کا نام تبدیل کروا کر "چناب نگر" بنانے میں مولانا منظور احمد چینوٹی رحمۃ اللہ علیہ کو تیس سال لگ گئے۔ اس لیے بیانات میں جب بھی ذکر کریں تو "چناب نگر" ہی کہیں تاکہ ان کے دماغ سے ربوہ نکل جائے اور چناب نگر معروف ہو جائے۔ تیس سال کی محنت کے بعد ربوہ سے چناب نگر تبدیل کیا گیا۔ اب اگر باہر سے کوئی کافر آئے گا اور یہاں چناب نگر لکھا ہو گا تو وہ مرزائیوں سے کہے گا ناکہ تم تو کہتے ہو کہ قرآن میں جس ربوہ کا ذکر ہے وہ یہی شہر ہے لیکن یہاں تو چناب نگر لکھا ہوا ہے، یہ ربوہ تو نہیں ہے۔

انسان بقدرِ وسعت مکلف ہوتا ہے:

﴿وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم جب بھی کسی چیز کا حکم دیتے ہیں تو آدمی کی

وسعت اور طاقت کے مطابق دیتے ہیں۔ اس لیے یہ بات ذہن نشین کر لیں قرآن کریم اور شریعت کا حکم بندے کے لیے مشکل تو ہو سکتا ہے لیکن ناممکن نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ ایسا حکم دیتے ہی نہیں جس کا کرنا بندے کے اختیار اور بس میں نہ ہو۔

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ کوئی مرد زنا کرنے کے لیے عورت کے جسم پر بیٹھا ہو تو اسے حکم ہے کہ پیچھے ہٹ جاؤ! اگر پیچھے ہٹنا ممکن نہ ہوتا تو اللہ رب العزت پیچھے ہٹنے کا حکم ہی نہ دیتے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ایسی حالت میں بھی زنا سے بچنا انسان کے اختیار میں ہے۔

اور ہمارے حضرت عارف باللہ مولانا شاہ حکیم محمد اختر رحمۃ اللہ علیہ اس کی مثال دے کر یوں سمجھاتے تھے کہ یہ کیسے اختیار میں ہے! فرماتے تھے کہ آدمی زنا کے لیے عورت کے جسم پر بیٹھا ہو اور اچانک دروازہ کھلے تو ساری شہوت ختم ہو جاتی ہے، کوئی بندہ اوپر سے آجائے تو شہوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ فرماتے کہ اتنی سی بات ہے تو یہ بندہ کیسے کہتا ہے کہ میرے بس میں نہیں ہے، معمولی تصور سے کہ مجھے کوئی دیکھ نہ لے آدمی کی خواہش اور شہوت ختم ہو جاتی ہے تو جب یہ تصور کریں کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے تو شہوت کیسے ختم نہیں ہو گی؟!

صاحبِ حیثیت بندوں پر عذاب کا معنی:

﴿بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَ لَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿٦٣﴾ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ﴿٦٤﴾﴾

ان مشرکین کے دل اس دین اسلام کے معاملہ میں بالکل غافل ہوئے پڑے ہیں اور اس کے علاوہ ان لوگوں کے اور بھی کئی برے کام ہیں جو یہ لوگ کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ہم ان میں سے دولت مند اور امیر لوگوں کو عذاب دیتے ہیں تو یہ لوگ چیخ اٹھتے ہیں۔

مشرک لوگ حضرات انبیاء علیہم السلام کی بات نہیں مانتے تھے تو ان پر عذاب آجاتا اور جب عذاب آنا ہوتا تو اللہ فرماتے ہیں کہ ہم ان میں سے آسودہ حال، سرمایہ دار اور مالدار لوگوں کو پکڑتے ہیں پھر وہ مالدار لوگ چیختے چلاتے ہیں۔ عذاب تو امیر اور غریب دونوں پر آتا ہے لیکن قرآن مجید میں جب بھی عذاب آنے کا ذکر آتا ہے تو مالداروں کا ذکر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحبِ حیثیت بندہ ہر آفت سے بچنے کا سامان اختیار کر لیتا ہے لیکن جب اللہ کا عذاب آتا ہے تو یہ صاحبِ حیثیت لوگ بھی اس سے بچنے کا سامان نہیں کر پاتے اور عذاب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

مشرکین کی عادت:

﴿قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿٦٦﴾ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿٦٧﴾﴾

مشرکین کی عادت یہ تھی کہ اللہ کی بات کو سنتے نہیں تھے بلکہ دوڑتے جاتے تھے، آیات کا انکار کرتے تھے اور یہ کام غرور اور تکبر کی وجہ سے کرتے تھے۔ اور یہ لوگ رات کو محفلیں سجا سجا کر قرآن کریم کے بارے میں بے ہودہ باتیں کرتے تھے۔

لفظ "سٰمِرًا" اگرچہ مفرد ہے لیکن یہاں جمع یعنی "سَامِرِيْنَ" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ان مشرکین کی یہ گندی عادت تھی کہ رات کو بیٹھ کر قصے کہانیاں سناتے، اللہ کی آیات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اس آیت کے تحت مفسرین نے لکھا ہے کہ رات کو قصے سنانا کہانیاں سنانا یہ مناسب نہیں ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جب عشاء کے بعد کسی کو قصے کہانیوں اور فضول گپوں میں مشغول دیکھتے تو سخت تنبیہ فرماتے اور بعض لوگوں کو تو باقاعدہ سزا دیتے تھے، فرماتے کہ عشاء کے بعد جلدی سو جاؤ شاید صبح تہجد کی توفیق مل

جائے۔

مشرکین مکہ کی ہٹ دھرمی:

﴿وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿٧٦﴾﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کے لیے بددعا کی جس کی وجہ سے ان پر سخت قحط آیا۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ جو اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے، مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ عالمین کے لیے رحمت بن کر آئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا واقعی میں رحمت بن کر آیا ہوں۔ ابوسفیان کہنے لگے کہ ہمارے کچھ بندے آپ نے بدر میں مار دیے اور جو باقی بچے ہیں ان کو قحط سالی میں مارنا چاہتے ہیں؟ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ یہ قحط ختم ہو جائے۔ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے دعا فرمائی تو قحط ختم ہو گیا۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کو عذاب میں مبتلا کیا تھا اور پھر اس سے نجات بھی دی لیکن یہ لوگ ایسے ہیں کہ پھر بھی اپنے رب کے سامنے نہیں جھکے۔ اور یہ عذاب سے نجات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے ملی لیکن یہ لوگ پھر بھی اپنے کفر اور شرک پر جمے رہے حالانکہ حق تھا کہ یہ لوگ راہِ راست پر آ جاتے۔

﴿حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿٧٧﴾﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ اگر ہم ان پر سخت عذاب نازل کریں تو یہ لوگ ایک دم مایوس اور حیرت زدہ ہو جائیں گے۔

نافرمان لوگوں پر یہ عذاب یا تو دنیا میں ہی کسی وقت آ سکتا ہے یا پھر موت

کے بعد یہ لوگ اس عذاب کا مزہ چکھیں گے۔ اللہ پاک ہمیں ہر حال میں اپنی اطاعت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

توحید و قیامت دو اہم عقیدے:

﴿وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۷۸)﴾

اللہ رب العزت نے ان دو رکوع میں اہمیت کے ساتھ دو مسئلے بیان کیے ہیں:

1: توحید 2: قیامت

پھر توحید پر اللہ نے بہت سارے دلائل ارشاد فرمائے۔ اس لیے ان آیات میں بہت ساری باتیں ایسی ہیں جو بہت اہم ہیں اور سمجھنے والی ہیں۔ فرمایا کہ اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہیں سننے کے لیے کان دیے ہیں، دیکھنے کے لیے آنکھیں دی ہیں اور سمجھنے کے لیے دل دیا ہے، ﴿قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ﴾ پھر بھی تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو، چاہیے تو یہ تھا کہ جب اللہ نے بغیر مانگے آنکھ دی ہے تو اس سے وہ کچھ دیکھتے جو اللہ چاہتے ہیں، کان دیے ہیں تو اس سے وہ سنتے جو اللہ چاہتے ہیں، اللہ نے دل دیا تو اس سے وہ سوچتے جو اللہ چاہتے ہیں، کان آنکھ اور دل اللہ نے دیے ہیں اور استعمال تم اپنی مرضی کے مطابق کرتے ہو، یہ بات مناسب نہیں ہے۔

اللہ کے شکر کی ایک صورت یہ ہے کہ بندہ زبان سے کہے کہ یا اللہ! تیرا شکر ہے، یا اللہ! تیرا بڑا شکر ہے۔۔۔ یہ بھی ٹھیک ہے لیکن اصل شکر یہ ہے کہ انسان اعضاء سے وہ کام کرے جو اللہ چاہتے ہیں۔ کوئی شخص اپنے والد سے کہے کہ آپ میرے والد ہیں، بڑے ہیں، بزرگ ہیں میں آپ کو مانتا ہوں۔ والد صاحب کہے کہ بیٹا! مجھے پیاس لگی ہے میں نے پانی پینا ہے جاؤ پانی لاؤ! اب بیٹا کہتا ہے کہ ابو جان آپ کے پاس سے

اٹھنے کو میرا دل نہیں کرتا۔ ایک بندہ کہتا ہے کہ ابو! میں آپ کا بہت ادب کرتا ہوں۔ والد صاحب کہتا ہے کہ مجھے بھوک لگی ہے، میں نے کھانا کھانا ہے جاؤ کھانا لاؤ! کہتا ہے ابو جی میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کے پاس ہی بیٹھوں۔ اب بیٹے کی یہ باتیں اپنی جگہ پر تو ٹھیک ہیں لیکن اس موقع پر یہ مناسب نہیں ہیں۔ اس موقع پر تو یہ دیکھیں کہ والد صاحب کی ضرورت کیا ہے؟ جو ضرورت ہوتی ہے وہ پوری کریں اور والد صاحب کا حکم مانیں۔ اللہ رب العزت کا معاملہ یہ ہے کہ بندوں سے اس کو کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اللہ ہم سے کوئی چیز مانگتے ہیں، ہاں اللہ رب العزت ہمیں جو احکام دیتے ہیں وہ ہمارے فائدے کے لیے دیتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ ان تمام اعضاء کو اللہ کے حکم کے مطابق استعمال کرو اور یہی اصل اللہ کا شکر ہے۔

بعث بعد الموت:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٧٩﴾ وَهُوَ الَّذِيْ
يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٨٠﴾ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ
مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿٨١﴾ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ
﴿٨٢﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٨٣﴾﴾

کہ تمہیں خدا ہی نے زمین میں پھیلایا اور پھر تم نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ ہی زندہ کرتا ہے اور اللہ ہی موت دیتا ہے، دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن اللہ ہی لاتے ہیں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے، اتنی موٹی موٹی باتیں بھی نہیں سمجھتے! اب دیکھو قرآن نے کتنے اچھے انداز میں یہ بات سمجھائی ہے، اور فرمایا کہ اے پیغمبر! آپ تو ان کو باتیں سمجھا رہے ہیں لیکن یہ لوگ سمجھنے کے بجائے ویسی ہی باتیں کرتے ہیں جیسی باتیں پچھلے لوگوں نے کہی تھیں، تو جو پہلے نبیوں کو جواب ملتا تھا وہی

جواب آپ کو بھی ملنا ہے۔ پہلے لوگ کیا کہتے تھے؟ پہلے لوگ کہتے تھے کہ جب ہم فوت ہو جائیں گے، مٹی ہو جائیں گے، ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہم واقعی دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ یہ جو وعدے ہمارے ساتھ کیے جارہے ہیں یہ ہمارے آباؤاجداد کے ساتھ پہلے والے انبیاء علیہم السلام بھی کیا کرتے تھے، ان وعدوں کی کوئی حقیقت نہیں، نہ ہمارے آباء و اجداد اٹھے تھے اور نہ ہم اٹھیں گے، یہ نہیں ہو سکتا، یہ باتیں سب پرانے قصے اور کہانیاں ہیں۔

اب یہاں جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ مشرکین اور کفار جو قیامت کے دن کا انکار کرتے ہیں انہیں ایک اشکال اور دماغی تعجب تھا۔ ان کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو دوبارہ کیسے اٹھائے جائیں گے؟

ان کا جواب تو قرآن مجید نے دیا ہے اپنے مقام پر کہ دیکھو! جب تم نہیں تھے تو ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا، تو جب ایک بار پیدا کیا تو دوبارہ پیدا کرنا تو بہت آسان ہے، اب کیا مشکل ہے؟ مثلاً ایک عمارت موجود نہیں ہے، اس کو پہلی مرتبہ بنانا مشکل ہے لیکن جب عمارت تیار ہو جائے تو اس کو دوبارہ بنانا کیا مشکل ہے؟!

عذابِ قبر برحق ہے:

اب کتنے لوگ ایسے ہیں کہ جو اسلام کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اور پھر ذہن یہ ہوتا ہے کہ جب انسان فوت ہو جاتا ہے، قبر میں چلا جاتا ہے، مٹی میں ختم ہو جاتا ہے تو اس کے جسم کو عذاب نہیں ہوتا کیونکہ جسم تو ختم ہو گیا۔ لہٰذا عذاب صرف روح کو ہو گا۔ کتنے تعجب کی بات ہے۔ دیکھو! اس جسم کو ثواب اور عذاب ہم نے نہیں دینا، یہ اللہ تعالیٰ نے دینا ہے، کوئی چیز نظر نہ آرہی ہو اور اس کو مارنا اور عذاب دینا ہو تو یہ ہمارے لیے مشکل ہے اللہ کے لیے مشکل نہیں ہے، اللہ کی قدرت کا انکار تو نہ کرو، دعویٰ توحید کا ہے اور انکار قبر کے عذاب کا کیا جارہا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے! بڑے

تعجب کی بات ہے۔

اس لیے میں عرض کرتا ہوں کہ یہ مسئلہ اچھی طرح سمجھو کہ قبر کہتے ہیں اس جگہ کو جہاں میت اور میت کے اجزا ہوں۔ قبر کا معنی یاد رکھیں! اگر ایک بندے کو جانور نے کھالیا، اس انسان کے اعضاء کے اجزا جانور کے معدہ میں پہنچے ہیں، پھر تبدیل ہو کر زمین میں گئے ہیں اور ذروں کی صورت میں زمین میں تقسیم ہوگئے ہیں لیکن وہ اجزاء گئے تو ہیں، جہاں جہاں منتشر اجزاء ہیں وہ ساری جگہ اس کے لیے قبر ہے۔ کوئی آدمی دریا میں یا سمندر میں گرا، پھر وہ وہیں گل گیا اور اس کے اجزاء پانی میں تحلیل ہوگئے، یہ ہمیں نہیں پتا لیکن اللہ کو تو پتا ہے، اس بندے کے اجزاء جہاں جہاں ہیں وہ ساری کی ساری اس بندے کی قبر ہے۔ اگر کسی شخص کو جلا دیا ہے، پھر اس کی راکھ کو پانی میں بہا دیا ہے تو یہ سارے اجزاء جہاں جہاں گئے ہیں یہی اس کی قبر ہے۔ تو قبر صرف وہ جگہ نہیں جہاں میت کو دفن کرتے ہیں بلکہ وہ بھی قبر ہے جہاں میت اور میت کے اجزاء ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان اجزاء سے روح کا تعلق جوڑتے ہیں اور تعلق جوڑ کر اگر بندہ نیک ہو تو اچھا بدلہ دیتے ہیں اور اگر کافر ہو تو اس کو سزا دیتے ہیں، اس لیے اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟

صحیح بخاری میں ایک روایت موجود ہے۔ ایک شخص تھا، اس نے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو بہت سی لکڑیاں جمع کر کے آگ جلانا اور مجھے اس میں ڈال دینا، میری لاش جلانے کے بعد ہڈیوں کو پیس لینا اور اس راکھ کو کسی گرم یا کسی تیز ہوا چلنے والے دن میں پانی میں بہا دینا۔ جب وہ فوت ہو گیا تو اس کے گھر والوں نے اس کی وصیت کے مطابق یہ کام کیا اور اس کی راکھ کو پانی میں بہا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بندے کے اعضاء کو جمع کیا اور اس سے پوچھا: ”لِمَ فَعَلْتَ؟“ کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ مطلب یہ تھا کہ تو نے ایسی وصیت کیوں کی؟ اس نے کہا: مِنْ خَشْيَتِكَ، اے اللہ!

تیرے ڈر کی وجہ سے ایسا کیا۔ تو خدا نے اس کو معاف کر دیا۔[38]

انسان بقدرِ عقل مکلف ہے:

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ یہ عقیدہ کفریہ ہے کہ کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ میرا جسم ہو گا تو اللہ عذاب دے گا اور اگر جسم نہیں ہو گا تو اللہ عذاب ہی نہیں دے گا لیکن اللہ نے اس بندے کو پھر بھی معاف کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی اپنی عقل کے مطابق مکلف ہوتا ہے، جتنی عقل ہو گی اتنا ہی مکلف ہو گا۔ اس کا ذہن یہ نہیں تھا کہ عذاب نہیں ہو گا۔ اس کا ذہن تھا کہ جسم ہو گا تو عذاب ہو گا، جب جسم ہی نہیں ہو گا تو عذاب ہی نہیں ہو گا۔ تو اس کا دماغ ہی اتنا تھا۔ وہ خدا کی قدرت کا انکار نہیں کر رہا تھا۔ اس لیے اللہ نے اسے معاف کر دیا تھا۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ اگر میں عالم ہونے کے باوجود حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت نہ ہوتا تو میں فتویٰ باز مولوی ہوتا اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے میں احتیاط سے فتویٰ دیتا ہوں۔

مرکز اھل السنۃ والجماعۃ مرکزِ اعتدال:

اس لیے ہم اپنے مرکز اھل السنۃ والجماعۃ 87 جنوبی سرگودھا میں علماء کو مناظرہ بھی پڑھاتے ہیں، فرقِ باطلہ کا رد بھی سکھاتے ہیں، بولنے کا سلیقہ بھی سکھاتے ہیں اور لکھنا بھی سکھاتے ہیں۔ میرے کالم پاکستان کے کئی اخبارات میں ہر ہفتے چھپتے ہیں اور آج کے اخبارات میں بھی چھپے ہیں۔ آپ آج بھی دیکھ لیں۔ سارے کام

38۔ صحیح البخاری، رقم:3479

بحمد اللہ ہم کرتے ہیں اور ہمارے مرکز وخانقاہ حنفیہ میں ایک سبق صبح نمازِ فجر سے پہلے ہوتا ہے، طلبہ اور اساتذہ اٹھ کر تہجد پڑھتے ہیں اس کے بعد سبق پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، پھر فجر کی نماز پڑھتے ہیں، پھر سورت یٰسین پڑھتے ہیں، پھر ذکر کرتے ہیں، پھر اشراق تک تلاوت کرتے ہیں، پھر اشراق پڑھ کر ناشتہ کرتے ہیں۔ ہم اس طرح اپنے طلبہ کو سنبھالتے ہیں کہ یہ فتوے باز اور لڑاکے مولوی نہ بنیں بلکہ اعتدال کے ساتھ مسائل کو سمجھانے والے علماء بنیں۔ اس کے باوجود میرے بارے میں مشہور ہے کہ یہ بڑا سخت ہے۔ میں حیران ہوں کہ سختی کا نام ونشان بھی نہیں ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ بہت سخت ہے۔

ہم نرم لوگ ہیں!

میں ملائشیا میں تھا تو وہاں میرے میزبان شافعی علماء تھے۔ وہ خانقاہوں میں پیر بھی ہیں اور تبلیغی مرکز رائیونڈ کے فاضل بھی ہیں۔ ان میں سے ایک مولانا جمال صاحب ہیں جو مجھے بڑی محبت سے استاذ جی کہہ کر پکارتے ہیں، وہ مجھے کہنے لگے: استاد جی لوگ کہتے ہیں کہ آپ بہت سخت ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ آپ بہت نرم ہیں اور آپ کے نرم ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ملائشیا والے آپ کو قبول کرتے ہیں۔ ملائشیا کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ملائی سے ہے یعنی اتنا نرم ہے۔ میں نے ملائشیا کے چار سفر کیے ہیں۔ ان میں لڑائی، گالی گلوچ کا تصور ہی نہیں ہے۔

خیر میں یہ بات سمجھا رہا تھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بندہ ایمان کا اتنا مکلف ہوتا ہے جتنی اس کے پاس عقل ہو۔ اس کی حضرت تھانوی نے ایک بڑی عجیب مثال دی ہے۔ فرمایا کہ ایک دیہات میں ایک عالم نے بیان کیا کہ اللہ آنکھ سے بھی پاک ہے، ناک سے بھی پاک ہے، کان سے بھی پاک ہے، اللہ دیکھتے ہیں بغیر آنکھ کے، سنتے ہیں بغیر کان کے اور بولتے ہیں بغیر زبان کے، اللہ سب چیزوں سے

پاک ہیں۔ تو ایک دیہاتی اٹھا۔ اَن پڑھ تھا۔ اس نے کہا کہ مولوی صاحب! یہ خدا ہے یا تربوز ہے- العیاذ باللہ- کہ نہ آنکھ ہے، نہ ناک ہے، نہ کان ہے کچھ بھی نہیں ہے، کیا یہ خدا ہے؟ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ اس کو کافر نہیں کہنا کیونکہ اس کی عقل اتنی ہے۔ اس کی سوچ یہ ہے کہ بندہ ہو اور آنکھ نہ ہو تو کتنا عجیب لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہو اور اللہ کی آنکھ نہ ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟! یہ بات اس کی عقل میں آ ہی نہیں سکتی، اس کی عقل ہی اتنی ہے اس لیے اس دیہاتی بندے کو کافر نہیں کہنا۔

اس لیے جس میں عقل کم ہو اس کے ساتھ نرمی اور شفقت کا معاملہ کیا جاتا ہے، اس کو مارا اور ڈانٹا نہیں جاتا۔

سارے اختیارات کا مالک اللہ ہے:

﴿قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ يُجِيْرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾﴾

پھر اللہ پاک نے فرمایا کہ اے پیغمبر! آپ ان سے پوچھیں کہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے یہ کس کا ہے؟ یہ لوگ کہیں گے کہ اللہ کا ہے۔ آپ ان سے فرمائیں کہ کیا پھر بھی تم اس سے سبق نہیں لیتے، سمجھتے نہیں؟ پھر فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ سات آسمانوں اور عرشِ عظیم کا رب کون ہے؟ تو وہ کہیں گے کہ وہ بھی اللہ ہے۔ آپ ان سے فرمائیں کہ جب یہ مانتے ہو تو اللہ سے ڈرتے کیوں نہیں ہو؟ اگر ان سے پوچھیں کہ وہ کون ہے جس کے پاس سارے اختیارات ہیں؟ جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے

میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا! اگر تمہیں پتا ہے تو ذرا بتاؤ! تو کہیں گے کہ یہ سارے اختیارات اللہ کے پاس ہیں۔ تو ان سے کہو کہ پھر کہاں سے تم پر یہ جادو ہوا ہے کہ یہ سب چیزیں مانتے ہو لیکن اللہ کو نہیں مانتے! تو یہ ساری باتیں اللہ تعالیٰ نے دلائل کے طور پر بیان فرمائی ہیں۔

﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۹۱﴾﴾

نہ تو اللہ تعالیٰ کی کوئی اولاد ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی شریک ہے، کیونکہ اگر اللہ کے ساتھ کوئی خدا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا اور پھر وہ دونوں خدا ایک دوسرے سے لڑائی شروع کرتے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی بنائی ہوئی باتوں سے پاک ہے۔

اللہ کا کوئی شریک نہیں:

خدا کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اب دیکھیں کہ دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہیں کہ جو اللہ کو مانتے ہیں اور ساتھ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں بھی مانتے ہیں، کتنے ایسے ہیں کہ جو خدا کو مانتے ہیں اور ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بھی مانتے ہیں اور کتنے ہیں کہ جو اللہ کو مانتے ہیں اور ساتھ حضرت مریم کو اللہ کی بیوی مانتے ہیں، کوئی حضرت عزیر کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں۔ تو یہ جو پوری دنیا کا نظام چل رہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ایک ہے، کوئی اس کا شریک نہیں ہے، نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ اس کی کوئی بیوی ہے، وہ اکیلا اس نظام کو چلا رہا ہے۔

بڑھیا کا چرخا:

آپ کو شاید یاد ہو کہ میں نے آپ کو سنایا تھا کہ ایک بڑھیا جنگل میں چرخا

کات رہی تھی۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ تمہارا کیا عقیدہ ہے؟ اللہ کو مانتی ہو؟ کہا بیٹا مانتی ہوں۔ اس سے پوچھا کہ اللہ کو ماننے پر تمہارے پاس دلیل کیا ہے؟ اس نے کہا: دلیل یہ چرخا ہے۔ کہا کہ چرخے سے تمہیں کیسے سمجھ میں آیا کہ خدا ہے؟ کہا کہ مجھے یہ سمجھ میں آیا کہ میں چرخے کو چلاتی ہوں تو چلتا ہے اور جب چھوڑ دیتی ہوں تو رک جاتا ہے، اگر چرخے کو چلانے والی بوڑھی اماں نہ ہو تو چرخا نہیں چلتا۔ تو میں دیکھتی ہوں کہ اگر کوئی نکالنے والا نہ ہو تو سورج کیسے نکل سکتا ہے؟ برسانے والا نہ ہو تو بادل کیسے برس سکتا ہے؟ چلانے والا نہ ہو تو ہوائیں کیسے چل سکتی ہیں؟ اچھا یہ بتاؤ کہ اللہ کتنے ہیں؟ بڑھیا کہنے لگی کہ ایک ہے۔ اس کی دلیل کیا ہے؟ کہا کہ اس کی دلیل بھی یہی چرخا ہے۔

کہا کہ چرخے سے کیسے پتا چلا؟ اس نے کہا: میری ماں نے مجھے جہیز میں چرخا دیا تھا، میرے بال کالے تھے اور آج بالوں میں سفیدی آگئی ہے لیکن چرخا نہیں ٹوٹا، کیوں نہیں ٹوٹا اس لیے کہ اس کو چلانے والی میں ایک ہوں۔ اگر اس کو چلانے والی دو عورتیں ہوتیں، ایک وہاں بیٹھتی اور ایک یہاں بیٹھتی، ایک کہتے کہ چرخا یوں چلا دوسری کہتی کہ یوں چلا، ایک سیدھا چلاتی اور دوسری الٹا چلاتی تو چرخا کب سے ٹوٹ گیا ہوتا! ایک کہتی کہ یہ میرا ہے اور دوسری کہتی کہ میرا ہے، ایک نے کہنا تھا کہ میں نے چلانا ہے اور دوسری کہتی کہ میں نے چلانا ہے۔ تو اب تک چرخے کا نہ ٹوٹنا اس وجہ سے ہے کہ میں اکیلی مالک اور چلانے والی ہوں۔ تو سورج روزانہ وقت پر طلوع ہوتا ہے اور وقت پر غروب ہوتا ہے، یہ آسمان اور زمین، یہ دن رات کا نظام تباہ نہیں ہو رہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ چلانے والا ایک ہے۔

اب دیکھیں بات سمجھ میں آئی تو ایک چرخے سے بھی سمجھ میں آئی اور جن کو سمجھ میں نہیں آتی وہ سائنس پڑھ کر بھی گمراہ ہوتے ہیں، ٹیکنالوجی پڑھ کر بھی گمراہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سمجھ عطا فرمائیں۔ (آمین)

کفار و مشرکین کو عذاب کی وعید:

﴿قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿٩٣﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٩٤﴾﴾

اللہ تعالیٰ نے کئی آیات میں یہ فرمایا ہے کہ ہم کافروں اور مشرکوں کو عذاب دیں گے، جو لوگ آپ کی بات نہیں مانتے ان کو سزا دیں گے۔ اب یہ عذاب قیامت کے دن ہو گا یہ بات تو یقینی ہے لیکن اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اسی دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آئے اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے بعد آئے اور یہ ضابطہ ہے کہ جب کسی قوم پر عذاب آتا ہے تو صرف ظالموں پر نہیں آتا بلکہ ظالموں کے ساتھ ساتھ نیک لوگوں پر بھی آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نیک لوگوں پر عذاب آتا تو ہے لیکن آخرت میں ان کو کوئی عذاب نہیں ہو گا اور دنیا میں جو تکلیف اور پریشانی ان کو ملی ہے اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کا اجر دیں گے۔ تو جب یہ بات ممکن تھی کہ حضور علیہ السلام کی زندگی میں ان مشرکین پر عذاب آتا تو اب حضور علیہ السلام کو تلقین کی جا رہی ہے کہ آپ اپنے رب سے یہ دعا مانگیں کہ اے اللہ! اگر آپ نے ان لوگوں کو میرے سامنے ہی عذاب دینا ہے تو مجھے اس سے محفوظ رکھنا اور ان لوگوں میں شامل نہ فرمانا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم عذاب سے بالکل محفوظ ہیں لیکن پھر بھی آپ کو یہ دعا سکھائی گئی تاکہ آپ ہر حال میں اپنے رب کو یاد رکھیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿٩٥﴾﴾

کہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ آپ کے سامنے ہی ان مشرکین پر عذاب نازل کر دیں۔

عذاب دو قسم کا ہوتا ہے؛ ایک ہے خاص عذاب جو مخصوص لوگوں پر آتا ہے اور ایک ہے عام عذاب جو سب لوگوں پر آتا ہے۔ اس امت میں خاص خاص لوگوں پر خاص خاص عذاب آتے رہے ہیں، -اللہ نہ کرے- شاید آئندہ بھی آجائے لیکن اس امت پر عمومی عذاب کہ جس سے امت کے سارے مجرم تباہ ہو جائیں، یہ نہ آیا ہے اور نہ آئے گا۔

دائرۂ نبوت:

اس کی وجہ قرآن کریم نے یہ بتائی ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ﴾[39]

میرے محبوب! آپ جب تک ان میں ہیں تو ہم ان کو عمومی عذاب دے کر ہلاک نہیں کریں گے۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں اور پوری کائنات کے نبی ہیں۔ یہ کیسے ثابت ہوا؟ وہ اس طرح کہ اللہ رب العزت کا ضابطہ ہے کہ اللہ جب کسی مجرم قوم کو عذاب دینے کا فیصلہ فرماتے ہیں تو جو نبی کا دائرہ نبوت ہوتا ہے اللہ نبی کو اس دائرے سے نکال لیتے ہیں اور مجرم قوم کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر جب عذاب آیا تو ان کو دائرۂ نبوت سے نکالا، جودی پہاڑ پر لے گئے اور قوم کو ہلاک کر دیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو مدین سے نکال کر ان کی قوم کو ہلاک کر دیا کیونکہ مدین ان کا دائرہ نبوت تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر جب عذاب آیا تو ان کی بستی سدوم ان کا دائرہ نبوت تھا، ان کو وہاں سے نکالا اور ان کی مجرم قوم کو ہلاک کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجرم قوم کو اللہ تعالیٰ ہلاک کیوں نہیں فرماتے؟ اس لیے کہ "وَاَنْتَ

39۔ الانفال 33:8

فِيْهِمْ" اس لیے کہ نبی ان میں موجود ہے۔ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ گئے پھر تو عذاب آ جانا چاہیے تھا؟ ہم کہتے ہیں کہ حضور اب بھی دنیا میں ہیں۔ اچھا! جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر چلے گئے پھر تو عذاب آ جانا چاہیے تھا؟ ہم کہتے ہیں کہ حضور اب بھی دنیا میں ہیں۔ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وفات آگئی اور آپ قبر میں چلے گئے، اب تو دنیا میں نہیں ہیں اب تو عذاب آ جانا چاہیے!

ہم کہتے ہیں کہ بات سمجھو! مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر اجتماعی عذاب کیوں نہیں آتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام عذاب تب آتا ہے جب نبی کا جو دائرۂ نبوت ہے اللہ اپنے نبی کو اس دائرہ نبوت سے نکال لیں، تو پھر مجرم قوم پر عذاب آتا ہے۔ ہمارے نبی کا دائرہ نبوت کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے نبی ہیں، مدینہ کے نبی ہیں، طائف کے نبی ہیں، تبوک کے نبی ہیں، فرش کے نبی ہیں، عرش کے نبی ہیں، اِس جہان کے نبی ہیں، اُس جہان کے نبی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دائرۂ نبوت اتنا وسیع ہے کہ نہ آپ نے دائرہ نبوت سے باہر جانا ہے اور نہ ہی مجرم قوم پر عمومی عذاب آنا ہے۔ تو عام عذاب نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت میں موجود ہیں۔

شیطان سے حفاظت کی دعا:

﴿وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ ﴿۹۷﴾﴾

اب دیکھو! اللہ کے نبی کو حکم ہے کہ آپ یہ دعا مانگا کریں کہ اے اللہ! شیطان کی چھیڑ چھاڑ سے مَیں آپ کی پناہ میں آتا ہوں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں لکھا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ فرماتے ہیں کہ یہ اس لیے کہ جب ان پر اللہ عذاب نہیں بھیج رہے اور یہ آپ کو

تکلیف دیتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ شیطان آپ کے دل میں ڈال دے کہ آپ بھی ان کو تکلیف دیں۔ اس لیے فرمایا کہ آپ دعا مانگیں کہ اے اللہ! شیطان کے ان وسوسوں سے مجھے بچا کر رکھنا، شیطان کی اس چھیڑ چھاڑ سے بچا کر رکھنا۔

کوئی شخص بغیر کسی وجہ کے آپ کو گالی دیتا ہے تو دل میں آتا ہے کہ میں بھی اس کو گالی دوں۔ یہ جو دل میں آتا ہے کہ میں بھی گالی دوں تو یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ یہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے کہ تم بھی اس کو گالی دو۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اس موقع پر یہ آیات پڑھا کرو:

﴿وَ قُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ ۝۹۷ وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ ۝۹۸﴾

یہ دعا پڑھیں گے تو اللہ پاک محفوظ فرما لیں گے۔ گالی کا جواب گالی نہیں ہوتا۔ اللہ ہم سب کو محفوظ فرمائیں۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو رات کو نیند نہیں آتی تھی تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے رات کو نیند نہیں آتی، میں کیا کروں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم یہ دعا پڑھ لیا کرو:

أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّةِ مِنْ غَضَبِهٖ وَعِقَابِهٖ وَشَرِّ عِبَادِهٖ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَأَنْ يَحْضُرُوْنِ.[40]

میں اللہ کے بے عیب کلمات کی برکت سے اللہ کی ناراضگی، اللہ کے عذاب اور اس کے بندوں کے شر اور شیطان کی چھیڑ چھاڑ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اور اس بات سے بھی اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ شیاطین مجھ پر تسلط کریں اور میرے پاس آئیں۔

40۔ مؤطا امام مالک، رقم:3499

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے دعا مانگی تو سکون کی نیند سوتے تھے۔

اس سے ایک مسئلہ یہ ثابت ہوا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اللہ کے نبی! مجھے نیند نہیں آتی تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا بتائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر اللہ کے کسی نیک بندے کے پاس جائیں کہ میرے سر میں درد ہے، میرے پیٹ میں درد ہے، میرے بیٹے کو تکلیف ہے اور وہ کہے کہ یہ دعا پڑھ لو تو اس دعا اور ورد کا پڑھنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہو گیا کہ یہ جائز ہے۔ یہ نہیں کہنا کہ غلط اور بالکل ناجائز ہے، ایسے فتوے جلدی نہ لگایا کرو۔

انسانی فطرت:

﴿حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا﴾

فرمایا کہ اے میرے پیغمبر! ابھی تو یہ بات نہیں مانتے ہیں لیکن ایک وقت آئے گا جب ان کو موت کے آثار نظر آئیں گے اور آخرت کی منزلیں نظر آنے لگیں گی تو یہ کہیں گے اے رب! مجھے واپس لوٹا دیں، میں دنیا میں جو دین کے کام نہیں کر سکا اب جا کر کروں گا، فلاں گناہ کیا تھا لیکن اب واپس جا کر نہیں کروں گا، فلاں نیک عمل نہیں کیا تھا اب جا کر کروں گا۔ فرمایا اے پیغمبر! ﴿كَلَّا﴾ ہرگز نہیں، اگر ہم ان کو بھیج بھی دیں تو یہ پھر بھی نہیں کریں گے، ﴿اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا﴾ بس یہ ان لوگوں کی زبان سے کہنے کی باتیں ہیں، یہ واپس جا کر بھی یہ کام نہیں کریں گے۔

جیسے خدانخواستہ کسی کا ایکسیڈنٹ ہونے والا ہو، کوئی حادثہ پیش ہونے والا ہو تو کہتے ہیں کہ اللہ ایک بار بچا لے، بس ایک بار بچا لے، ایک بار خیریت سے گھر پہنچ جائیں تو اب گناہ نہیں کریں گے، جب گھر پہنچ جاتے ہیں تو پھر شروع ہو جاتے ہیں، پھر

باز نہیں آتے۔ تو فرمایا ان کی فطرت ہے کہ یہ باز نہیں آئیں گے۔

عالمِ برزخ:

﴿وَمِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾﴾

اے میرے پیغمبر! اب ان کے پیچھے ایک پردہ ہے اور قیامت تک کے لیے ہے۔

یہاں چند ایک باتیں سمجھیں تاکہ آپ کو قبر، حیات، نبوت اور صلوٰۃ وسلام یہ سارے مسائل سمجھ میں آئیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ عالم چار ہیں:

1: عالم ارواح

2: عالم دنیا

3: عالم برزخ

4: عالم آخرت

عالم ارواح یہ انتظار کی جگہ ہے اور عالم دنیا یہ کام کی جگہ ہے اور عالم برزخ یہ آرام کی جگہ ہے اور عالم آخرت یہ انعام کی جگہ ہے۔

کل رات ہمارے مرکز اھل السنۃ والجماعۃ میں خانقاہی اجتماع ہے۔ ترغیب تو میں بہت دیتا ہوں کہ آپ ہمارے خانقاہی اجتماع میں آیا کریں، بیان میں شرکت کیا کریں، مجلسِ ذکر میں بیٹھا کریں تو وہاں پر آدمی کھل کے بات کرتا ہے، تفصیل سے بات ہوتی ہے، لوگ بھی زیادہ ہوتے ہیں، لوگ دور دور سے سننے کے لیے آتے ہیں اور جب طلب ہوتی ہے تو پھر مضمون نکلتا ہے، جب طلب نہ ہو تو مضمون نہیں نکلتا۔ بچے میں طلب ہو اور روئے تو ماں کی چھاتی میں دودھ اتر آتا ہے اور جب عوام میں طلب ہو تو عالم کی زبان سے علم نکلتا ہے، جب طلب نہیں ہوتی تو کوشش کرنے کے باوجود بھی بیان کھل کر نہیں ہو پاتا۔ یہ اللہ کا عجیب نظام ہے۔

خیر میں عرض کر رہا تھا کہ عالمِ ارواح انتظار کی جگہ ہے، عالمِ دنیا یہ کام کی جگہ ہے، عالمِ برزخ یہ آرام کی جگہ ہے اور عالمِ آخرت یہ انعام کی جگہ ہے۔ دنیا میں کام کرنا ہے آرام نہیں کرنا، ہاں اتنا آرام کریں جس سے کام کے لیے تیار ہو جائیں اور بس، باقی آرام قبر میں ہو گا اور دنیا میں اعمال کی جزا نہ مانگیں، اعمال کی جزا کی جگہ آخرت ہے۔

برزخ کے بارے میں دوسری بات سمجھیں! برزخ کا معنی ہے "پردہ" آپ والدہ کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں دوا لینا چاہتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر مرد ہے اور والدہ نے پردہ کیا ہوا ہے تو والدہ کا پردہ آگے ہوتا ہے یا پیچھے؟ (آگے۔ سامعین) اور یہاں پر ہے ﴿مِنۡ وَّرَآئِهِمۡ﴾ کہ ان کے پیچھے پردہ ہو گا۔ تو دنیا میں پردہ آگے ہوتا ہے اور جب انسان مر جائے تو اس کا پردہ پیچھے ہوتا ہے۔ تو والدہ پردے میں ہے ڈاکٹر تو پردے میں نہیں ہے۔ اب جو پردے میں ہے وہ باہر والے کو دیکھ لے تو یہ پردے کے خلاف نہیں ہے اور باہر والا اگر پردے میں دیکھ لے تو یہ پردے کے خلاف ہے۔

اس سے پتا چلا کہ پردے کے باہر سے پردے میں والے کے حالات معلوم نہیں ہوتے، ہاں پردے میں والے کو پردے کے باہر والے کے حالات کا پتا چل جاتا ہے۔ تو جب کوئی شخص فوت ہو جاتا ہے تو یہ میت پردے میں ہے یا ہم پردے میں ہیں؟ یہ میت پردے میں ہے، ہم پردے میں نہیں ہیں۔ اس کا معنی یہ کہ اگر ہم میت کی قبر پر جائیں اور میت کو دیکھ لیں تو یہ پردے کے خلاف ہے اور اگر میت ہم کو دیکھ لے تو یہ پردے کے خلاف نہیں ہے۔

امی عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ اقدس میں پردہ:

ایک بندہ کہتا ہے کہ امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ میت پردے میں ہوتی ہے تو پردے والا باہر والے کو کیسے پہچان سکتا ہے؟ میں نے کہا: یہ روایت قرآن کے خلاف کیسے ہے؟ قرآن تو کہتا ہے کہ

میت پردے میں ہے تو جو پردے میں ہو وہ پردے سے باہر والے کو دیکھ لے تو پردے کے خلاف نہیں ہے، پردے کے مطابق ہے۔

مستدرک الحاکم میں روایت موجود ہے، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے کمرے میں دفن کر دیا گیا تو میں جاتی تھی اور پردے کا اہتمام نہیں کرتی تھی۔ پھر میرے والد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دفن کیا گیا میں پھر بھی جاتی تھی اور پردے کا اہتمام نہیں کرتی تھی، کیونکہ ایک میرا والد ہے اور ایک میرا شوہر ہے، دونوں سے پردہ نہیں ہے۔ "فَلَمَّا دُفِنَ عُمَرُ مَعَهُمْ" جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ دفن کر دیا گیا، فرماتی ہیں "فَوَاللهِ مَا دَخَلْتُ إِلَّا وَأَنَا مَشْدُوْدَةٌ عَلَيَّ ثِيَابِيْ" پھر خدا کی قسم! میں اس وقت تک نہیں جاتی تھی جب تک میں اچھی طرح پردہ نہ کر لیتی تھی۔ اس کی وجہ خود بیان کرتی ہیں کہ "حَيَاءً مِنْ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ" کیونکہ مجھے عمر رضی اللہ عنہ سے حیا آتی تھی۔ [41]

اب لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیسے دیکھ رہے تھے وہ تو برزخ میں تھے؟ بھائی! حضرت عمر رضی اللہ عنہ پردے میں تھے یا امی عائشہ رضی اللہ عنہا پردے میں تھیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پردے میں تھے۔ اگر پردے میں والا پردے کے باہر دیکھ لے تو یہ پردے کے خلاف نہیں ہے۔ جب عمر رضی اللہ عنہ روضہ میں دفن ہوئے تو امی عائشہ رضی اللہ عنہا نے پردہ کر لیا۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہیں دیکھ سکتے تھے تو امی عائشہ رضی اللہ عنہا نے پردہ کیوں کیا؟ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ جب قرآن سمجھ میں آجائے تو پھر بات بنے گی۔

41۔ المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ج3 ص609 رقم الحدیث 4458

ہر حدیث کو قرآن کے خلاف کہہ کر رد نہ کرو، اللہ کے پیغمبر پر اترنے والا قرآن بھی مانو اور اللہ کے رسول کے ارشادات بھی مانو۔ میں پوری دنیا میں یہ محنت کر رہا ہوں کہ قرآن بھی مانو اور حدیث بھی مانو، حدیث کو رد نہ کیا کرو کہ یہ قرآن کے خلاف ہے بلکہ سمجھنے والے سے سمجھ لیا کرو۔ ہماری سمجھ کم ہے اور امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی سمجھ بہت زیادہ ہے۔ حکیم الاسلام قاری محمد طیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک صحابی کو نبوت کی صحبت کی برکت سے خدا اتنی عقل عطا فرماتا ہے کہ اگر صحابی کی عقل کی زکوٰۃ تقسیم کی جائے تو قیامت تک کے لیے کوئی انسان پاگل نہیں رہے گا اور یہ تو عام صحابی نہیں بلکہ ام المومنین امی عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی فہم کو دیکھو! اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ تو میں نے برزخ کے حوالے سے یہ مختصر سی بات کی ہے۔

خاندانِ نبوت کی نسبت کی اہمیت:

﴿فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَلَاۤ اَنۡسَابَ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَئِذٍ وَّ لَا یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾﴾

قیامت کے دن دو مرتبہ صور پھونکا جائے گا؛ پہلی مرتبہ اسرافیل علیہ السلام جب صور پھونکیں گے تو سارے لوگ مر جائیں گے، پھر جب دوبارہ پھونکیں گے تو مرے ہوئے لوگ زندہ ہو جائیں گے۔ قیامت کے دن اعمال کام آئیں گے، نسب کام نہیں آئے گا کہ یہ فلاں کا بیٹا ہے، فلاں کا باپ ہے، فلاں کا چچا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"كُلُّ نَسَبٍ وَصِهْرٍ مُنْقَطِعٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَّا نَسَبِيْ وَصِهْرِيْ." [42]

قیامت کے دن کسی کا نسب کام نہیں آئے گا، اس دن صرف میرا نسب اور

42۔ المعجم الاوسط للطبرانی: ج3 ص145 رقم الحدیث 4132

دامادی تعلق ہی کام آئے گا۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی آیت کے تحت یہاں لکھا ہے کہ "اسی حدیث کو سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ام کلثوم بنت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما سے نکاح کیا اور چالیس ہزار درہم مہر باندھا۔"[43]

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کا داماد بن جاؤں تاکہ قیامت کے دن اس خاندانِ نبوت کی نسبت کام آجائے۔ اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی حضرت ام کلثوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دی۔

قیامت کے دن وزنِ اعمال:

﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٢﴾ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٣﴾﴾

اللہ رب العزت نے قیامت کے حوالے سے بات فرمائی ہے کہ قیامت والے دن جس بندے کا نیک عمل والا پلڑا بھاری ہو گا تو وہی کامیاب ہو گا اور اگر نیک اعمال والا پلڑا ہلکا ہو گیا تو اب خسارا اور نقصان ہو گا، ایسا بندہ جہنمی ہے۔ دعا کریں کہ اللہ ہمارے نیک اعمال والا پلڑا وزنی فرمادیں۔

یہاں جو بات کی جارہی ہے یہ کفر اور ایمان کی ہے کہ ایک بندہ کافر ہے اور ایک مؤمن ہے، کافر کا میزان ہلکا ہو گا اور مؤمن کا میزان بھاری ہو گا۔ قیامت کے دن وزن کس چیز کا کیا جائے گا اس بارے میں کئی قسم کی روایات ملتی ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ خود انسان مؤمن و کافر کو تولا جائے گا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے نامہ اعمال کو تولا جائے گا اور بعض روایات میں ہے کہ انسان کے اعمال کو تولا

43۔ تفسیر عثمانی: ج2 ص169

جائے گا۔ تینوں قسم کی روایات موجود ہیں۔ دعا کریں کہ قیامت کے دن اللہ ہم سب کا ایمان والا پلڑا بھاری فرمادیں۔

میں آج اسی مقام پر دو حدیثیں پڑھ رہا تھا۔ جمعہ کے بعد میں گھر میں تھا اور گھر والے پاس بیٹھے تھے۔ جب میں نے ان روایتوں کو پڑھا تو بہت خوش ہوا۔ گھر والے مجھے کہتے ہیں کہ کیا ہوا؟ میں نے کہا کہ ڈر تو بہت لگتا ہے کیونکہ اعمال بہت کمزور ہیں اور بہت تھوڑے ہیں، کبھی کبھی ایسی احادیث سامنے آتی ہیں تو پھر ہمت بڑھ جاتی ہے۔ اب یہاں اس مقام پر مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز شہیدوں کا خون اور علماء کی روشنائی جس سے انہوں نے علم دین کی کتابیں لکھی تھیں باہم تولے جائیں گے تو علماء کی روشنائی کا وزن شہیدوں کے خون سے زیادہ نکلے گا۔" [44]

اب بندے کو تسلی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں کتاب ہے شمائل ترمذی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں شمائل ترمذی سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے، اس کتاب میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، تیل، سرمہ، آپ کے کپڑے، نعلین، ہنسا وغیرہ یہ پوری زندگی جمع کی ہے۔

زبدۃ الشمائل شرح شمائل ترمذی:

میں نے سن 2000 میں اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کی شرح لکھی "زبدۃ الشمائل" کے نام سے اور یہ کتاب میں نے تیرہ دنوں میں لکھی ہے۔ آپ پڑھیں گے تو آپ کو اندازہ ہو گا۔ جب میں نے کتاب علماء کو پیش کی تو مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر دامت فیوضہم مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

44۔ معارف القرآن: ج6 ص337

نے اس پر تقریظ لکھی اور جب میں نے یہ کتاب دار العلوم دیوبند میں بھیجی تو شیخ الحدیث حضرت مولانا سعید احمد پالنپوری حفظہ اللہ نے بھی اس پر تقریظ لکھی۔ حضرت مولانا محمد اکرم طوفانی صاحب دامت برکاتہم نے بھی اس پر تقریظ لکھی ہے۔ بابا جی سے ہمیں پیار ہے، آپ کو اختلاف ہو تو میں کچھ نہیں کہتا، مجھے پیار ہے اور میری عادت ہے کہ جو بندہ کام کرے میں اس کے پاؤں چومتا ہوں، اس بوڑھے آدمی نے بہت کام کیا ہے، سرگودھا والوں پر اتنے احسانات ہیں کہ مرتے دم تک ان کے احسانات کو نہیں اتار سکتے۔ مجھے تعجب ہے ان بندوں پر جو بابا جی کی بعض باتوں پر ناراض ہو جاتے ہیں، آدمی جب زندگی بھر کام کرے اور اس کی آخری عمر ہو تو اب اس سے ناراض نہیں بلکہ خوش ہونا چاہیے۔ طوفانی صاحب اَسی سال کی عمر کے بوڑھے آدمی ہیں، انہوں نے خاتم النبیین ہسپتال بنا کر آپ پر احسان کیا ہے، آپ لوگ زندگی بھر اس کی قیمت نہیں چکا سکتے، یہ چھوٹی سی بات ہے کہ آپ کا سستا علاج بھی ہو رہا ہے اور ایمان بھی بچ رہا ہے اور مرزائیت کفر ہے آپ ان کے ہسپتال میں پیسے بھی دیتے تھے اور وہ ایمان بھی چھین لیتے تھے۔ الحمد للہ! آج لوگوں کا ایمان بچ گیا ہے، اللہ نے حجت کو تام کر دیا ہے، قیامت کے دن کوئی بندہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمانوں کے پاس دل کا ہسپتال نہیں تھا۔ اس لیے میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ بابا جی کی قدر کریں، میں نے اسپیشل ان سے تقریظ لی ہے اپنی اس کتاب پر۔ خانقاہ سراجیہ کے صاحبزادہ عزیز احمد صاحب سے بھی تقریظ لکھوائی ہے، آپ لوگ ذرا حضرت کے جملے پڑھیں حضرت نے لکھا ہے کہ "مولانا محمد الیاس گھمن زید مجدہ اہلسنت کا سرمایہ ہیں" آپ ذرا علماء کی تصدیقات کو پڑھیں کہ علماء نے کیا کیا لکھا ہے۔

خیر میں کہہ رہا تھا کہ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ حدیث پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور دوسری حدیث حضرت مفتی شفیع صاحب نے یہ نقل کی ہے

کہ قیامت کے دن ایک شخص کے اعمال تولے جائیں گے تو وہ کچھ کم ہوں گے جس سے اس کے اعمال کا پلڑا ہلکا رہ جائے گا، پھر ایک ایسی چیز لائی جائے گی جو بادل کی طرح ہو گی۔ جب اسے اس بندے کے نیکیوں والے پلڑے میں رکھا جائے گا تو وہ پلڑا بہت بھاری ہو جائے گا۔ وہ شخص پوچھے گا یا اللہ! یہ کیا چیز ہے؟ اللہ فرمائیں گے کہ یہ تیرا علم ہے جو تو لوگوں کو سکھاتا تھا۔ (سبحان اللہ۔ سامعین) میں یہ حدیث پڑھ کر بہت خوش ہوا، یقین کریں کہ میں بہت کمزور ہوں لیکن بعض حدیثیں ایسی آجاتی ہیں کہ دل خوش ہو جاتا ہے اور کچھ امیدیں ہمیں بھی لگ جاتی ہے۔ اللہ ہمیں نجات کا راستہ عطا فرمائیں، اللہ ہمیں قدر کی توفیق عطا فرمائیں۔

علماء کی قدر کیجیے!

اس لیے میں علماء کے خلاف باتیں کرنے سے منع کرتا ہوں، عالم کمزور بھی ہو تو انسان ہے، کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں لیکن علماء کے خلاف بات نہ کیا کرو، عالم عالم ہی ہوتا ہے، نبی کا وارث یہی ہوتا ہے، جیسا بھی ہو یہی پیغمبر کا وارث ہے۔ اس لیے علماء کی قدر کیا کرو! اب دیکھو! فوت ہونے والا باپ آنکھوں کا اسپیشلسٹ ڈاکٹر ہے اور اس کا بیٹا نابینا ہے، اگر باپ فوت ہو جائے تو اس کا وارث کون ہو گا؟ بیٹا ہو گا۔ کوئی کہے کہ اس کا بیٹا تو نابینا ہے لہذا کوئی ڈاکٹر تلاش کرو جس کو اس کا وارث بنائیں تو سب کہیں گے کہ وارث یہی بیٹا ہو گا اگرچہ نابینا ہے۔ باپ پہلوان ہے اور بیٹا پاؤں سے لنگڑا ہے، اب باپ فوت ہو گیا تو وارث اسی لنگڑے بیٹے نے ہی بننا ہے، یہ نہیں کہ کوئی پہلوان تلاش کرو جو اس کا وارث بنے۔ عالم ہی نبی کا وارث ہے چاہے جیسا بھی ہو، آپ چوبیس گھنٹے عبادت کریں رات کو تہجد پڑھیں روزانہ قرآن ختم کریں لیکن آپ کو کوئی نہیں کہے گا کہ آپ نبی کے وارث ہیں، کیونکہ آپ مولانا صاحب نہیں ہیں جبکہ وارث عالم ہی بنتا ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ علماء کے خلاف کبھی بات نہ کیا کرو، کچھ کوتاہی ہو تو

برداشت کرو یہ سوچ کر کہ یہ نبی کا وارث ہے، اس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں علماء سے محبت اور قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جس بکری کا دودھ تم پیتے ہو اس بکری کی مینگنی بھی تم نے اٹھانی ہے، یہ نہیں کہ دودھ تم پیو اور مینگنیاں ہمسایہ اٹھائے۔ اسی طرح جس عالم کے علم سے نفع آپ اٹھاتے ہو اگر اس میں کچھ کمزوریاں ہیں تو برداشت بھی آپ نے کرنی ہیں، یہ تو نہیں کہ علمی نفع آپ اٹھائیں اور کمزوریاں مخالف برداشت کرے، یہ کیسے ہو سکتا ہے!

جہنمیوں کی آہ کہ ہمیں یہاں سے نکالیں!

﴿تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا كٰلِحُونَ ﴿١٠٤﴾ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿١٠٥﴾ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿١٠٦﴾ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿١٠٧﴾ قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿١٠٨﴾﴾

قیامت کا دن ہو گا، کافر جہنم میں ہوں گے، ان کے چہرے جھلس رہے ہوں گے اور وہاں وہ اللہ کو پکار رہے ہوں گے کہ اے اللہ! ہمیں یہاں سے نکال دیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی تھیں اور تمہیں ڈرایا جاتا تھا لیکن تم ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے۔ وہ کہیں گے کہ یا اللہ! ہماری بدبختی ہم پر غالب آگئی ہم گمراہ ہوگئے، اللہ! ہمیں یہاں سے نکال دیں اب ہم نافرمانی نہیں کریں گے۔ اللہ فرمائیں گے:

﴿اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ﴾ کہ ذلیل ہو کر یہیں جہنم میں پڑے رہو اب تم نے ہم سے بات نہیں کرنی۔ پھر یہ اہل جہنم کسی سے بات نہ کر سکیں گے۔

نیکوکار لوگوں کا بدلہ:

﴿اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَ
ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿١٠٩﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ
ذِكْرِيْ وَ كُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿١١٠﴾ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا ۙ اَنَّهُمْ
هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿١١١﴾﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے نیک بندوں کی ایک جماعت دنیا میں یہ دعا مانگا کرتی تھی: "فَاغْفِرْ لَنَا" اللہ! ہم سے گناہ ہوئے ہیں تو ہمیں معاف فرما، "وَارْحَمْنَا" اور ہم پر رحم فرما، اے اللہ! تو بہترین رحم کرنے والا ہے۔ اللہ جہنمیوں سے فرمائیں گے کہ تم میرے ان نیک بندوں کا مذاق اڑاتے تھے، ان کے ساتھ ٹھٹھا اور مذاق کی وجہ سے تم میری یاد سے بھی غافل رہے، آج میں نے ان کے صبر کے بدلے میں انہیں جنت عطا کی ہے، آپ وہ کامیاب و کامران ہیں۔

﴿قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿١١٢﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ
فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿١١٣﴾ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿١١٤﴾﴾

پھر اللہ ان جہنمیوں سے پوچھیں گے کہ بتاؤ تم کتنا عرصہ دنیا میں رہے ہو؟ یہ لوگ کہیں گے کہ دن یا دن کا کچھ حصہ ہم زمین میں ٹھہرے ہیں، ہمیں صحیح یاد نہیں یا اللہ! آپ ان لوگوں سے پوچھیے جنھوں نے گنتی کی ہے! اللہ فرمائیں گے کہ تم تھوڑی مدت سے زیادہ نہیں رہے ہو۔

منکرین حیات الانبیاء کے ایک شبہ کا جواب:

یہاں ایک مسئلہ ذہن میں رکھیں۔ حضرت عزیر علیہ السلام ایک بستی سے گزرے۔ وہ بستی تباہ شدہ تھی۔ حضرت عزیر نے اللہ سے سوال کیا:

﴿اَنّٰی یُحۡیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعۡدَ مَوۡتِهَا﴾[45]

اللہ! آپ اس بستی کو کیسے زندہ کریں گے؟ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک سو سال تک موت دے دی۔ سو سال کے بعد اٹھایا اور فرمایا: ﴿کَمۡ لَبِثۡتَ﴾ آپ کتنا عرصہ اس حالت میں رہے ہو؟ حضرت عزیر علیہ السلام نے کہا کہ ﴿لَبِثۡتُ یَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ یَوۡمٍ﴾ اے اللہ! میں ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ اس حالت میں رہا۔

جو لوگ پیغمبر کی قبر والی حیات کا انکار کرتے ہیں وہ قرآن کی اس آیت کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ نے سو سال موت دی، پھر اللہ نے ان کو زندہ کیا، پھر پوچھا: ﴿کَمۡ لَبِثۡتَ﴾ کتنا عرصہ ٹھہرے ہو؟ حضرت عزیر نے کہا: ﴿لَبِثۡتُ یَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ یَوۡمٍ﴾ کہ اللہ! ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ، تو اس سے پتا چلا کہ نبی قبر میں زندہ نہیں ہوتا، اگر زندہ ہوتا تو ان کو پتا ہوتا کہ میں کتنی مدت ٹھہرا ہوں۔

اس دلیل کا جواب یاد رکھ لیں کہ اللہ جب کفار سے قیامت کے دن پوچھیں گے کہ ﴿کَمۡ لَبِثۡتُمۡ فِی الۡاَرۡضِ﴾ تم دنیا میں کتنا عرصہ ٹھہرے رہے؟ تو کافر کہیں گے: ﴿لَبِثۡنَا یَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ یَوۡمٍ﴾ کہ ہم ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ زمین میں رہے، اب بتاؤ کہ کافر دنیا میں زندہ تھے تو ان کو پتا کیوں نہیں ہے؟ اگر پتا نہ ہونا موت کی دلیل ہے تو پھر دنیا میں سارے کافر مرے ہوئے ہیں کیونکہ ان کو قیامت کے دن یہ پتا نہیں چلے گا کہ دنیا میں کتنے دن ٹھہرے تھے۔

میں کسی بندے سے پوچھوں کہ بیان شروع ہوئے کو کتنے منٹ ہوئے ہیں؟

45۔ البقرۃ2:259

تو آپ منٹ کو گن کر نہیں بتا سکتے جب تک کہ آپ گھڑی نہیں دیکھیں گے، تو کیا آپ مرے ہوئے ہیں؟ بھائی! پتا نہ چلنا یہ موت کی دلیل کیسے ہو سکتی ہے؟ دیکھو! اصحاب کہف غار میں گئے اور تین سو نو سال تک سوتے رہے اور جب اٹھے تو پوچھا کہ کتنا عرصہ ٹھہرے؟ کہا کہ ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ۔ اب وہ سوئے ہوئے تھے یا مرے ہوئے تھے؟ (سوئے ہوئے تھے۔ سامعین) تو کیا پتا نہ چلنا دلیل ہے کہ وہ زندہ نہیں تھے؟

اور ان منکرین حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ ہم قرآن بیان کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن پڑھ کر عقیدہ غلط بتاتے ہیں۔ اللہ پاک ہمیں ایسے کام سے محفوظ رکھے۔

انسان بے کار پیدا نہیں کیا گیا:

﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ کیا تمہارا خیال یہ تھا کہ ہم نے تمہیں یونہی فضول پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہمارے پاس نہیں آؤ گے؟ اللہ رب العزت اونچی شان کا مالک ہے، حقیقی بادشاہ ہے، اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، اللہ عزت والے عرش کا مالک ہے۔ جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہراتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، ان کا حساب تو اللہ کے ذمہ ہے، قیامت کو کافر کامیاب نہیں ہوں گے۔

پیغمبر پاک کو دعا کی ترغیب:

﴿وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾﴾

آخر میں فرمایا کہ اے میرے پیغمبر! آپ یہ دعا مانگا کریں: ﴿رَّبِّ اغْفِرْ وَ

وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ یہ دعا آپ لوگ یاد کریں۔ یہ قرآنی دعا ہے۔ آپ کو یاد نہیں ہے تو ایک مرتبہ میرے ساتھ پڑھ لیں:

﴿رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ﴾

امراض سے بچاؤ کا دم:

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا گزر ایک بندے پر ہوا جو کئی امراض میں مبتلا تھا۔ آپ نے سورۃ المومنون کی آخری آیات ﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا﴾ سے آخر تک اس کے کان میں پڑھ دیں وہ بالکل ٹھیک ہو گیا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عبداللہ! تو نے اس کے کان میں کیا پڑھا؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضور! میں نے یہ آخری آیتیں پڑھی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: اگر کوئی مؤمن مکمل یقین کے ساتھ یہ آیتیں پڑھے تو پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے۔

اس لیے سورۃ المؤمنون کی آخری چار آیات ﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا﴾ سے لے کر ﴿وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ تک یاد رکھ لیں، زبانی یاد نہیں ہوتیں تو قرآن کھول کر پڑھ لیا کریں، اگر گھر میں کوئی بیمار ہے تو یہ چار آیتیں اس کے کان میں دم کر دیا کریں، اگر سر درد ہے یا کوئی اور تکلیف ہے تو ان کو پڑھ لیا کریں، میں ان کے پڑھنے کی اجازت دیتا ہوں۔

کئی لوگ کہتے ہیں کہ جی ہمیں وظیفے کی اجازت دیں۔ ہماری اجازت بڑی کھلی ہوتی ہے تاکہ نفع عام ہو، ہم اس کو روک روک کر نہیں رکھتے، ہماری ساری چیزیں نیٹ پر موجود ہوتی ہیں، بغیر پیسے کے کلک کریں تو ہمارا سارا مال باہر آجاتا ہے۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

سورت کی ابتدا اور انتہا کا ربط:

جب اس سورت کا آغاز ہوا تو فرمایا کہ ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ﴾ کہ ایمان والے کامیاب ہیں اور جب سورت ختم ہو رہی ہے تو فرمایا: ﴿اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الۡكٰفِرُوۡنَ﴾ کہ کافر ناکام ہو گیا۔ پتا چلا کہ کامیابی و کامرانی یہ صرف ایمان والوں کا حصہ ہے، کافر لوگ اس سے محروم ہیں۔ اللہ ہمیں ایمان پر ثابت قدم رکھے۔ (آمین)

زبدۃ الشمائل اور نماز اھل السنۃ والجماعۃ کی اہمیت:

میں نے کئی مرتبہ عرض کیا ہے کہ میری کچھ کتابیں ایسی ہیں جو ہر کسی کے لیے مفید ہوتی ہیں تو میری یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہر بندے کے پاس ہوں جیسے نماز اھل السنۃ والجماعۃ یہ ہر گھر میں ہو اور ہر مسجد میں ہو، اس میں ہماری نماز پر پورے دلائل موجود ہیں، ایک کتاب زبدۃ الشمائل ہے یہ بھی ہر گھر میں ہو اور میں نے یہ کتاب چھپنے کے بعد سب سے پہلے اپنے گھر والوں کو ہدیہ کی ہے۔ آپ اس کو ایک بار پڑھ لو اور میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اگر ممکن ہو تو آپ اپنے گھر میں گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر اس کی تھوڑی سی تعلیم کراؤ۔ میں نے تین دن پہلے گھر والوں سے کہا کہ سرمہ لاؤ۔ وہ مجھے سرمہ لگانے لگیں تو میں نے کہا کہ پہلے زبدۃ الشمائل میں دیکھو کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سرمہ کیسے لگاتے تھے اور کون سا سرمہ لگاتے تھے اور کب لگاتے تھے؟ یہ پڑھو اور پھر لگاؤ۔ سرمہ تو لگانا ہوتا ہے، تیل لگانا ہوتا ہے، کنگھی استعمال کرنی ہوتی ہے، بستر بچھانا ہوتا ہے لیکن اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کو سامنے رکھ کر ہم یہ کام کریں تو کتنی برکت ہو گی کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ ساری سنتیں اس کتاب میں موجود ہیں اور یہ کتاب اتنی آسان ہے کہ عامی بندہ بھی جب پڑھے گا تو اس کو بھی سمجھ میں آ جائے گی اور جن حضرات نے اس کتاب پر

تقریظات لکھی ہیں تقریباً تمام علماء نے یہ بات لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا گھمن صاحب کو ایک فن دیا ہے کہ مشکل سے مشکل الفاظ کو آسان تعبیرات کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور انہوں نے اس کتاب میں اس فن کو خوب استعمال کیا ہے۔

تو ہماری خواہش ہے کہ آپ زبدۃ الشمائل اور نماز اھل السنۃ والجماعۃ کو خریدیں اور یہ الاتحاد ڈائری ہے جو ہر سال چھپتی ہے، جو حضرات ڈائریاں استعمال کرتے ہیں وہ اس کو بھی ساتھ رکھیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی زندگی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

سورۃ النور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿سُوۡرَۃٌ اَنۡزَلۡنٰہَا وَ فَرَضۡنٰہَا وَ اَنۡزَلۡنَا فِیۡہَاۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لَّعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۱﴾ اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیۡ فَاجۡلِدُوۡا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا مِائَۃَ جَلۡدَۃٍ ۪ وَّ لَا تَاۡخُذۡکُمۡ بِہِمَا رَاۡفَۃٌ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ۚ وَ لۡیَشۡہَدۡ عَذَابَہُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲﴾﴾

زنا؛ انسانی معاشرے کا ایک سنگین جرم

وہ اعمال جو شریعت میں نہایت ناپسندیدہ اور گھناؤنے جرم قرار دیے گئے ہیں ان میں ایک زنا بھی ہے۔ زنا کو شریعت میں نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام دو ایسے نبی ہیں کہ جن کے نکاح میں آنے والی بیوی کافرہ ہے لیکن وہ فاحشہ اور زانیہ نہیں تھیں کیونکہ زنا انسانی سوسائٹی میں بہت بڑا عیب ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو ایسے عیوب سے پاک رکھتے ہیں جو انسانی سوسائٹی میں جرم شمار ہوتے ہوں۔

ایک معاشرہ وہ ہوتا ہے جسے ہم اسلامی معاشرہ اور اسلامک سوسائٹی کہتے ہیں اور ایک ہوتا ہے صرف انسانی معاشرہ۔ انسانی سوسائٹی میں اور بحیثیت انسان کفر اختیار

کرنا معاشرے میں جرم شمار نہیں ہوتا لیکن بحیثیت انسان زنا کرنا یہ معاشرے میں عیب شمار ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ اپنے نبی کو ان عیوب سے محفوظ رکھتے ہیں۔ تو سورت نور کے پہلے رکوع میں اور پھر دوسرے رکوع میں بھی زنا کے متعلق کچھ احکام بیان فرمائے ہیں۔

زنا کے متعلق پہلا حکم:

سب سے متعلق پہلا حکم یہ ہے کہ زنا کرنے والے مرد یا عورت کو دیکھیں کہ کنوارہ ہے یا شادی شدہ ہے؟ کنوارے کو کہتے ہیں بکر، باکر، باکرہ اور شادی شدہ کو مُحْصَن، ثیب، ثیبہ کہتے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں نکاح کے عنوان میں اور زنا کی سزا کے عنوان میں محصن اور محصنہ ایسے مرد اور عورت کو کہتے ہیں جن میں یہ شرطیں ہوں:

1: آزاد ہو

2: عاقل ہو

3: بالغ ہو

4: نکاح کر کے ہمبستری کی ہو یا خلوتِ صحیحہ کی ہو۔ خلوتِ صحیحہ کا معنی یہ ہے کہ شوہر اور بیوی ایسے مکان میں ہوں کہ اگر وہ ہمبستری کرنا چاہیں تو کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

ان شرائط کے حامل کو شریعت کی اصطلاح میں محصن کہتے ہیں۔ محصن کا حکم اور ہے اور کنوارے کا حکم اور ہے۔ محصن کا حکم یہ ہے کہ اسے رجم اور سنگسار کر دیا جائے اور کنوارے کا حکم یہ ہے کہ اسے سو کوڑے لگائے جائیں۔

زنا کی سزا کے تدریجی احکامات:

زنا کی سزا کے احکامات تدریجاً نازل ہوئے ہیں۔ پہلے یہ آیت نازل ہوئی ہے:

﴿وَ الّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ فَاسۡتَشۡہِدُوۡا عَلَیۡہِنَّ

اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿١٥﴾ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ﴾[46]

کہ تمہاری عورتوں میں سے جب کوئی عورت زنا کا ارتکاب کرے تو اس پر چار گواہ بنالو، اگر یہ گواہ ان عورتوں کے خلاف گواہی دیں تو ان عورتوں کی سزا یہ ہے کہ ان کو گھر میں روک کر رکھو یہاں تک کہ ان کو موت آجائے یا اللہ ان کے لیے کوئی اور راستہ پیدا کر دے اور اس کے علاوہ قاضی اپنی صواب دید سے اگر کچھ تنبیہ کرنا چاہے تو کرے۔

اس پہلے حکم میں سزا یہ تھی کہ عورت کو گھر میں قید کیا جائے اور اس جرم کے مرتکب مرد وعورت کو قاضی یا امیر اپنی صوابدید کے مطابق کچھ سزا دے۔ اس کے بعد پھر سورۃ النور کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾

زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد کو سو سو کوڑے مارو!

جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورۃ النساء میں جو وعدہ کیا گیا تھا ﴿اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا﴾ کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی اور راستہ پیدا کر دے گا تو اللہ نے سورۃ النور میں وہ راستہ بتا دیا ہے یعنی زانی عورت اور زانی مرد کو سو سو کوڑوں کی سزا دی جائے۔ ساتھ ہی عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بات بھی فرما دی کہ اس آیت میں سو کوڑے مارنے کا جو ذکر ہے یہ غیر شادی شدہ مرد اور غیر شادی شدہ عورت کے ساتھ خاص ہے۔

پھر زنا کی سزا کا تیسرا درجہ وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان

46۔ النساء 4:15، 16

فرمایا کہ زانی مرد اور عورت اگر غیر شادی شدہ ہوں تو ان کی سزا سو سو کوڑے ہے اور شادی شدہ ہوں تو ان کی سزا فقط رجم اور سنگسار کرنا ہے۔

ثبوتِ زنا کی شرائط سخت ہیں:

زانی بندہ اگر شادی شدہ ہو تو شریعت نے اس کی سزا بہت سخت رکھی ہے کہ اس کو پتھروں کے ساتھ مار کر ہلاک کر دو اور شریعت نے زنا کے ثبوت کے لیے شرائط بھی بہت سخت رکھی ہیں کہ چار مرد ہوں جو مرد اور عورت کو زنا کرتا دیکھیں اور اس طرح دیکھیں کہ جیسے سلائی سرمہ دانی میں داخل ہے، صرف مرد کو عورت پر سوار نہ دیکھیں بلکہ گواہی دیں کہ عضو خاص عضو خاص میں ایسے داخل تھا جیسے سلائی سرمہ دانی میں داخل ہوتی ہے۔ چونکہ زنا کی سزا بہت سخت ہے اس لیے اس کے ثبوت کے لیے شرائط بھی بہت سخت اور کڑی رکھی گئی ہیں۔

زنا کے ثبوت کے طریقے:

اس لیے زنا جب بھی ثابت ہوتا ہے تو اس کے لیے تین طریقے ہیں:

1: چار مرد گواہ ہوں۔

2: زانی یا زانیہ خود اعتراف کرے کہ میں نے زنا کیا ہے۔

3: کنواری عورت کا حمل ظاہر ہو جائے۔ اب ظاہر ہے کہ اس سے فرار تو اختیار نہیں کر سکتی کہ حمل کس کا ہے؟ پھر وہ بتائے گی کہ یہ فلاں بندے کا ہے۔ اب وہ بندہ اقرار کرے گا تو اسے سزا ملے گی اور اگر اقرار نہیں کرے گا تو عورت کو سزا ملے گی اور مرد کو سزا نہیں ملے گی۔

کسی کے ذہن میں یہ سوال ضرور آ سکتا ہے کہ جب ثبوتِ زنا کے لیے اتنی سخت شرائط ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کے زنا کا معاملہ شریعت میں نرم ہے، اتنی شرائط لگانے سے نہ زنا ثابت ہو گا اور نہ سزا ہو گی، پھر اس سے تو زنا کے دروازے کھل جائیں

گے !تو یہ بات ذہن نشین فرمالیں کہ زنا کے ثابت ہونے کے بعد بہت سخت سزائیں ہیں لیکن اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ زنا کی اجازت مل گئی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کے بارے میں کہتا ہے کہ میں نے فلاں کو فلاں کے ساتھ زنا کرتے دیکھا ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ اپنے ساتھ تین گواہ مزید پیش کرو! اگر گواہ نہیں ہیں تو زنا ثابت نہیں ہو گا لیکن اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ کھلی چھٹی دی ہے۔ کوئی آدمی عدالت میں قاضی کو یہ کہے کہ میں نے فلاں مرد کو فلاں عورت کے ساتھ خلوت میں دیکھا ہے تو قاضی تعزیر لگائے گا۔ کوئی کہے کہ میں نے ان دونوں کو اکٹھے ننگے بدن کے ساتھ دیکھا ہے تو قاضی تعزیر لگائے گا۔ تو شریعت نے مرد اور عورت کو ملنے کی چھٹی نہیں دی! ہاں اگر زنا کرتے دیکھا ہے تو اس کی شرائط سخت ہیں لیکن وہ زنا کی شکایت نہ لگائے بلکہ وہ کہے کہ میں نے ان کو پیار کرتے دیکھا ہے، بوس و کنار کرتے دیکھا ہے، دونوں کو ننگی حالت میں لیٹے دیکھا ہے تو اب اس پر چار گواہ نہیں چاہییں بلکہ اب اس پر تو دو گواہ ہی کافی ہیں جیسے دوسرے معاملات میں دو گواہ کافی ہو جاتے ہیں۔ تو اتنی سخت سزا کا معنی یہ نہیں ہے کہ زنا کا دروازہ کھولا ہے، اتنی سخت سزا کا مطلب یہ ہے کہ زنا جرم بہت بڑا ہے۔ کسی بندے کے بارے میں یہ بات کہنا کہ اس نے بدکاری کی ہے تو یہ اس بندے کا معاشرہ میں ستیاناس کرنے والی بات ہے۔ تو شریعت یہ چاہتی ہے کہ عزت کی حفاظت ہو، یہ نہیں ہے کہ زنا کی اجازت دی ہے۔

یہاں اس آیت میں یہ بات ارشاد فرمائی کہ غیر شادی شدہ زانی ہو یا زانیہ ہو تو ان کو سو سو کوڑے سزا دو اور ان کے معاملے میں تمہیں ترس نہیں کھانا چاہیے اور سزا بھی علی الاعلان دو، چھپ کر نہ دو، ﴿وَ لْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ کہ جب ان کو سزا ملے تو مسلمانوں کا ایک مجمع ان کو دیکھے۔ عذاب کہتے ہیں "إِيْلَامُ الْحَيِّ عَلٰى سَبِيْلِ الْهَوَانِ" زندہ آدمی کو رسوا کرنے کے لیے تکلیف دینا یہ

ہے عذاب۔ یہ جو کوڑے مارے جاتے ہیں ان کوڑوں کا بنیادی مقصد تکلیف دینا نہیں ہے بلکہ بنیادی مقصد رسوا کرنا ہے تاکہ آئندہ اس گناہ کی کوئی ہمت اور جرأت نہ کرے، ان سے تکلیف دینا مقصود ہوتا تو ان کو بند کمرے میں ہی سزا دے دیتے جہاں کوئی بھی نہ دیکھتا۔ اسی لیے فرمایا کہ ان کی سزا کو مسلمانوں کا ایک مجمع دیکھے۔

سزا دینے کے وقت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت موجود ہو، اس کا مقصد صرف تکلیف دینا اور تنبیہ کرنا نہیں بلکہ رسوا کرنا بھی ہے۔ اگر مارنا ہی مقصود ہوتا تو پھر کوڑا سخت ہوتا، حالانکہ حکم دیا گیا کہ کوڑا اتنا سخت نہ ہو، لفظ ﴿فَاجْلِدُوْا﴾ جِلد سے ہے، جِلد کہتے ہیں چمڑے کو، عام طور پر جو سزا دینے کے لیے کوڑا مارا جاتا ہے وہ لکڑی کا نہیں ہوتا بلکہ چمڑے کا بنا ہوتا ہے اور لکڑی کا بھی ہو تو اتنا سخت نہ مارو کہ جس سے چمڑا ادھڑ جائے اور ہڈی تک اس کا اثر پہنچ جائے۔ آپ کسی آدمی کو بند کمرے میں دس جوتے مارو وہ برداشت کرلے گا لیکن سو بندوں میں کھڑا کر کے اس کی بے عزتی کرو تو برداشت نہیں کرے گا۔ تو شریف لوگ اس کو اپنے لیے بڑی توہین سمجھتے ہیں۔ بہرحال یہ شریعت نے حکم دیا ہے۔ تو شریعت میں شادی شدہ کے لیے رجم کی سزا ہے اور غیر شادی شدہ کے لیے کوڑے مارنے کی سزا ہے۔

عورت کا ذکر مرد سے پہلے کیوں؟

یہاں جب زنا کا مسئلہ اور سزا بیان کی تو پہلے عورت کا ذکر کیا یعنی ﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ﴾ کہا۔ زنا تب ہوتا ہے جب عورت بھی چاہے اور مرد بھی چاہے ورنہ زنا کیسے ہو سکتا ہے! بدکاری بہت مشکل ہے، جبر کے ساتھ کسی عورت کی عزت لوٹنا بہت مشکل ہے لیکن یہ بات یاد رکھنا کہ عورت کتنی بھی کمزور کیوں نہ ہو جب تک اس کی خواہش نہ ہو مرد عورت کے قریب جانے کی ہمت نہیں کرتا، ہمت تب کرے گا جب عورت کی

طرف سے مرد کو کوئی گنجائش نظر آئے ورنہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کوئی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ اس لیے شریعت نے عورت کو باہر نکلنے سے منع کیا ہے اور پردہ کا حکم دیا ہے، شوہر کے علاوہ کسی کے سامنے زیب وزینت کرنے سے منع کیا ہے۔ محرم کے سامنے اجازت ہے لیکن ترغیب نہیں ہے اور عورت کی آواز کو بھی ستر قرار دیا ہے اور عورت کے لباس تک کا خیال کیا ہے۔ اگر یہ زیور پہن کر جائے تو یوں نہ چلے کہ اس کی چھنکار آئے، اتنا مخفی اس لیے رکھا ہے کہ اس کی وجہ سے زنا کی ترغیب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت میں عورت کا ذکر پہلے کیا ہے اور مرد کا بعد میں کیا ہے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ (آمین)

زنا کے متعلق دوسرا حکم:

﴿اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۫ وَّ الزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾﴾

زانی مرد جب نکاح کرتا ہے تو زانیہ عورت سے کرتا ہے یا مشرکہ عورت سے کرتا ہے اور زانیہ عورت سے بھی نکاح یا تو زانی مرد کرتا ہے یا مشرک مرد کرتا ہے، اور یہ بات ایمان والوں پر حرام کر دی گئی ہے کہ وہ بدکار مرد یا بدکار عورت کو نکاح کے لیے پسند کریں۔

ایک بات تو یہ سمجھ لیں کہ یہاں جب نکاح کی بات کی ہے تو نکاح کی نسبت مرد کی طرف کی ہے ﴿اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً﴾ کہ زانی مرد نکاح کرتا ہے تو زانیہ عورت سے کرتا ہے یا مشرکہ عورت سے کرتا ہے اور جب زانیہ عورت کا معاملہ آیا تو یہ نہیں فرمایا کہ زانیہ عورت نکاح کرتی ہے زانی مرد سے یا مشرک مرد سے بلکہ وہاں انداز یہ اختیار فرمایا ﴿وَّ الزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ﴾ کہ

زانیہ عورت سے نکاح کرتا ہے زانی مرد یا مشرک مرد۔ یعنی دونوں کے نکاح کے بارے میں نسبت مرد کی طرف کیوں کی ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ نکاح کی نسبت مرد کی طرف ہوتی ہے کیونکہ نکاح میں مرد حاکم ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ نابالغہ لڑکی کے لیے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرنے کی گنجائش ہی نہیں ہے اور اگر بالغ ہو تو نکاح خود نہ کرے بلکہ اس کا ولی نکاح کروائے کیونکہ اس میں عورت کی عفت بھی ہے، حفاظت بھی ہے اور بہتر بھی یہی ہے کیونکہ اس کی عقل کم ہے اور وہ اپنے لیے مسائل پیدا کرے گی۔

دوسری بات یہ سمجھیں کہ اس آیت کا معنی یہ نہیں ہے کہ زانی مرد اگر پاک دامن عورت سے نکاح کرے تو اس کا نکاح نہیں ہوتا بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کی فطرت اور طبیعت بیان کی ہے کہ زانی مرد کو پاک دامن عورت اچھی نہیں لگتی، اس کا میلان بدکار عورت کی طرف ہی ہوتا ہے اور بدکار عورت کو پاک دامن مرد اچھا نہیں لگتا، اس کا رجحان بھی بدکار مرد کی طرف ہی ہوتا ہے۔

ایک بات یہ بھی سمجھیں کہ یہاں زانی مرد اور زانیہ عورت کے ساتھ مشرک مرد اور مشرکہ عورت کا ذکر کیوں کیا ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح زنا کرنے والا مرد ایک عورت پر راضی نہیں ہوتا بلکہ اور عورتوں کی طرف بھی دیکھتا ہے اسی طرح مشرک؛ ایک خدا پر راضی نہیں ہوتا بلکہ اور دروازوں کو بھی دیکھتا ہے، جس طرح زانیہ عورت ایک شوہر پر قناعت نہیں کرتی بلکہ اور مردوں کی طرف بھی نگاہ اٹھاتی ہے اسی طرح مشرک عورت بھی ایک اللہ کے در پر راضی نہیں ہوتی اور دروں پر بھی جاتی ہے، تو زانی اور مشرک ان دونوں کا مزاج چونکہ ایک جیسا ہے اس لیے دونوں کو اکٹھا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔

ترکیب کے اعتبار سے دو معانی کا بیان:

﴿وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۳﴾

یہ ایمان والوں پر حرام ہے۔

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ "زنا ایمان والوں پر حرام ہے"۔ "حُرِّمَ" میں جو ھو ضمیر ہے وہ زنا کی طرف لوٹتی ہے، پھر تو صاف سی بات ہے کہ زنا حرام ہے، کوئی تاویل کرنے یا مزید بات سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگر "حُرِّمَ" کی ھو ضمیر سے مراد نکاحِ زانی و زانیہ اور نکاحِ مشرک و مشرکہ ہو تو اب مطلب ہو گا کہ پاکدامن آدمی کا زانیہ عورت سے اور پاکدامن عورت کا زانی مرد سے نکاح حرام ہے، اسی طرح مسلمان مرد کا مشرکہ عورت سے اور مسلمان عورت کا مشرک مرد سے نکاح حرام ہے۔ ان کو حرام کیوں فرمایا؟ اس کی وجہ سمجھ لیں۔ جہاں تک مسئلہ ہے کہ مسلمان مرد کا نکاح مشرکہ عورت سے اور مسلمان عورت کا نکاح مشرک مرد سے تو اس کا حرام ہونا تو بالکل واضح ہے، مسلمان اور کافر کا نکاح آپس میں نہیں ہوتا، یہ بات بڑے آرام سے سمجھ میں آجاتی ہے۔

جہاں تک دوسرا مسئلہ ہے کہ پاکدامن آدمی کا زانیہ عورت سے اور پاکدامن عورت کا زانی مرد سے نکاح حرام ہے تو اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کو اچھی طرح سمجھ لیں! اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک پاکدامن اور عفت والا آدمی کسی زانیہ سے نکاح کرے اور نکاح کے بعد اس کو زنا سے نہ روکے بلکہ اس عورت کی زناکاری پر راضی رہے تو اس بندے کا یہ فعل حرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔ اسی طرح اگر کوئی پاکدامن اور صاحبِ عفت عورت زانی مرد سے نکاح کرے اور نکاح کے بعد اس کو اس فعلِ حرام سے نہ روکے اور اس پر راضی رہے تو اس عورت کا راضی رہنا فعلِ حرام اور ناجائز ہے۔

تو یہاں حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا فعل حرام ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا نکاح بھی حرام ہو، ان کا نکاح ٹھیک ہے، اس پر نکاح کے ثمرات مرتب ہوں گے، حق مہر بھی ہو گا، نفقہ بھی ہو گا، جو اولاد پیدا ہو گی اس کا نسب ان کے ساتھ ثابت ہو جائے گا، ان میں کوئی مر جائے تو میراث بھی ہو گی لیکن ان کا یہ فعل حرام رہے گا۔

میں اس کی مثال دوں تو پھر بات سمجھنی آسان ہو گی۔ کوئی شخص کسی عورت کو اغوا کرے اور پھر اس کو زنا پر مجبور کرے اور عورت کہتی ہے کہ میں اس طرح تو آپ کے ساتھ نہیں کر سکتی۔ مرد نے کہا: چلو پھر نکاح کر لو۔ عورت راضی ہو گئی اور انہوں نے دو گواہ بنا کر نکاح کر لیا۔ اب اس نکاح کی وجہ سے ہمبستری حلال ہو گئی ہے لیکن کیا مرد کا اس طرح کرنا جائز ہے؟ (نہیں۔ سامعین) اس طرح نکاح کرنا حرام ہے لیکن چونکہ یہ عورت اس کے نکاح میں آگئی ہے اس لیے ہمبستری حلال ہو گی، عورت کا نان و نفقہ اس مرد کے ذمے ہو گا، ان میں سے کوئی ایک مر جائے تو دوسرا اس کا وارث بھی ہو گا لیکن یہ طریقہ حرام ہے۔

زنا کے متعلق تیسرا حکم:

﴿وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّ لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٤﴾﴾

اب یہ تیسرا حکم آگیا ہے زنا کے بارے میں کہ عورت پاکدامن ہو، نیک ہو اور کوئی بندہ اس پر زنا کی تہمت لگاتا ہے تو اس شخص کو چاہیے کہ چار گواہ پیش کرے۔ اگر چار گواہ پیش نہیں کر سکتا تو اس تہمت لگانے والے پر حدِ قذف لگائی جائے گی اور وہ

مردود الشہادت ہو جائے گا، آئندہ کسی کیس میں اس کی شہادت قبول نہیں ہو گی۔ہاں اگر یہ توبہ کرلیتا ہے تو اس کو آخرت میں سزا نہیں ملے گی لیکن دنیا کی سزا باقی رہے گی یعنی اس کو کوڑے بھی لگیں گے اور آئندہ گواہی بھی قبول نہیں ہو گی۔

خلاصہ یہ کہ کوئی آدمی کسی پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت لگائے اور چار گواہ نہ پیش کر سکے تو اس کے بارے میں تین حکم ہیں:

1: اَسی کوڑے مارے جائیں گے۔

2: آئندہ کسی مقدمے میں یہ گواہ بن کر آئے تو اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔

3: اس شخص کو آخرت میں سزا ہو گی۔ہاں اگر اس نے توبہ کرلی تو توبہ کرنے سے آخرت والی جو سزا ہے وہ ختم ہو جائے گی لیکن مردود الشہادۃ پھر بھی رہے گا اور کوڑے بھی لگیں گے۔

حدِ زنا اور حدِ قذف میں ایک فرق ہے۔زنا اگر شہادتوں سے ثابت ہو جائے تو پھر کوئی مطالبہ کرے یا نہ کرے زانی اور زانیہ پر حدِ زنا ہو گی لیکن اگر کوئی شخص کسی پر تہمت لگائے اور چار گواہ پیش نہ کر سکے اور اگر مقذوف سزا کا مطالبہ کرے تو تہمت لگانے والے کو اَسی کوڑے مارے جائیں گے۔ اگر مقذوف سزا کا مطالبہ نہ کرے تو صرف تہمت لگانے پر اَسی کوڑے نہیں ہوں گے۔اس لیے کہ یہ حق العبد ہے اور حق العبد کا تعلق مطالبے کے ساتھ ہوتا ہے۔

لِعان کا مسئلہ:

﴿وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝٦﴾

یہ معاملہ خاوند اور بیوی کے درمیان ہے۔اگر کوئی شخص اپنی بیوی پر زنا کا

الزام لگائے اور چار گواہ بھی پیش کرے تو اس کی بیوی پر حد زنا لگ جائے گی۔ اگر گواہ نہ ہوں تو لعان ہو گا۔ لعان کا طریقہ یہ ہے کہ یہ مرد چار مرتبہ قسمیں کھائے کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اس بات میں سچا ہوں کہ میں نے اسی طرح اس کو دیکھا ہے۔ پانچویں مرتبہ قسم یوں اٹھائے کہ اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو۔ اب بیوی سے کہا جائے گا کہ وہ بھی چار مرتبہ قسمیں کھائے کہ یہ جھوٹ بولتا ہے اور پانچویں مرتبہ یوں قسم کھائے کہ اگر یہ سچا ہے تو پھر مجھ پر خدا کا غضب نازل ہو۔

یہاں شوہر کی پانچوں قسموں میں نسبت شوہر کی طرف ہے اور بیوی کی پانچوں قسموں میں بھی نسبت شوہر کی طرف ہے حالانکہ انکار تو بیوی بھی کر رہی ہے۔ تو چونکہ الزام شوہر نے لگایا ہے اس لیے نسبت بھی اسی کی طرف کر دی ہے۔ اسے شریعت میں "لعان" کہتے ہیں۔

حدیث پاک میں ہے کہ یہ دونوں کبھی بھی آپس میں جمع نہیں ہو سکتے، یہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے لیکن طلاق نہیں ہو گی۔ طلاق تب ہو گی جب شوہر اس کو طلاق دے گا اور اس کو طلاق دینی چاہیے۔ اگر شوہر طلاق نہیں دیتا تو پھر قاضی ان دونوں کے درمیان قضاءً تفریق کرائے اور پھر وہ تفریق طلاق شمار ہو گی۔

اگر کوئی بندہ اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت پر زنا کا الزام لگائے تو حکم الگ ہے اور اگر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے تو حکم الگ ہے۔

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ﴿١٠﴾﴾

دیکھو! یہ اللہ کا فضل اور رحمت ہے کہ تمہیں حکمِ لعان دیا ہے۔

کیونکہ اگر کسی نے اپنی بیوی کو کسی کے ساتھ دیکھا تو برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ اگر قاضی کو جا کر کہے کہ میں نے بیوی کو زنا کرتے دیکھا ہے تو قاضی حد کیسے لگائے گا؟ اس کے پاس چار گواہ نہیں ہیں اور کسی کو نہ بتائے تو چونکہ اپنی آنکھوں سے

دیکھا ہے اس لیے برداشت کیسے کرے گا؟ اب اس کو گولی مار دے تو مارنا جائز نہیں ہے، اب یہ کیا کرے؟ اور اگر اپنے خاندان کو جمع کر کے کہے کہ میں نے اس کو طلاق دینی ہے، میں نے فلاں کے ساتھ دیکھا ہے تو ثبوت پیش کرو! اب کہاں سے ثبوت لائے گا؟ اس لیے حکمِ لعان اللہ کا فضل اور رحمت ہے۔

اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان یہ بہت عجیب معاملہ تھا۔ جب یہ حکم نازل ہوا کہ اگر کسی کو زنا کرتے دیکھو تو چار گواہ پیش کرو تو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے کہا کہ یارسول اللہ! کوئی بندہ اپنی بیوی کے ساتھ کسی کو دیکھے تو پھر گواہ لینے کے لیے جائے گا اور وہ واپس آئے گا تو وہ کام کر کے جا چکا ہو گا۔ تو ہم کیا کریں؟

دوسرا دن ہوا تو انصار صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک کے ساتھ یہ واقعہ پیش آگیا۔ اس نے کہا: جی میرے گھر یہ واقعہ ہو گیا ہے۔ تو انصار صحابہ کہتے ہیں کہ جس کام کو ہم نے غیرت کا مسئلہ سمجھا تھا ہمارے گھر ہی وہ معاملہ ہو گیا۔ تو پھر یہ آیات نازل ہوئیں کہ اب لعان کرو۔

واقعۂ افک:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَ الَّذِیْ تَوَلّٰی كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۱﴾﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سن 6ھ کو غزوہ بنو المصطلق میں تشریف لے گئے۔ واپس آرہے تھے تو حضرت ام المؤمنین امی عائشہ رضی اللہ عنہا قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئیں۔ امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر بھی تھوڑی تھی اور وزن

بھی کم تھا اور ہودج - جو اونٹ کے اوپر کجاوا ہوتا تھا- جس میں بیٹھتی تھیں اس کا پردہ بھی لٹکا ہوا تھا تو اٹھانے والے صحابہ نے یہ سمجھا کہ شاید امی عائشہ رضی اللہ عنہا اس میں موجود ہیں۔ چونکہ عمر تھوڑی ہے اور وزن کم ہے اس لیے محسوس نہیں کیا۔ ہودج اٹھا کر اونٹ کے اوپر رکھا اور قافلہ روانہ ہو گیا۔

امی عائشہ رضی اللہ عنہا جب واپس تشریف لائیں تو قافلہ جا چکا تھا۔ آپ نے نہایت عقل مندی سے فیصلہ فرمایا کہ جب اگلی منزل پر اتریں گے اور میں ہودج میں نہیں ہوں گی تو ظاہر ہے کہ مجھے تلاش کرنے کے لیے واپس آئیں گے، اس لیے بجائے اس کے کہ میں قافلے کے پیچھے جاؤں اور راستہ بھٹکوں تو میں ادھر ہی ٹھہر جاتی ہوں۔ حضرت امی عائشہ رضی اللہ عنہا نے چادر اپنے اوپر لی اور وہیں لیٹ گئیں۔ حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ کے ذمہ تھا کہ جب قافلہ چلے تو وہ پیچھے پیچھے آیا کریں اور وہ جگہ دیکھا کریں جہاں قافلہ رکا تھا، کسی کی کوئی چیز گر جاتی ہے تو ایسی چیزیں اکٹھی کر لیا کریں۔

حضرت صفوان رضی اللہ عنہ آئے تو دیکھا کہ ایک خاتون لیٹی ہوئی ہیں۔ نگاہ پڑی تو امی عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ انہوں نے فوراً کہا: "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" امی عائشہ رضی اللہ عنہا نے آواز کو سنا تو اٹھ گئیں اور فوراً پردہ فرما لیا۔ پردے کے احکام کے نازل ہونے سے پہلے امی عائشہ رضی اللہ عنہا کو چونکہ حضرت صفوان نے دیکھا ہوا تھا اس لیے دیکھنے سے پہچان گئے۔ اونٹ کو بٹھایا۔ امی عائشہ رضی اللہ عنہا اس پر سوار ہو گئیں اور آپ ساتھ ساتھ چلے اور جب اگلی منزل پر پہنچے تو منافقین نے دیکھتے ہی ان پر الزام لگا دیا۔ یہ کیفیت تقریباً ایک مہینہ تک مدینہ منورہ میں رہی۔ سب سے بڑا شیطان عبد اللہ بن ابی تھا۔ اس نے اس واقعہ کو اڑایا۔ اس نے طریقہ یہ اختیار کیا کہ خود سامنے نہ آتا اور باقی لوگ بات کرتے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ باتیں سنتے رہے اور آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔ آپ گھر تشریف لے جاتے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھتے کہ کیا حال ہے؟ ٹھیک ہو؟ کوئی چیز چاہیے؟ اور پھر واپس تشریف لاتے، اس سے زیادہ گھر رکتے نہیں تھے۔ حضرت امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے بہت تکلیف ہوتی لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے مجھ سے پہلے معاملہ فرماتے تھے اب اتنی شفقت اور توجہ کیوں نہیں ہے۔ امی عائشہ رضی اللہ عنہا کو بہت تکلیف ہوئی اور بیمار ہو گئیں۔

ایک رات قضائے حاجت کے لیے باہر تشریف لے گئیں۔ حضرت مسطح رضی اللہ عنہ کی والدہ ام مسطح رضی اللہ عنہا آپ کے ساتھ تھیں۔ ام مسطح کا پاؤں ان کی چادر میں الجھا تو وہ گر پڑیں اور ان کی زبان سے نکلا: مسطح ہلاک ہو جائے!

امی عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ وہ تو بدری صحابی ہے، اتنا نیک اور شریف آپ کا بیٹا ہے اور آپ بد دعائیں دیتی ہیں! تو انہوں نے کہا: عائشہ! تجھے معلوم نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ پورا مہینا ہو گیا ہے۔ عبد اللہ بن ابی منافقین کے سردار نے جو تمہارے اوپر الزام لگایا ہے اس میں تو میرا بیٹا بھی شامل ہو گیا ہے۔ جب بتایا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اب سمجھ میں بات آئی کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے اوپر توجہ کیوں نہیں دیتے تھے۔ پھر ظاہر ہے جو ان پر گزرنی تھی وہ انہی پر گزری ہو گی۔

اس کو عام بندہ کیسے سوچ سکتا ہے! پاکدامن بھی ہو، نبی کی بیوی بھی ہو، ام المؤمنین ہو اور اس پر الزام لگے تو آپ سوچیں ذرا کیا کیفیت ہو گی؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا گھر آئیں تو حضرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لی کہ آپ اگر مجھے اجازت دیں تو میں اپنی امی ابو کے ہاں چلی جاؤں۔ فرمایا: چلی

جاؤ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی والدہ کے ہاں آگئیں تو اپنی والدہ سے پوچھا کہ امی یہ کیا معاملہ ہے؟ ان کی والدہ نے کہا: دیکھو بیٹی! ایسے ہوتا ہے کہ جو بیوی خاوند کی منظورِ نظر ہو لوگ اس پر باتیں کرتے ہیں، اللہ کرم کرے گا، تم تسلی رکھو! خیر امی عائشہ رضی اللہ عنہا نے کیا تسلی رکھنی تھی۔ بیمار پڑ گئیں۔ بستر پر لیٹ گئیں۔ رو رو کے اپنے آنسو ختم کر لیے۔

اسی دوران حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس خبر کے پھیلنے کی وجہ سے بہت غمگین تھے۔ حضرت علی اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما یہ ان کے گھر کے بچے شمار ہوتے تھے۔ آپ نے دونوں کو بلا کر بطورِ خاص مشورہ کیا کہ اسامہ اور علی! تم بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے، میں کیا کروں؟ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے حضور! مشورہ کیا کرنا ہے، وہ بہت نیک ہیں، پاکدامن ہیں، اتنی شریف ہیں تو آپ کیوں ایسی بات سوچتے ہیں، آپ ان افواہوں کی پرواہ مت کیجیے! حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ حضور! اگر افواہوں کی وجہ سے آپ کی طبیعت میں عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کچھ تکدر آگیا ہے تو آپ حکم فرمائیں اور رشتہ لے آتے ہیں! کیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راحت کا خیال ہو رہا ہے۔ یہ ہوتا ہے چھوٹوں کا بڑوں کے ساتھ معاملہ۔

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی بیوی نے گھر میں بات کی کہ ہم کیا سن رہے ہیں عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں! حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سے فرمایا کہ تم یہ کام کر سکتی ہو؟ کہا کہ نہیں! تو انہوں نے کہا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کیسے سوچتی ہو؟ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی کے بارے میں یہ کیسے سوچ لیا ہے؟ کہا کہ لوگ باتیں کر رہے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب سنا تو فوراً یہی کہا: "هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ"

کہ یہ بہت بڑا بہتان ہے، ایسا نہیں ہو سکتا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اپنے والدین کے گھر تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! مجھے تمہارے بارے میں یہ باتیں پہنچی ہیں۔ اگر تم بری ہو تو اللہ ضرور تمہیں بری کر دیں گے اور اگر تم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو توبہ کر لو، بندہ جب اللہ کے حضور توبہ کرتا ہے تو اللہ ضرور اس کی توبہ قبول فرما لیتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے اپنے ابو سے کہا: آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دیں۔ انہوں نے کہا: میں کیا جواب دوں؟ پھر میں نے امی سے کہا کہ امی! آپ جواب دیں۔ امی نے کہا کہ بیٹا! اب ہم کیا بات کریں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ہمت کر کے پھر میں نے بات کی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک عجیب فاضلانہ گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں بری ہوں اللہ جانتا ہے لیکن اگر میں کہہ دوں کہ میں ٹھیک ہوں تو شاید آپ کو یقین نہ آئے اور اگر میں کہہ دوں کہ آپ نے ٹھیک سنا ہے تو شاید آپ کو یقین آ جائے۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ لوگوں کی باتوں سے اتنا متاثر ہیں کہ اب آپ میری ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بس میں اس کو اللہ کے حوالے کرتی ہوں۔ یہ کہا اور الگ بستر پر جا کر لیٹ گئیں۔

اب ظاہر ہے کہ ان کو کتنی تکلیف ہوئی ہو گی؟ آپ ذرا سوچیں! خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہیں پر تھے۔ ابھی گھر سے نکلے نہیں تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے آثار شروع ہو گئے۔ وحی آئی۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور فرمایا: ”أَبْشِرِيْ يَا عَائِشَةُ“ خوشخبری ہو عائشہ! اللہ نے تجھے بری قرار دیا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ نے کہا: عائشہ! اٹھو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ ادا کرو۔ آپ نے کہا: میں اٹھوں گی بھی نہیں اور شکریہ بھی ادا نہیں کروں گی، یہ تو میرے اللہ نے مجھ پر کرم کیا ہے۔ اب ظاہر ہے وہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لاڈلی بیوی تھیں۔

خیر اس پر پھر یہ دو رکوع نازل ہوئے اور اللہ رب العزت نے امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت کا اعلان فرمایا۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ تم میں سے ہی کچھ لوگ ہیں جو اس میں شریک ہو گئے ہیں۔

حضرت مسطح اور حضرت حسان رضی اللہ عنہما بھی اس پروپیگنڈے میں شریک ہو گئے تھے اور ان دونوں صحابہ کو اسی کوڑے لگے ہیں لیکن یہ بدری صحابہ ہیں۔ ان کے بارے میں ہمارے دل میں رتی برابر بھی میل نہیں ہے۔ اللہ ہمیں شریعت سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

﴿لَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّ قَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۲﴾ لَوْ لَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾﴾

اللہ فرماتے ہیں: جب تم نے یہ بات سنی تھی تو تم اچھا گمان رکھتے اور تم کہتے کہ یہ کھلا ہوا بہتان ہے۔ یہ بہتان لگانے والے اپنی اس بات پر چار گواہ کیوں نہیں لائے؟ جب یہ گواہ نہیں لائے تو یہی لوگ اللہ کے ہاں جھوٹے ہیں۔

﴿وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ

فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۴﴾

اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو جو کام تم لوگوں نے کیا ہے اس کی وجہ سے تم پر سخت عذاب نازل ہوتا!

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک یہ تھا کہ اپنی بیویوں میں سے جن کے گھر رات گزارتے تو اس گھر میں جو ہدیہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملتا وہ اسی بیوی کا ہوتا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خواہش ہوتی تھی کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں ہوں تب ہدیہ دیں تاکہ حضرت عائشہ کو ہدیہ ملے اور باقی ازواج کو یہ بات پسند نہیں تھی۔

تو ایک مرتبہ بعض ازواج نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ آپ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کریں کہ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے کہیں کہ اتنا عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیال نہ کریں کہ جب ان کے گھر ہوں تب ہی ہدیہ دیں۔ ہمارا بھی خیال کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سفارش کی تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فاطمہ!

"أَلَا تُحِبِّينَ مَا أُحِبُّ؟"[47]

جو بات تمہارے ابو پسند کرتے ہیں کیا تم وہ پسند نہیں کرتیں؟

حضرت عائشہ کی سات خصوصیات:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سات ایسی خصوصیات ہیں جن میں ان کا کوئی شریک نہیں ہے:

1: حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہیں۔ کسی بڑے کی اولاد ہونا یہ

47۔ صحیح البخاری، رقم: 2581

بہت بڑی خصوصیت ہے اور بہت بڑا اعزاز ہے۔

:2 حضرت جبرئیل امین کپڑے پر یا اپنی ہتھیلی پر ان کی تصویر لے کر آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا کہ یہ آپ کی بیوی ہوں گی۔

:3 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باقی دس ازواج ایسی ہیں جو مطلقہ یا بیوہ ہیں اور یہ واحد ہیں جو کنواری ہیں۔

:4 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ایک بستر میں لیٹے ہوتے تھے تو وحی آجاتی تھی، کسی اور بیوی کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔

:5 جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گود میں رکھا ہوا تھا۔

:6 حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا جو حجرہ ہے وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا مدفن بنا ہے۔

:7 ان کی برأت کا اعلان خود قرآن کریم نے کیا ہے۔

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کتنی بڑی خصوصیات تھیں! اللہ پاک ہم سب کو قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

اہلِ فضل چاہیے کہ دوسروں کو نوازیں!

﴿وَ لَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْۤا اُولِی الْقُرْبٰى وَ الْمَسٰكِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۪ۖ﴾

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت مسطح رضی اللہ عنہ کا جو اِن کے رشتہ دار بھی تھے، صحابی بھی تھے اور غریب بھی تھے، ان کا خرچہ بند کر دیا کہ تم نے یہ کیوں کہا؟ جب یہ آیات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حق میں اتریں تو اللہ نے فرمایا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ یہ رشتہ دار بھی ہے، مسکین بھی ہے، مہاجر بھی ہے۔ تو جو تم دیتے

تھے دیتے رہو! صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی قسم کو توڑا، کفارہ ادا کیا اور حضرت مسطح رضی اللہ عنہ کو پھر خرچہ دینا شروع فرمادیا۔

پارسا لوگوں اور گندے لوگوں کی فطرت:

﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَ الطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَ الطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٢٦﴾﴾

یہاں مزاج بتایا ہے کہ گندی باتیں گندے مرد ہی کرتے ہیں اور گندے مرد گندی باتوں کے مناسب ہیں، اچھی باتیں اچھے مرد کرتے ہیں اور اچھے مرد اچھی باتوں کے مناسب ہیں یا اس کا مطلب یہ ہے کہ گند؛ گند کی طرف مائل ہوتا ہے اور طہارت؛ طہارت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پاک دامن ہیں، ان کے نکاح میں پاک دامن ہی آتی ہیں۔ پاکدامن لوگ پاکدامن بیویاں پسند کرتے ہیں اور پاکدامن عورتیں پاکدامن مرد پسند کرتی ہیں۔

تو یہ مزاج بتایا ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ نیک آدمی کے نکاح میں زانیہ نہیں آسکتی اور نیک عورت کا شوہر زنا نہیں کر سکتا! اس کا یہ معنی نہیں ہے۔

چار قسم کے مکانات کا حکم:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٧﴾﴾

مکانات عموماً چار قسم کے ہوتے ہیں:

1: وہ مکان جس میں آدمی خود اکیلا رہتا ہے۔

2: وہ مکان جس میں اور لوگ بھی رہتے ہوں، رشتے دار ہوں یا اجنبی ہوں۔

3: وہ مکان جس میں کسی کا رہائش پذیر ہونا معلوم نہ ہو کہ کوئی اس میں رہتا بھی ہے یا نہیں!

4: وہ مکان جو رہائش کے لیے نہیں ہیں جیسے مسجد، خانقاہ اور مدرسہ وغیرہ۔

☼ تو جو مکان رہنے کے لیے ہے اس میں اجازت کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور سلام اس نیت سے کر لیا جائے کہ اس میں فرشتے ہوں گے۔

☼ اور وہ مکان جس میں کچھ لوگ رہتے ہوں تو وہاں دو کام کرنے ہیں: ایک تو ان کو سلام کرنا ہے اور دوسرا ان سے اجازت لینی ہے اپنے تعارف کے ساتھ کہ میں کون ہوں۔ مثلاً میں پہلے سلام کرتا ہوں کہ "السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ!" اندر سے آواز آئے کہ کون؟ "میں مولانا محمد الیاس گھمن سرگودھا سے" صرف "میں" کہنا کافی نہیں ہے۔

امام علی بن عاصم واسطی بہت بڑے محدث گزرے ہیں۔ ایک بار وہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے گھر ان سے ملنے کے لیے گئے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کون؟ انہوں نے کہا: "اَنَا" میں ہوں۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے دوستوں میں سے "انا" نام کا کوئی نہیں ہے۔ پھر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے ان کو ایک حدیث سنائی کہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، دروازے پر دستک دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: "مَنۡ؟" کون ہو؟ انہوں نے کہا: "اَنَا" میں ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: "انا انا!" یعنی انا انا کیا ہوتا ہے، اپنا نام بتاؤ![48]

48۔ الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع للخطیب: ص260

اس لیے جب دروازے پر دستک دیں اور گھر والے پوچھیں کہ کون ہیں؟ تو اپنا پورا تعارف بتائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا:

اَلسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللہِ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَيَدْخُلُ عُمَرُ؟[49]

اللہ کے نبی پر سلام ہو، حضور! کیا عمر اندر آ سکتا ہے؟

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ملنے کے لیے گئے۔ فرمایا: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ! هٰذَا أَبُوْمُوْسٰی ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ! هٰذَا الْأَشْعَرِيُّ" یعنی پورا تعارف کروایا۔[50]

اس میں جھجکنا نہیں چاہیے۔ بعض لوگ صرف نام بتاتے ہیں اور ساتھ مولانا نہیں کہتے اور جو شہرت ہے وہ بھی نہیں بتاتے تو اس طرح بندے کو تعارف نہیں ہوتا۔ میں اپنی بات کرتا ہوں کہ میں جب کسی کو فون کرتا ہوں تو میں "مولانا محمد الیاس گھمن" کہتا ہوں۔

بعض لوگ ہمیں فون کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آپ کون ہیں؟ میں کہتا ہوں: آپ نے کس کو فون کیا ہے؟ حالانکہ پہلے اپنا نام بتانا چاہیے تھا، پھر یوں پوچھنا چاہیے تھا کہ آپ فلاں مولانا صاحب ہیں؟ تو تہذیب کے دائرے میں رہ کر فون کرنا بہت ضروری ہے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ؕ﴾

49۔ سنن ابی داؤد، رقم: 5201

50۔ صحیح مسلم، رقم: 2154

یہ دوسرے مکان کا حکم ہے جہاں پر لوگ رہتے ہیں کہ ان کو سلام کرو، ان سے اجازت لو! "تَسۡتَاۡنِسُوۡا" کا معنی ہے کہ جب بندہ اجازت لیتا ہے تو مانوس ہو جاتا ہے۔

﴿فَاِنۡ لَّمۡ تَجِدُوۡا فِيۡهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدۡخُلُوۡهَا حَتّٰى يُؤۡذَنَ لَـكُمۡ‌ ۚ وَاِنۡ قِيۡلَ لَـكُمُ ارۡجِعُوۡا فَارۡجِعُوۡا‌ هُوَ اَزۡكٰى لَـكُمۡ‌ ؕ﴾

یہ وہ مکان ہے جس میں بندے نہ ہوں اور یہ ہو سکتا ہے کہ ہوں تو ان سے اجازت مانگو! ملتی ہے تو ٹھیک ہے اور نہیں ملتی تو اندر نہ جاؤ! اگر اندر لوگ موجود ہیں اور کہتے ہیں کہ واپس جاؤ تو اس میں ہتکِ عزت محسوس نہ کرو! بسا اوقات کوئی مجبوری ہوتی ہے، کوئی ضرورت ہوتی ہے۔

﴿لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَدۡخُلُوۡا بُيُوۡتًا غَيۡرَ مَسۡكُوۡنَةٍ فِيۡهَا مَتَاعٌ لَّـكُمۡ‌ ؕ﴾

یہ وہ مکان ہے جو رہائش کا نہیں ہے ویسے کوئی خانقاہ ہے یا مدرسہ ہے اس میں داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ وہاں تمہارا سامان موجود ہے اور اپنی ضرورتیں پوری کرو۔

آنکھ اور عصمت کی حفاظت کا حکم:

﴿قُلْ لِّـلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَغُـضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِهِمۡ وَيَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَهُمۡ‌ ؕ ذٰ لِكَ اَزۡكٰى لَهُمۡ‌ ؕ﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایمان والوں کو چاہیے کہ اپنی نگاہ نیچے رکھیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ زیادہ صفائی کا سبب ہے۔

﴿وَقُلْ لِّـلۡمُؤۡمِنٰتِ يَغۡضُضۡنَ مِنۡ اَبۡصَارِهِنَّ وَيَحۡفَظۡنَ فُرُوۡجَهُنَّ﴾

ایمان والی عورتوں کو بھی چاہیے کہ اپنی نگاہیں نیچے رکھیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کریں۔

ایک ہے مرد کا نامحرم عورت کو دیکھنا اور ایک ہے عورت کا نامحرم مرد کو دیکھنا۔ اگر عورت کے لیے نامحرم مرد کو دیکھنے کی اجازت ہوتی تو اللہ کبھی نہ فرماتے ﴿يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ﴾ معلوم ہوتا ہے کہ مرد کے ذمہ ایک کام ہے عورت کو نہ دیکھنا اور عورت کے ذمہ دو کام ہیں: نمبر ایک ... مرد کو نہ دیکھنا اور نمبر دو... اپنے چہروں کو چھپا کر رکھنا! مرد پر پردہ نہیں ہے، عورت پر پردہ ہے۔

عورت کے پردے کا ایک حکم:

﴿وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾

عورت اپنی زینت کو ظاہر نہ کرے۔

ایک ہے زینت اور ایک ہے زینت کی جگہ۔ مثلاً زینت کی چیز سرمہ ہے اور زینت کی جگہ آنکھ ہے، ایک زینت کی چیز چوڑی ہے اور زینت کہ جگہ بازو ہے، زینت کی چیز انگوٹھی ہے اور زینت کی جگہ انگلی ہے۔ دونوں اس میں شامل ہیں یعنی اپنی زینت کی جگہیں اور مواقع ظاہر نہ کرو۔

﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾

مگر جسم کے وہ حصے جو خود بخود کھل جاتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس سے مراد دو قسم کی چیزیں ہیں؛ ایک زینت کی چیزیں ہیں مثلاً کپڑا اور ایک اس کو چھپانے کے لیے ہے جیسے برقعہ، اس کو تو نہیں چھپا سکتے کہ یہ ان کی مجبوری ہے۔ تو ﴿مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ میں برقعہ اور چادر شامل ہیں۔

اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ مواقعِ زینت کو ظاہر نہ کرو لیکن زینت کے مقامات جو خود بخود کھلتے ہیں ضرورت کی وجہ سے جس میں چہرہ ہے اور ہاتھ ہیں اس کا ذکر تو احادیث میں ہے اور پاؤں کو قیاس کیا ہے چہرہ وغیرہ پر کہ عموماً عورت کام کے لیے باہر جاتی ہے، لہذا اس کی اجازت ہے۔

اور اجازت کے دو مطلب ہیں؛ ایک یہ ہے کہ عورت پر ان اعضائے مذکورہ کا پردہ نہیں ہے اور ایک معنی ہے کہ ان کو دیکھنا جائز ہے۔ یہ دو چیزیں الگ ہیں؛ عورت کو ان چیزوں کی اجازت دی ہے ضرورت کی وجہ سے لیکن اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ مرد؛ عورت کے چہرے کو دیکھے۔

﴿اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۠﴾

یہاں سے بارہ قسم کے افراد بتائے ہیں کہ جن سے عورت پر پردہ نہیں ہے۔ اس سے مراد چہرہ نہیں ہے بلکہ مواقعِ زینت مراد ہیں یعنی سینہ، گردن، سر کے بال، پنڈلی کہنی تک بازو ہیں۔ وہ بارہ افراد کون کون سے ہیں:

(1) عورت کا شوہر

(2) اپنا والد

(3) سسر

(4) عورت کے اپنے بیٹے

(5) شوہر کا بیٹا جو کسی اور بیوی سے ہے

(6) عورت کے اپنے بھائی

(7)عورت کے بھائی کے بیٹے

(8)عورت کی بہن کے بیٹے

(9)مسلمان عورتیں

(10)باندیاں۔ اس میں غلام شامل نہیں ہیں، غلاموں سے پردہ فرض ہے

(11)ایسے لوگ جو گھر میں رہتے ہیں کھانے پینے کے لیے اور ان میں عقل اتنی نہیں ہوتی کہ عورتوں اور مردوں کے معاملات سمجھتے ہوں

(12)ایسے چھوٹے بچے جو مرد اور عورت کے معاملات سے واقف نہیں ہیں۔

توان مذکورہ بارہ قسم کے افراد کے سامنے عورت بوقت ضرورت بازو، پنڈلی، سر کے بال وغیرہ کھول سکتی ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ ان اعضاء کا کھولنا ضروری ہے۔

﴿وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ﴾

عورت اپنے پاؤں کی آواز کو بھی مخفی رکھے تاکہ اس کی جو زینت ہے وہ کھل نہ جائے۔

بعض عورتیں اپنے پاؤں میں زیور پہنتی ہیں کہ چلنے سے جن کی آواز آتی ہے۔ تو کوشش کریں کہ ان کی آواز بھی نہ آئے۔

عورت کی آواز بھی ستر ہے۔ بغیر ضرورت کے عورت کو اپنی آواز بھی نا محرم سے مخفی رکھنی چاہیے۔ ہاں ضرورت ہو تو الگ بات ہے۔ جیسے پردہ کی آیات نازل ہونے کے بعد بھی حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پردہ میں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے مسائل پوچھتے تھے، وہ جواب عنایت فرماتی تھیں۔

عورت کے جسم کا وہ حصہ جس کا نماز میں چھپانا فرض ہے یہ عورت کا ستر ہے جس کا نامحرم سے چھپانا فرض ہے اور نماز پڑھتے وقت عورت کی ہتھیلیاں، چہرہ، پاؤں

ننگے ہوں تو نماز ہو جاتی ہے۔

بے نکاحوں کے نکاح کرانے کی ترغیب:

﴿وَ اَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ وَ الصّٰلِحِیۡنَ مِنۡ عِبَادِکُمۡ وَ اِمَآئِکُمۡ﴾

جو مرد اور عورتیں بغیر نکاح کے ہیں ان کا بھی نکاح کراؤ!

بغیر نکاح کے ہونے سے مراد یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص کی بیوی تھی فوت ہو گئی ہے، یا کسی عورت کا شوہر تھا فوت ہو گیا ہے یا ایسا ہے کہ انہوں نے نکاح کیا ہی نہیں ہے تو ان کا نکاح کرانے کا حکم دیا گیا ہے۔

یہاں ﴿وَ اَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی﴾ میں نکاح کی نسبت مردوں کی طرف کی ہے کہ ان کا نکاح تم خود کراؤ! اس سے معلوم ہوا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کا ازخود شادیاں کرنا ٹھیک نہیں ہے، بڑوں کو چاہیے کہ رشتے کروائیں کیونکہ بڑوں کے رشتوں میں خیر ہی خیر ہے۔

﴿وَ الصّٰلِحِیۡنَ مِنۡ عِبَادِکُمۡ وَ اِمَآئِکُمۡ﴾

اور جو نکاح کی صلاحیت رکھتے ہیں تمہارے غلاموں اور باندیوں میں سے تو ان کے نکاح کرادو!

﴿اِنۡ یَّکُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ یُغۡنِہِمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ﴾

اگر ان کے پاس پیسے نہیں ہیں تو اللہ اپنے فضل سے دے دیں گے۔

یہاں ترغیب دینا مقصود ہے کہ اگر ان میں صلاحیت ہو، حقوق ادا کرنے کی طاقت بھی ہو تو نکاح کرادو! میں ذاتی طور پر اپنے تجربات کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ اللہ رب العزت نکاح کی وجہ سے غربت نہیں دیتے بلکہ نکاح کی وجہ سے اللہ دولت دیتے ہیں۔ یہ شرط ہے کہ نکاح نیک نیتی سے کیا جائے، محض اپنی شہوت اور شہرت کے لیے نہ کیا

جائے۔ بعض شہوت کے لیے کرتے ہیں اور بعض شہرت کے لیے کرتے ہیں کہ میری دو بیویاں، تین بیویاں ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس سے تو جو نقصانات ہونے ہیں وہ تو ہونے ہیں۔

ابھی کچھ دن قبل کی بات ہے میں نے اپنی چھوٹی دونوں بیویوں کے اکاؤنٹ میں دس ہزار مہینا کے اعتبار سے چھ ماہ کے اکٹھے پیسے جمع کروادیے تاکہ بعد میں ان کے کام آتے رہیں۔ مجھے شارجہ سے فون آگیا کہ استاذ جی! اکاؤنٹ نمبر بھیج دیں، میں نے ہدیہ دینا ہے۔ میرا اکاؤنٹ نمبر تو نہیں ہے اس لیے میں نے کسی اور کا دے دیا۔ تو اس نے ایک لاکھ روپے بھیج دیے۔ تو جتنا خرچ کیا تھا اللہ نے اتنا دے دیا۔

ایک مرتبہ غالباً عید کا موقع تھا، گھر والوں نے کہا: پیسے چاہییں، کپڑے وغیرہ لینے ہیں۔ میں نے پوچھا: کتنے؟ کہا: تیس ہزار روپے۔ میرے پاس استطاعت نہیں تھی پھر بھی میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں دے دیے اس نیت سے کہ اللہ اور دے دیں گے۔ تو میرا ایک دوست آیا اس نے کہا: یہ آپ کے لیے ایک ہزار ریال ہدیہ ہے۔ تو جتنے خرچ ہوئے تھے اللہ نے اتنے دے دیے۔ اب میرا یقین ہو گیا ہے کہ اللہ رب العزت بیوی اور بچوں پر خرچ کرنے کی وجہ سے مال میں تنگی نہیں فرماتے۔

میں نے جب دوسری شادی کی تو میرا مکان نہیں تھا اور پیسے بھی نہیں تھے لیکن میں نے شادی اس نیت سے کی کہ بیوی عالمہ ہو گی تو بنات کا مدرسہ بن جائے گا اور بچیوں کے لیے تعلیم کا انتظام ہو جائے گا۔ میں نے شادی کر لی۔ میری بیوی ایک سال تک اسی میرے کمرے جو کہ میری بیٹھک ہے، اس میں رہی۔ ہمارے چچا امریکہ میں تھے، وہیں فوت ہو گئے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ مدرسہ کے لیے جگہ دیں تو بنات کے مدرسے کی یہ جگہ انہوں نے دے دی، کہا کہ مدرسہ بنالو! میں نے کہا: ٹھیک ہے۔ ہم نے نقشہ بنایا کہ ساتھ گھر بھی ہو گا۔ میں نے بھائی خبیب سے پوچھا: کتنے پیسے لگیں

گے ؟ انہوں نے کہا: دس لاکھ کا خرچہ ہے۔ تو میں نے ایک دوست سے کہا کہ دس لاکھ روپے قرض دے دو! اس نے دے دیے۔ جب کام شروع کیا تو بنیادوں تک پہنچے پہنچتے دس لاکھ پورا ہو گیا۔ میں نے دوبارہ انہیں فون کیا کہ دس لاکھ اور دے دیں اور اپنا اکاؤنٹ نمبر بھی دیں، میں رمضان کے بعد تھوڑا تھوڑا دیتا رہا ہوں گا۔ اس نے کہا: پہلا دس لاکھ آپ کا ہدیہ اور دوسرا دس کل بھجوا دیتا ہوں۔ جب چھت تک پہنچے تو وہ دس بھی ختم ہو گئے۔ میں نے پھر اس کو فون کیا کہ دس اور دے دیں، میں تھوڑے تھوڑے کر کے دے دوں گا۔ اس نے کہا: دوسرا دس وہ بھی ہدیہ اور یہ تیسرا دس لاکھ بھیج رہا ہوں یہ بھی ہدیہ ہے۔ تو کل تیس لاکھ ہیں۔ یہ مدرسہ میرے ذاتی پیسوں سے بنا ہوا ہے۔ دس لاکھ ہم نے اور لگائے تو مدرسہ اور مکان دونوں بن گئے۔ مجھے اس پر بہت خوشی ہوتی ہے کہ مدرسہ کے پیسوں سے میرا مکان نہیں بنا بلکہ میرے پیسوں سے مدرسہ بنا ہے۔ لہذا مجھے شرح صدر ہوتا ہے کہ میں مکانات کو اپنے ذاتی استعمال میں لاتا رہوں تو مجھے شرعاً کوئی الجھن نہیں ہوتی۔

اگر اللہ مجھے وسائل دے تو دنیا اس مرکز کو دیکھنے آئے، نقشہ، تعمیرات، ڈسپلن وغیرہ۔ ہمیں تو فقر و فاقہ ہے، ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں لیکن وسائل کی وجہ سے بڑھ نہیں سکتے۔

خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ بیوی اور اولاد کے بارے میں حسنِ نیت بہت ضروری ہے اور بندہ ان پر خرچ کرے تو اللہ محروم نہیں کرتے۔

میں کل ایک جگہ بیان پر گیا۔ تقریباً نو ہزار کا پٹرول ڈلوایا۔ میزبان نے ایک روپیہ بھی نہیں دیا اور نہ ہی میں نے ان سے تقاضا کیا ہے۔ ایک جگہ ناشتہ کیا تو میزبان نے پانچ ہزار دیے، دوسری جگہ سے ایک اور نے پانچ ہزار دیے اور تیسرے نے دو ہزار دیے۔ یوں دائیں بائیں سے لوگ ہدیے دیتے رہے اور اللہ نے پورے کر دیے۔

آج صبح میں مطالعہ کر رہا تھا۔ گھنٹی بجائی تو مولانا ذاکر اللہ آئے۔ میں نے ان سے کہا: دودھ میں پتی اور جوشاندہ ڈال کر لے آؤ! میں بتا نہیں سکتا کہ میرے دل پر شکر کی کیفیت کیا تھی؟ میں ایسے مست ہوتا ہوں کہ جیسے کوئی اپنی سلطنت میں مست ہوتا ہے کہ ایک منٹ میں بیٹھے بیٹھے دودھ پتی چائے پہنچ گئی۔ میں بارہا کہا کرتا ہوں آپ سے بھی اور اپنے اساتذہ سے بھی کہتا رہتا ہوں کہ اللہ کے انعامات پر بہت زیادہ شکر ادا کیا کرو، کبھی کفرانِ نعمت نہ کیا کرو۔

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾[51]

انسان اللہ کا جتنا شکر ادا کرتا ہے اللہ انعامات میں اضافہ فرماتے ہیں۔

﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ﴾[52]

انسان کا عقیدہ ٹھیک ہو اور شاکر ہو تو اللہ فرماتے ہیں کہ میں اس کو عذاب کیوں دوں؟

باقی خواہشات تو بادشاہوں کی بھی پوری نہیں ہوتیں اور ضرورتیں فقیروں کی بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ ہم لاہور سے آرہے تھے تو مزدور سڑک پر کھڑے ہیں، پتا نہیں کہ کوئی لینے آئے گا بھی یا نہیں؟ پتا نہیں کھانا بھی ملنا ہے یا نہیں؟ اور ہمیں روزانہ تروتازہ کھانا ملتا ہے بغیر کسی انتظار اور مشقت کے، یہ اللہ کا کتنا بڑا فضل ہے! ہماری کتنی پرسکون زندگی ہے اور آخرت میں اللہ کی رضا اور جنت تو ملنی ہے ان شاء اللہ۔

عفت و پاکدامنی اختیار کرنے کا حکم:

﴿وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ﴾

51۔ ابراہیم 7:14

52۔ النساء 147:4

اور جس کے پاس نکاح کرنے کے اسباب نہ ہوں تو وہ پاک دامنی کی زندگی گزاریں، جب اللہ اپنے فضل سے انہیں ہمت دیں اور اسباب مہیا فرمادیں تو وہ پھر نکاح کرلیں۔

﴿وَ لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ﴾

زمانہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ لوگ باندیاں رکھتے اور ان سے زنا کرواتے اور پیسے کھاتے۔ عبد اللہ بن ابی بے ایمان منافق یہ کرتوت کرتا تھا اور ان کی کمائی کھاتا تھا۔ بعض باندیاں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئیں وہ نہیں چاہتی تھیں لیکن یہ پھر بھی کراتا تھا۔ تو قرآن نے سمجھایا کہ ایسا کرنا تو جائز ہی نہیں ہے خصوصاً وہ باندی جو پاکدامن ہو اسے زنا پر مجبور کرنا یہ تو اور بھی گناہ ہے۔ باندیوں کو سمجھایا کہ تم یہ کام نہ کرو اگر آقا مجبور کر کے یہ کام کراتا ہے تو پھر تم پر کوئی گناہ نہیں ہے، اللہ تمہیں معاف کر دے گا۔

اللہ آسمان وزمین کا نور ہے:

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ﴾

اس آیت میں اللہ نے اپنے نور؛ نورِ ہدایت کی مثال دی ہے۔ جب ہم کہتے ہیں: اللہ نور ہے تو اس سے مراد ہوتا ہے "مُنَوِّرٌ" یعنی روشن کرنے والا۔

"نور" کا حقیقی معنی ہے: "اَلظَّاهِرُ بِنَفْسِهٖ وَالْمُظْهِرُ لِغَيْرِهٖ" خود ظاہر ہو اور دوسرے کو ظاہر کرے۔ نور کا یہ حقیقی معنی اللہ پر صادق نہیں آتا کیونکہ اللہ ظاہر نہیں ہیں تو یہاں نور کا مجازی معنی ہے۔ نور سے مراد ہے "مُنَوِّرٌ" کہ اللہ رب العزت روشن کرتے ہیں آسمانوں کو اور زمین کو۔ اس سے مراد ہے "مَا فِي السَّمٰوٰتِ" ہے یعنی ان کو

جو آسمانوں میں ہیں اور "وَالْاَرْضِ" کا معنی ہے "وَمَا فِي الْاَرْضِ" جو زمین میں ہیں۔ مراد صرف آسمان اور زمین کی مخلوق نہیں ہے بلکہ تمام مخلوقات ہیں، تمام مخلوق کا کنایہ آسمان اور زمین سے ہے کیونکہ ہمارے سامنے یا زمین ہے یا آسمان ہے، اس میں تمام مخلوقات آتی ہیں۔

اللہ رب العزت کیسے روشن کرتے ہیں؟ تو اس کی مثال دی ہے کہ جیسے ایک طاقچہ ہو- طاقچہ سے مراد جیسے دیوار ہے اور دیوار میں روشن دان سا بنا ہو جو پیچھے سے بند ہو- پھر اس طاقچہ میں چراغ ہو اور چراغ ایک قندیل میں ہو اور چراغ کو جس تیل سے جلایا جا رہا ہے وہ زیتون کا تیل ہے، ﴿لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّ لَا غَرْبِيَّةٍ﴾ اور زیتون بھی ایسا کہ جس کی مشرق کی جانب کسی درخت یا پہاڑ کی کوئی آڑ نہ ہو اور مغرب کی جانب بھی کسی درخت یا پہاڑ کی آڑ نہ ہو۔ اگر مشرق کی جانب سے کوئی آڑ نہ ہو تو شروع دن سے ہی اس پر دھوپ پڑتی رہتی ہے اور اگر مغرب کی جانب سے کوئی آڑ نہ ہو تو آخر دن تک اس پر دھوپ پڑتی رہتی ہے۔ تو یہ ایسا زیتون کا درخت ہے کہ جس پر پورا دن سورج کی روشنی پڑتی رہتی ہے اسی وجہ سے اس کا تیل نہایت صاف اور عمدہ ہوتا ہے۔

اب مثال دی ہے کہ طاقچہ ہو وہ بھی شیشے کا ہے، اس میں قندیل ہے وہ بھی شیشے کا ہے اور قندیل میں ایک چراغ ہے، چراغ زیتون کے تیل سے جلنا ہے اور زیتون بھی ایسا کہ نہایت لطیف اور عمدہ ہے کہ بہت جلد جلتا ہے اور دھواں بہت کم دیتا ہے۔ فرمایا کہ اللہ اسی طرح روشن کرتے ہیں۔

اور اس سے مراد مؤمن کا دل ہے کہ مؤمن کے دل میں طبعی ایمان کے قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے، پھر اوپر سے وحی الٰہی جب آتی ہے تو بہت جلد اسے عمل کی توفیق مل جاتی ہے۔

﴿يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۭ﴾

اللہ رب العزت رہنمائی فرماتے ہیں اپنے نور کے ذریعہ جس کو چاہتے ہیں اور لوگوں کو سمجھانے کے لیے مثالیں بھی دیتے ہیں۔

مساجد میں ذکر اللہ کی ترغیب:

﴿فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَ یُذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ ﴾

﴿فِیْ بُیُوْتٍ﴾ کا تعلق پچھلے جملے میں موجود لفظ ﴿یَهْدِی﴾ کے ساتھ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نور کے ذریعے جو رہنمائی فرماتے ہیں تو اس نورِ ہدایت کے ملنے کی جگہ ایسے گھر ہیں کہ جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کو بلند کیا جائے اور ان میں اللہ کا نام لے کر ذکر کیا جائے۔

یہاں بلند کرنے سے مراد ظاہراً بلند کرنا نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کی عظمت کا خیال کیا جائے۔ اور یہاں گھروں سے مراد مساجد ہیں۔

﴿یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِیْتَآءِ الزَّکٰوةِ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾﴾

ان گھروں میں صبح و شام اللہ کی تسبیح وہ لوگ بیان کرتے ہیں جنہیں کوئی تجارت یا کوئی خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے روکتی نہیں ہے، نماز قائم کرنے سے نہیں روکتی، زکوٰۃ ادا کرنے سے نہیں روکتی اور یہ لوگ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں کہ جس دن دل تڑپتے تڑپتے رہ جائیں گے اور آنکھیں الٹ پلٹ ہو جائیں گی۔

﴿لِیَجْزِیَهُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ یَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ وَ اللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾﴾

اللہ رب العزت ان لوگوں کو ان کے اعمال کا بہترین بدلہ دیں گے اور اپنے

کرم سے مزید بھی عطا فرمائیں گے اور اللہ جس کو چاہتے ہیں بغیر حساب کے رزق عطا فرما دیتے ہیں۔

کفار کے اعمال سراب کی مانند ہیں:

﴿وَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَعۡمَالُهُمۡ كَسَرَابٍۭ بِقِيۡعَةٍ يَّحۡسَبُهُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمۡ يَجِدۡهُ شَيۡـًٔـا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ فَوَفّٰٮهُ حِسَابَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۳۹﴾ۙ﴾

ان دو آیتوں میں اللہ نے دو قسم کے کافروں کی مثال دی ہے۔

[1]: دنیا میں ایک قسم ان کفار کی ہے جو قیامت کے قائل ہیں، جنت اور جہنم کے قائل ہیں لیکن عقائد کفریہ ہیں جیسے آج کے دور میں قادیانی ہیں، یہ جنت اور جہنم کو مانتے ہیں لیکن عقیدۃً مسلمان نہیں ہیں۔

[2]: اور بعض کافر وہ ہیں جو قیامت کے دن کے منکر ہیں۔ جیسے دہریے ہیں، یہ کافر ہیں اور قیامت کے دن کے منکر ہیں۔

تو کفار کی دو قسمیں ہیں؛ بعض قیامت کو مانتے ہیں لیکن کسی اور عقیدے کی وجہ سے کافر ہیں اور بعض قیامت کو بھی نہیں مانتے۔ تو جو قیامت کو مانتے ہیں وہ کچھ نہ کچھ نیک عمل بھی کرتے ہیں اور اس کو امید بھی ہوتی ہے کہ نیک عمل قبول ہو گا اور توقع بھی ہوتی ہے کہ اس کو اجر بھی ملے گا لیکن چونکہ شرطِ ایمان مفقود ہے یعنی ایمانیات کے سارے عقائد موجود نہیں ہیں اس لیے ان کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ تو ان کو نور؛ وہم کے درجے میں حاصل ہے۔

تو پہلے ان کافروں کی مثال دی ہے جو قیامت کو مانتے ہیں کہ ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے سراب ہو۔ ”سراب“ کہتے ہیں کہ جب سخت دھوپ میں بندہ ریت

پر کھڑا ہو تو اسے دور سے ایسے معلوم ہو گا جیسے پانی چل رہا ہو حالانکہ یہ دھوکہ ہے، یہ پانی نہیں ہوتا۔ تو پیاسا شخص سراب کو دور سے پانی سمجھتا ہے اور جب قریب جاتا ہے تو پانی موجود نہیں ہوتا۔ اب سوائے ندامت و شرمندگی اور حسرت کے اس کو کچھ نہیں ملتا۔ اس طرح یہ قیامت کو مانتے تھے تو نیک عمل کیا، ان کا وہم یہ تھا کہ نیک عمل کا اجر قیامت کے دن ملے گا اور جب قیامت کا دن آئے گا تو نیک عمل کا جو بدلہ ان کو اچھا نظر آرہا تھا وہ اچھا نہیں ہو گا، کیونکہ ایمان کی شرط مفقود ہو گئی ہے۔ حسرت کی وجہ سے ان کا مرنے کو دل چاہے گا لیکن پھر بھی نہیں مریں گے۔

﴿اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿۴۰﴾﴾

اور دوسرا وہ کافر ہے جو قیامت کو مانتا ہی نہیں ہے، وہ چونکہ قیامت کو مانتا نہیں ہے تو وہم کے درجے میں بھی اس کو نور حاصل نہیں ہے۔ اس کا تو کفر در کفر ہے، عمل اس کے پاس ہے ہی نہیں۔

آپ کے ذہن میں آئے گا کہ بعض کافر ایسے ہیں جو دہریے ہیں، قیامت کو نہیں مانتے لیکن نیک اعمال پھر بھی کرتے ہیں، ہسپتال بناتے ہیں، یتیم خانے بناتے ہیں، نیکی کے کام کرتے ہیں۔ تو وہ نیکی کے کام آخرت کے لیے نہیں کرتے ہیں وہ نیکی کے کام دنیا کے لیے کرتے ہیں، ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کاموں سے نیک نامی ہو گی، اجر کی وجہ سے وہ ہرگز ایسے کام نہیں کرتے۔ ان کفار کی مثال ایسی ہے جیسے بہت گہرا سمندر ہو اور اس میں اندھیرے ہوں، اس کے اوپر پھر ایک موج ہے پانی کی، پھر اس کے اوپر ایک موج ہے، پھر اس کے اوپر بادل ہیں۔ اب اتنا اندھیرا موجود ہو تو آدمی کو اور اعضاء تو درکنار اپنا ہاتھ بھی نظر نہیں آتا۔

ہاتھ کی مثال کیوں دی ہے؟ اس لیے کہ آدمی کے اعضاء میں سے آنکھ کے سب سے قریب ترین عضو ہاتھ ہوتا ہے، چہرہ قریب تو ہے لیکن نظر نہیں آتا، پیشانی قریب ہے لیکن نظر نہیں آتی، باقی جتنے بھی اعضاء ہیں دیکھنے کے اعتبار سے سب سے زیادہ قریب ترین عضو ہاتھ ہے اور ہاتھ ایک ایسا عضو ہے کہ آدمی آنکھ کے جتنا قریب کرنا چاہے کر سکتا ہے، باقی اعضا میں سے کوئی اتنا قریب کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ تو جب ہاتھ تک نظر نہیں آتا تو باقی اعضاء کیسے نظر آئیں گے؟ فرمایا کہ ان کفار کی مثال ایسے ہے کہ یہ قیامت کے دن کے قائل نہیں ہیں، نیک عمل بھی یہ کوئی نہیں کرتے تو یہ لوگ اندھیرے در اندھیرے میں ہیں، ان کو وہاں کچھ بھی نہیں ملے گا۔

تو دونوں میں فرق یہ ہے کہ جو قیامت کے دن کے قائل ہیں ان کے پاس نور ہے اگرچہ وہم کے درجے میں ہے اور جو قیامت کے دن کے قائل نہیں ہیں ان کے پاس وہم کے درجے میں بھی نور نہیں ہے۔

کامیابی کی بنیاد چار باتیں:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۲﴾﴾

یہ آیت نہایت جامع ترین آیت ہے۔ مسجد نبوی میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ موجود تھے کہ ایک شخص آیا۔ وہ کافر تھا، کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ تیرا کلمہ پڑھنے کا خاص سبب؟ اس نے کہا کہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے، میں نے تورات اور انجیل کو پڑھا ہے اور ایسی جامع آیت مجھے دنیا میں کہیں نہیں ملی، میں حقانیتِ قرآن کا قائل ہو کر کلمہ پڑھتا ہوں۔ فرمایا کہ وہ آیت کون سی ہے؟ اس شخص نے کہا: یہ آیت ہے؛

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۲﴾﴾

اس نے کہا: اس کے شروع میں ہے ﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ﴾ کہ اللہ رب العزت کی اطاعت کریں، اس کا تعلق فرائض کے ساتھ ہے کہ فرائضِ الٰہیہ کو مانیں، ﴿وَ رَسُوْلَهٗ﴾ اور پیغمبر کی سنت کو مانیں، ﴿وَ يَخْشَ اللّٰهَ﴾ خدا سے ڈریں یعنی ماضی میں خدا سے ڈرتا رہا ہو، ﴿وَ يَتَّقْهِ﴾ اور خدا کی مخالفت کبھی نہ کریں یعنی مستقبل میں۔ تو جو شخص فرائض کا خیال بھی رکھے اور سنت کا خیال بھی رکھے، پھر اللہ سے بھی ڈرے اور خدا کی مخالفت بھی نہ کرے۔ تو ﴿فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ﴾ اس کے کامیاب ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے؟

آیتِ استخلاف:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ﴾

اس آیت کو ”آیتِ استخلاف“ کہتے ہیں۔ یہ بہت اہم مسئلہ ہے، تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر سبق ہو گا ان شاء اللہ لیکن ابھی اس کا خلاصہ سمجھیں!

قرآن کریم میں اللہ پاک نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کن کن صحابہ کو خلافت دینے کا وعدہ فرمایا ہے؟ جسے ہم کہتے ہیں کہ صحابہ کرام میں سے خلفائے راشدین کون ہیں جن کی خلافت کا وعدہ اس آیت میں ہے؟

خلفائے راشدین چار ہیں:

اھل السنۃ والجماعۃ کا مسلک یہ ہے حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم۔ خلافت راشدہ حق چار یار ہیں، تو خلافت راشدہ کا مصداق چار خلفائے راشدین ہیں۔

دلیل یہ آیتِ استخلاف ہے: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ﴾ اللہ نے وعدہ کیا ان ایمان والوں سے جو تم میں سے ہیں۔ یہ ﴿مِنْكُمْ﴾ کا خطاب جب ہوا تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس وقت کلمہ پڑھ کر مسلمان نہیں ہوئے تھے، لہذا وہ ﴿اٰمَنُوْا مِنْكُمْ﴾ میں شامل نہیں ہیں۔ حسنین کریمین ابھی نابالغ بچے تھے تو وہ بھی ﴿اٰمَنُوْا مِنْكُمْ﴾ میں داخل نہیں تھے۔ اس لیے یہ صرف چار خلفاء کے ساتھ خاص ہے۔ تو اللہ رب العزت اس آیت میں فرماتے ہیں:

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ہیں ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں ضرور زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو بنایا تھا اور ان کے لیے اس دین کو ضرور اقتدار بخشے گا جسے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ان کو جو خوف لاحق رہا ہے اس کے بدلے انہیں ضرور امن عطا کرے گا۔ وہ میری عبادت کریں، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور جو لوگ اس کے بعد بھی ناشکری کریں گے تو ایسے لوگ نافرمان شمار ہوں گے۔

تو جب یہ نعرہ لگے ”خلافتِ راشدہ“ تو جواب کیا دیتے ہیں؟ حق چار یار! خلافت راشدہ... حق چار یار! نعرہ لگانا سیکھو اور جب مسئلہ سمجھانا ہو تو مسئلہ سمجھانا سیکھو!

نعروں کا جواب کیسے دیا جائے؟

بعض مواقع پر نعرے لگتے ہیں تو میں فوراً تردید نہیں کرتا بلکہ میں سمجھایا کرتا ہوں۔ مثلاً نعرۂ تکبیر... اللہ اکبر لگتا ہے، اسی طرح ”نعرۂ رسالت“ لگتا ہے تو بعض نئے نئے لوگ ہوتے ہیں وہ ”یا رسول اللہ!“ کہہ دیتے ہیں، میں فوراً تردید نہیں کرتا، بلکہ میں بات سمجھاتا ہوں، میں کہتا ہوں کہ بھائی! نعرہ کا جواب صحیح وہ دیتا ہے جو نعرے کو سمجھے، جو نعرے کو نہ سمجھے وہ صحیح جواب نہیں دیتا۔ اب ”نعرۂ تکبیر“ کا جواب ”اللہ

اکبر"، "نعرۂ رسالت" کا جواب بعض کہتے ہیں "محمد رسول اللہ" اور بعض کہتے ہیں "یارسول اللہ" اور جب "خلافتِ راشدہ" کا نعرہ لگے تو بعض کہتے ہیں "حق چار یار" اور بعض کہتے ہیں کہ "حق سارے یار"۔ یہ دو قسم کے جواب چلتے ہیں۔ اب نعرہ سمجھیں گے تو جواب صحیح دیں گے، نعرہ صحیح نہیں سمجھیں گے تو جواب کیسے صحیح دیں گے؟

جب ایک شخص کہتا ہے کہ "نعرۂ تکبیر" تو وہ آپ سے پوچھتا ہے کہ بتاؤ! سب سے بڑا کون ہے؟ تو جواب کیا دیں گے؟ "اللہ اکبر"۔ پھر وہ کہتا ہے کہ "نعرۂ رسالت" تو پہلے سوچو کہ نعرے والا پوچھتا کیا ہے؟ "نعرۂ رسالت" والا پوچھتا ہے کہ تمہارا رسول کون ہے؟ تو جس کا رسول "محمد" ہے، صلی اللہ علیہ وسلم، وہ کہتا ہے کہ "محمد رسول اللہ" اور جس کا رسول "یا" ہے وہ کہتے ہیں "یارسول اللہ"۔ اب آپ کے رسول کون ہیں؟ (محمد رسول اللہ۔ سامعین) تو پھر "نعرۂ رسالت" کا جواب کیا ہونا چاہیے؟ (محمد رسول اللہ۔ سامعین)

اب دیکھیں! اہلِ بدعت پر رد ہو رہا ہے لیکن رد اس طرح نہیں ہو رہا کہ بھڑک اٹھیں، کفر کا فتویٰ دے کر ان کو مقابلے میں کھڑا کر دیں۔ پھر ہم نے کہا کہ جب "خلافتِ راشدہ" لگتا ہے تو جواب میں کوئی کہتا ہے کہ "حق چار یار"، کوئی کہتا ہے کہ "حق سارے یار"۔

جو شخص کہتا ہے کہ "خلافت راشدہ" تو وہ آپ سے پوچھتا ہے کہ وہ صحابہ بتاؤ جن کی خلافت کا وعدہ اللہ نے قرآن میں کیا ہے! اگر سب سے کیا ہے تو جواب "سارے یار" ہے، اگر چار سے کیا ہے تو جواب "چار یار" ہیں۔ تو جب کہیں کہ "خلافت راشدہ" تو جواب کیا دیں گے؟ (حق چار یار۔ سامعین) "نعرۂ تکبیر" کا جواب کیا دیں گے؟ اللہ اکبر، "نعرۂ رسالت" کا جواب کیا دیں گے؟ (محمد رسول اللہ۔ سامعین)

ایک اشکال کا جواب:

لوگ دھوکہ بڑا سخت دیتے ہیں اور دلیل اتنی عجیب دیتے ہیں کہ عام بندہ بالکل بے بس ہو جاتا ہے۔ دلیل ان کی کیا ہے؟ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن چھ ماہ کے لیے خلیفہ بنے تھے تو وہ بھی تو خلیفہ تھے! حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی خلیفہ ہیں اور ان کے دور میں حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کچھ وقت کے لیے مکہ مکرمہ کے خلیفہ بنے ہیں۔ حضرت ابو بکر بھی خلیفہ، حضرت عمر بھی خلیفہ، حضرت عثمان بھی خلیفہ، حضرت علی بھی خلیفہ، حضرت حسن بھی خلیفہ، حضرت امیر معاویہ بھی خلیفہ اور حضرت عبد اللہ بن زبیر بھی خلیفہ، تو یہ خلفاء چار تو نہیں، خلفاء سات ہیں، اور اگر قرآن سے پوچھو تو قرآن کہتا ہے: ﴿أُولَٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝﴾[53] کہ وہ سارے راشد بھی ہیں۔ تو ان سات صحابہ میں سے ساتوں خلفاء بھی ہیں اور راشد بھی ہیں، اس لیے ہم ان سات کو "خلیفہ راشد" کہتے ہیں۔

اب دیکھو! بظاہر کتنی مضبوط دلیل ہے! بندہ اسے فوراً قبول کرتا ہے۔

ہم نے کہا کہ بات یوں نہیں ہے۔ یہ خلفاء بھی ہیں اور یہ راشدین بھی ہیں، اس پر اعتراض نہیں ہے، اصل بات یہ ہے کہ "خلافتِ راشدہ" یہ شریعت کی خاص اصطلاح ہے، جس کا خاص معنی ہے اور اس میں الجھن نہیں ہے۔ مثلاً "عشرہ مبشرہ بالجنۃ" یہ کتنے ہیں؟ دس ہیں یا سارے؟ (دس۔ سامعین) آپ کہتے ہیں کہ صحابہ میں سے دس ہیں کہ جن کو جنت کی بشارت دی ہے، دوسرا کہتا ہے کہ جھوٹ ہے، کیونکہ

53۔ الحجرات 7:49

قرآن کریم میں ہے: ﴿وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ﴾[54] اللہ نے سب کو جنت کی بشارت دی ہے تو آپ عشرہ مبشرہ کیوں کہتے ہو؟ اس لیے یہ نہ کہا کرو کہ یہ دس مبشرہ ہیں بلکہ کہو کہ سارے مبشرہ ہیں۔ تو دس کو جنت کی بشارت دی ہے یا سب کو دی ہے؟ (سب کو دی ہے۔ سامعین) تو آپ ”عشرہ مبشرہ“ کیوں کہتے ہیں؟ تو جس طرح آپ نے یہ کہا کہ خلفاء بھی ہیں اور راشد بھی ہیں، لہٰذا سات خلفائے راشدین ہیں، آپ چار کیوں کہتے ہیں؟ تو آپ سے بھی کوئی بندہ کہے گا کہ سب کو جنت کی بشارت دی ہے تم ”عشرہ مبشرہ بالجنۃ“ کیوں کہتے ہو؟

ہم نے کہا کہ تمام صحابہ کرام جنتی ہیں لیکن جب ہم ”عشرہ مبشرہ بالجنۃ“ کہتے ہیں تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے ایسے صحابہ کہ جن کا نام ایک مجلس میں لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی فرمایا وہ دس ہیں۔ ویسے تو جنتی سارے ہیں۔ اب یہ سات خلفاء بھی ہیں اور ساتوں راشد بھی ہیں لیکن ”خلفائے راشدین“ سے مراد صحابہ کرام میں وہ صحابہ ہیں کہ جن کے بارے میں آیتِ استخلاف میں اللہ نے خلافت کا وعدہ کیا اور وہ سات نہیں بلکہ وہ چار ہیں۔

اب اس کے ساتھ تھوڑا سا اور اضافہ کر لو کہ جب ہم کہتے ہیں ”خلافتِ راشدہ“ تو اس سے مراد ہوتا ہے ”خلافتِ راشدہ موعودہ فی القرآن“ یعنی ایسی خلافت جس کا وعدہ قرآن میں کیا گیا ہے وہ چار کے ساتھ ہے، وہ سب کے ساتھ نہیں ہے ورنہ تو آیتِ استخلاف قیامت تک آنے والے ہر خلیفہ کو شامل ہو جائے گی، اللہ نے کسی کا نام تو نہیں لیا نا؟ جو بھی امام ہے اعمال صالحہ کرتا ہے اور شریعت کے مطابق حکومت کرتا ہے تو وہ خلیفہ ہو گا۔

54۔ الحدید 10:57

تو "خلفائے راشدین" شریعت کی ایک اصطلاح ہے جس سے مراد چار ہیں، باقی سات کو ہم خلیفہ بھی کہہ دیں گے، راشد بھی کہہ دیں گے لیکن اصطلاحی خلافت راشدہ نہیں ہے، اس لیے ہم دونوں میں فرق کرتے ہیں کہ چار خلفاء کی خلافت "خلافتِ راشدہ" ہے اور باقی تین کی خلافت: خلافت عادلہ ہے۔ یہ فرق کر لیتے ہیں تاکہ الجھن نہ ہو۔

تین اوقات میں اجازت لے کر جاؤ!

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَ الَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَ حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَ مِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ﴾

پہلے حکم یہ تھا کہ جب کسی کے گھر میں داخل ہو تو سلام کرو اور اجازت لو، اب حکم ہے ان لوگوں کے لیے جن کا گھر میں آنا جانا رہتا ہے کہ وہ کس وقت اجازت لیں اور کس وقت بغیر اجازت کے آئیں؟ فرمایا کہ صبح فجر سے پہلے کا وقت اور دوپہر کو سونے کا وقت اور عشاء کے بعد گھر میں آرام کا وقت ہے۔ عام طور پر جب ان تین وقتوں میں بندہ سوتا ہے تو بدن کے زائد کپڑے اتار دیتا ہے، عام حالات میں کبھی کبھی بندہ سونے کے لیے جائے تو قمیص اتارتا ہے اور لنگی پہنتا ہے تو شلوار بھی اتار دیتا ہے، زائد کپڑے اترے ہوئے ہوتے ہیں، اس وقت بندہ نامناسب حالت میں ہوتا ہے، اس لیے ایسے وقت حکم دیا کہ جب جاؤ تو یہ تمہارے ستر کے اوقات ہیں، ڈھانپنے کے وقت ہیں ایسے وقت میں اجازت کے بغیر نہ جایا کرو، بلکہ اجازت لے کر جایا کرو۔

﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَ لَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ ﴾

ان اوقات کے علاوہ آنا جانا ہو تو کوئی حرج نہیں ہے اور یہ حکم محارم کے لیے

بیان ہو رہا ہے، اجنبی کے لیے نہیں ہے۔ اجنبی کے لیے تو ویسے جانا جائز ہی نہیں ہے۔

﴿طَوّٰفُوْنَ عَلَیْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ﴾

ان کا ہر وقت تمہارے گھروں میں آنا جانا رہتا ہے، تم اتنی بار اجازت کیسے لو گے؟ لیکن ان وقتوں میں ذرا خیال کیا کرو!

﴿وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْیَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ اور جب نابالغ بچے بالغ ہو جائیں تو ان وقتوں میں وہ بھی اجازت لیں جیسے دوسرے بڑے لوگ اجازت لیتے ہیں۔

﴿وَ الْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ ؕ﴾

اور ایسی بوڑھی عورت کہ جو نکاح کی امید نہیں رکھتی یعنی ایسی حالت میں ہے کہ نکاح کی رغبت ان میں ختم ہو گئی ہے تو ان پر کوئی حرج نہیں ہے کہ اپنے زائد کپڑے اتار دیں۔ "زائد" کی قید ذہن میں رکھنا! ایسی بوڑھی عورت زائد کپڑے اتاریں، ﴿غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ﴾ اس کا مقصد پھر بھی زینت کا دکھانا مقصود نہ ہو۔ زائد کپڑے سے مراد یہ ہے کہ جو اپنے چہرے کا کپڑا ہے اس کو اتار دیں تو کوئی حرج نہیں ہے، زنیت پھر بھی مقصود نہ ہو۔ بعض نے ان میں سے ہتھیلی اور پاؤں کو بھی خارج کیا ہے کہ اس حالت میں رہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کے حق میں اجنبی؛ محارم کی طرح ہوتا ہے۔ جس طرح محرم دیکھ سکتا ہے اجنبی بھی دیکھ سکتا ہے۔ اب اندر کی شہوت اس کا اللہ اور بندے کے درمیان کا معاملہ ہے۔

معذورین کے کھانے کا مسئلہ:

﴿لَیْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِیْضِ

﴿حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ﴾

بعض حضرات کی خواہش ہوتی ہے کہ ایک نابینا ہے اس کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلائیں، لنگڑا ہے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلائیں، کوئی اور بیمار ہے تو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلائیں لیکن الجھن پیش ہوتی کہ جب اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھائیں گے تو نابینا نے کا خیال ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ مجھے کھانے کی تمیز نہیں، میں زیادہ کھالوں، ہو سکتا ہے کہ میں اچھی چیز کھالوں اور دوسری چھوڑ دوں۔ اور جو لنگڑا اور مریض ہوتا ہے تو وہ خیال کرتا ہے کہ مریض کے ساتھ لوگ بیٹھ کر کھانا پسند نہیں کرتے، مجھے مروّت میں شاید ساتھ تو بٹھا دیں لیکن ہو سکتا ہے کہ دل سے نہ چاہتے ہوں۔ یہ خلجان تھے۔ اللہ نے سارے خلجان ختم فرمادیے۔

فرمایا کہ کوئی معذور ہو، لنگڑا ہو، نابینا ہو تو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاؤ تب بھی حرج نہیں ہے، اپنے والد کے گھر سے کھلاؤ تب بھی حرج نہیں ہے، امی کی گھر سے کھلاؤ تب بھی حرج نہیں ہے، بھائی کے گھر سے کھلاؤ تب بھی حرج نہیں ہے، بہن کے گھر سے کھلاؤ تب بھی حرج نہیں ہے، اپنے چچا اور ماموں اور پھوپی کے گھر سے کھلاؤ تب بھی حرج نہیں ہے، یا اپنے قریبی بے تکلف دوست کے دستر خوان سے کھلاؤ تب بھی حرج نہیں ہے۔ یہ وہ رشتے ہیں جو عام طور پر کھانا کھانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے اور دل میں گھٹن محسوس نہیں کرتے تو ایسی جگہ پر خود کھاؤ یا ان کو ساتھ بٹھاؤ اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

جن کے گھروں کی چابیاں ہوں وہاں سے کھانے کا حکم:

﴿اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ﴾

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول تھا کہ جب جہاد پر جاتے تھے تو اپنے گھر کی چابیاں کسی معذور کو دیتے کہ تم اس کا خیال رکھو اور جو کھانا چاہو تو وہ کھا بھی

سکتے ہو لیکن وہ کبھی کھاتے نہیں تھے کہ ہو سکتا ہے کہ مروت میں کہا ہو کہ میں کھاؤں! تو وہ کھانا نہیں کھایا کرتے تھے۔ اللہ رب العزت نے فرمایا: ﴿اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ﴾ کہ جن کے گھر کی چابیاں تمہارے پاس ہیں وہ تمہیں دے کر گئے تو تم کھانا چاہو تو کھا سکتے ہو۔

پیغمبر کو ایسے نہ پکارو!

﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾﴾

یہ آیات خاص طور پر غزوۂ خندق کے موقع پر نازل ہوئی ہیں جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے ساتھ ملایا تھا اور سب نے مل کر خندق کھودی تھی۔

اللہ پاک نے فرمایا کہ ان سب کو بلائیں اور صحابہ کرام سے فرمایا کہ نبی کے بلانے کو اپنے بلانے کی طرح نہ سمجھنا کہ کسی نے بلایا اور دل چاہے تو جائے اور دل نہ چاہے تو نہ جائے، بلکہ پیغمبر نے بلایا ہے تو پھر ضرور جانا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ آپ ان کو بلائیں اور اپنے ساتھ کام پر لگائیں! اور نبی کو ہدایت دی ہے کہ اگر ان میں سے کسی کو ضرورت ہو اور وہ جانا چاہے تو اس کو اجازت دے دیجیے!

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ پیغمبر بلائیں تو ضرور جانا اور پیغمبر سے فرمایا کہ اگر کوئی اجازت مانگے تو اجازت دے دینا! یوں دونوں کی رعایت فرمائی ہے۔

پہلے تو ان کو سمجھایا کہ ﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ﴾ کہ نبی کے بلانے کو اپنی طرح نہ سمجھنا اور بعض نے معنیٰ کیا کہ ﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ

كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ﴾ کہ پیغمبر کو ایسے نہ بلانا جیسے ایک دوسرے کو بلاتے ہو! اگر ﴿دُعَآءَ الرَّسُوْلِ﴾ سے مراد ہو پیغمبر کو بلانا تو یہ "دعا" مصدر ہے جس کی نسبت فاعل کی طرف ہوگی یعنی پیغمبر کا بلانا، اور اگر مراد یہ ہو کہ نبی کو نہ بلاؤ جیسے آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو پھر "دعا" مصدر ہوگا جس کی نسبت مفعول کی طرف ہے۔ دونوں احتمال اس میں موجود ہیں۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنے استاذ، اپنے شیخ، اپنے بڑے اور اپنے گھر کے بزرگ آدمی ان کو نام لے کر ایسے نہ بلاؤ جیسے اپنے دوستوں کے نام لے کر بلاتے ہو، ادب کے ساتھ انہیں پکارا کرو۔

کوئی جانے کی اجازت مانگے تو دے دیں!

﴿فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٦٢)﴾

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ جب آپ سے اجازت مانگیں تو آپ ان کو اجازت دے دیا کریں! اب اس میں شبہ تھا کہ ایک طرف پیغمبر نے بلایا ہے اور ایک طرف ان کی اپنی حاجت ہے تو اپنی حاجت کو پیغمبر کے بلانے پر قربان کیوں نہیں کرتے؟ فرمایا یہ بات ایمان کے خلاف نہیں ہے۔ بسا اوقات انسان کی حاجات ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کو جانا پڑتا ہے۔ تو آپ سے اجازت لیں تو آپ ان کو اجازت دے دیا کریں۔

لیکن اتنی بات ارشاد فرمائی کہ ﴿فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ﴾ آپ اجازت دیں جس کو چاہیں اور جس کو نہ چاہیں تو آپ اجازت نہ دیں۔ آپ اجازت دینے کے پابند نہیں ہیں۔

اجازت دینے کے بعد استغفار کا حکم کیوں؟

﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ۭ﴾

آپ اجازت بھی دیں اور پھر اللہ سے معافی بھی مانگیں! اجازت دے کر اللہ سے معافی مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف پیغمبر نے بلایا ہے اپنے کام کے لیے اور ایک طرف گھر کی ضرورت کے لیے ان کو جانا پڑتا ہے۔ اب بظاہر یہ ہے کہ پیغمبر کے بلانے کے بعد گھر کے کام کے لیے نہیں جانا چاہیے لیکن بشری تقاضے ہیں، ان کی ضرورتیں ہیں تو آپ اجازت بھی دے دیا کریں اور ان کے لیے اللہ سے معافی بھی مانگا کریں۔

بسا اوقات انسان سمجھتا ہے کہ میرا گھر جانا بہت ضروری ہے اور یہ اس کی اجتہادی خطا ہوتی ہے۔ اگر وہ نہ بھی جائے تو کام چل سکتا ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ میں نہ جاؤں تو کام نہیں ہوگا۔ فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ اس کے اجتہاد میں خطا ہو تو آپ ان کے لیے معافی بھی مانگیں تاکہ ان کی اجتہادی خطا پر بھی گرفت نہ ہو۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ اللہ تو معاف فرماتے ہیں۔

منافقین کی حرکتیں:

﴿قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ﴾

یہ منافقین کے بارے میں ہے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر بلایا گیا۔ مؤمنین سارے جمع ہو جاتے لیکن منافقین کھسک جاتے تھے۔

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦٣﴾﴾

یہ جو پیغمبر کی بات نہیں مانتے اور چھپ چھپ کر کھسکتے ہیں، ان کو بچنا چاہیے

فتنہ میں مبتلا ہونے سے اور ان کو بچنا چاہیے اللہ کے عذاب سے۔

﴿اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَ يَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٦٤﴾﴾

جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے سب کچھ اللہ کا ہے، اللہ جانتے ہیں جس حالت میں تم ہو اور اللہ جانتے ہیں جس حالت میں تمہیں لوٹایا جائے گا اور اللہ پھر ان کو ان کے اعمال کی خبر دے گا۔ اللہ ہر چیز کو جاننے والے ہیں۔

بس دعا کریں کہ اللہ ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم والا ذوق اور جذبہ عطا فرمائے اور منافقین کے طرزِ عمل سے ہم سب کو محفوظ فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الفرقان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ۙ﴿۱﴾﴾

برکت مطلوب نہ کہ کثرت:

”تَبٰرَکَ“ یہ برکت سے مشتق ہے۔ عربی زبان میں دو لفظ استعمال ہوتے ہیں: ایک برکت اور دوسرا کثرت۔

”برکت“ کا معنی ہوتا ہے کہ چیز کی مقدار کم ہو اور فوائد زیادہ ہوں، ”کثرت“ کا معنی ہوتا ہے کہ مقدار زیادہ ہو اور فوائد کم ہوں۔ شریعت میں کثرت مطلوب نہیں، برکت مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿کَمۡ مِّنۡ فِئَۃٍ قَلِیۡلَۃٍ غَلَبَتۡ فِئَۃً کَثِیۡرَۃًۢ بِاِذۡنِ اللّٰہِ﴾[55]

کتنی ایسی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔

﴿لَقَدۡ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ فِیۡ مَوَاطِنَ کَثِیۡرَۃٍ ۙ وَّ یَوۡمَ حُنَیۡنٍ ۙ اِذۡ اَعۡجَبَتۡکُمۡ

55۔ البقرۃ 249:2

کَثْرَتُکُمْ﴾ [56]

اللہ نے کئی مقامات پر تمہاری مدد کی ہے اور جنگ حنین میں بھی اس نے تمہاری مدد کی ہے جب تمہیں تمہاری کثرت پر ناز تھا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخری دنوں میں خطبہ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ أَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيمٌ شَهْرٌ مُبَارَكٌ. [57]

کہ ایک ایسا مہینا آرہا ہے جو ایک عظیم مہینا ہے اور برکت والا مہینا ہے۔

یہاں بھی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہینے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے برکت کی بات کی ہے۔ "شَهْرٌ مُبَارَكٌ" کہ یہ بابرکت مہینا ہے۔

اس پر میرا پورے ایک گھنٹے کا ایک بیان ہے، آپ اسے سن لیں۔ یہ متن ہے آگے اس کی شرح ہے۔

اگرچہ "کثرت" بعض مقامات پر اللہ کی بہت بڑی نعمت بھی ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ﴾ [58]

تم اس وقت کو یاد کرو جس وقت تم تھوڑے تھے تو اللہ نے تمہیں زیادہ کر دیا۔

دشمن کے مقابلے میں تعداد زیادہ ہو جانا یہ اللہ کی نعمت ہے۔ آدمی کے ماننے

56۔ التوبۃ9:25

57۔ صحیح ابن خزیمۃ: ج2 ص911 باب فضائل شھر رمضان

58۔ الاعراف7:86

والے تھوڑے ہوں اور اللہ زیادہ بنا دیں تو یہ اللہ کی نعمت ہے لیکن عام طور پر کثرت مطلوب نہیں ہوتی بلکہ برکت مطلوب ہوتی ہے۔

تو جب بھی کسی شخص کو دعا دیں تو زندگی میں کثرت کی دعا نہ دیں، برکت کی دعا دیا کریں۔ برکت اور کثرت میں فرق ہمیشہ ذہن میں رکھیں۔

حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب:

﴿نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ﴾

کتاب اللہ کا ایک نام جس طرح قرآن ہے اسی طرح ایک نام "فرقان" بھی ہے اور فرقان کہتے ہیں کہ جو حق اور باطل میں قوتِ دلیل کے ساتھ فرق کرے۔ قرآن کریم دلائل کی قوت سے باطل کو حق سے الگ کرتا ہے اس لیے اس کو فرقان کہتے ہیں۔

دلیل ختمِ نبوت:

﴿لِيَكُوۡنَ لِلۡعٰلَمِيۡنَ نَذِيۡرَا﴾

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو "لِلۡعَالَمِ نَذِيۡرًا" نہیں فرمایا بلکہ "لِلۡعٰلَمِيۡنَ نَذِيۡرًا" فرمایا اس بات کو سمجھانے کے لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک عالم کے لیے پیغمبر نہیں ہیں بلکہ عالمین کے لیے پیغمبر ہیں۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت اور عظمت نبوت پر دلیل ہے کہ باقی انبیاء علیہم السلام ایک عالم کے یا ایک قوم کے نبی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم عالمین کے نبی ہیں۔ تو اس کے بعد کسی اور نبی کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

نبوت ایک بستی سے شروع ہوتی... ایک شہر، ایک ملک، ایک عالم، پھر عالمین۔ کوئی نبی ایک بستی کا ہے، کوئی ایک شہر کا ہے، کوئی ایک ملک کا ہو گا اور حضور

صلی اللہ علیہ وسلم عالمین کے نبی اور رسول ہیں۔ تو آپ کی نبوت میں وسعت اتنی زیادہ ہے کہ اس کے بعد مزید نبوت کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ جب نبوت اپنے تمام تر کمالات اور درجات کو پہنچ جائے تو اس کے بعد مزید نبی کی ضرورت نہیں ہے۔ تو اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر بھی دلیل ہے۔

مشرکین کے ایک اعتراض کا جواب:

﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ٰافْتَرٰىهُ وَ اَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا ۚ﴾

مشرکین کا ایک اعتراض یہ تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو قرآن اتر رہا ہے یہ آپ خود گھڑتے ہیں۔ مشرکین کہتے تھے: ﴿اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۝﴾ کہ یہ تو پہلے لوگوں کی باتیں ہیں جو آپ نے صحابہ کو لکھوائی ہیں اور صبح و شام وہی آپ کے سامنے پڑھ پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں۔

اس کا اللہ رب العزت نے جواب دیا ہے:

﴿قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾

کہ اے میرے پیغمبر! آپ فرما دیجیے کہ قرآن میری طرف سے نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

قرآن مجید کا چیلنج:

اور اللہ کی طرف سے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ پاک نے چیلنج دیا ہے:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ

لَا يَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾[59]

اگر تم کہتے ہو کہ یہ قرآن خدا کی طرف سے نہیں ہے تو جن وانس سارے جمع ہو جاؤ اور اس جیسی کتاب لا سکتے ہو تو لاؤ!

یہ چیلنج کیسے دیا ہے؟ یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں۔ دنیا میں بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جس جیسی چیز انسان بنا سکتے ہیں اور بعض ایسی ہیں کہ جس جیسی چیزیں انسان نہیں بنا سکتے۔ اب دیکھیں! میرے سر پر ٹوپی ہے، اس جیسی کروڑوں ٹوپیاں انسان بنا سکتے ہیں لیکن اس ٹوپی کے نیچے بال ہیں، کروڑوں انسان مل کر بھی ان جیسا ایک بال بھی نہیں بنا سکتے یعنی ایسا بال جو انسانی بدن میں ہو اور خود بخود بڑھے۔ ہمارے ہاتھ میں گھڑی ہے۔ اس جیسی کروڑوں گھڑیاں انسان بنا سکتے ہیں لیکن جس ہاتھ پر ہے اس ہاتھ جیسا ایک ہاتھ کروڑوں بندے مل کر بھی نہیں بنا سکتے۔

تو جس جیسی چیز انسان بنا سکے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو بھی انسان نے بنایا ہے اور جس جیسی چیز انسان نہ بنا سکے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو بھی انسان نے نہیں بنایا بلکہ اللہ نے بنایا ہے۔ اس لیے اللہ پاک نے فرمایا کہ اگر تمہارا دعویٰ یہی ہے کہ قرآن کریم میری کتاب نہیں تو تم اس جیسی بنا کر دکھاؤ! تو اس جیسی کتاب نہ بنا سکنا اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن بھی اللہ کی کتاب ہے، کسی بندے کی نہیں ہے۔

مشرکین کے دوسرے اعتراض کا جواب:

﴿وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝۷﴾

اس میں دوسرے اعتراض کا جواب ہے۔ ان کا ایک اعتراض یہ تھا کہ یہ کیسا

59۔ بنی اسرائیل 88:17

نبی ہے جو کھاتا بھی ہے، پیتا بھی ہے، بازاروں میں چلتا بھی ہے، فرشتہ بھی نہیں اور اس کے پاس خزانہ بھی نہیں؟ اگر نبی ہوتا تو اس کے ساتھ ملائکہ ہوتے، پیغمبر ہوتا تو یہ نہ کھاتا نہ پیتا۔ اللہ رب العزت نے اس اعتراض کا پہلے اجمالی جواب دیا:

﴿اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝۹﴾

دیکھو! یہ کیسے نکمی مثالیں پیش کرتے ہیں کہ نبی ہوتا تو اس کے ساتھ فرشتہ ساتھ ہوتا۔ لیکن اگر پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ فرشتہ ہوتا تو پھر یہی لوگ کہتے کہ اس کے فرشتہ ہونے پر کیا دلیل ہے؟ اگر نبی ہوتا اور نہ کھاتا تو یہ کہتے کہ ہم کھاتے ہیں تو ہمارا نبی تو وہ ہونا چاہیے کہ جو کھانے والا ہو! یہ کیسی باتیں کرتے ہیں؟ تو یہ اجمالی جواب دیا ہے۔

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ۝۱۰﴾

یہاں سے پھر تفصیلاً جواب دیا ہے کہ اللہ چاہتے تو باغات جاری کر دیتے، اللہ چاہتے تو خزانے نازل فرما دیتے، اللہ کے لیے مشکل نہیں تھا لیکن یہ دنیا دار الابتلاء ہے، دار الامتحان ہے۔ اگر پیغمبر کے ساتھ خزانے ہوں پھر لوگ کلمہ پڑھیں گے تو خزانے دیکھ کر پڑھیں گے، ایمان بالغیب کبھی نہیں لائیں گے۔ تو اللہ فرماتے ہیں کہ ہم یہ کر سکتے ہیں لیکن ہم نے کیا نہیں ہے۔

امام صاحب قاضی القضاۃ نہیں بنے تو شاگرد کیوں بنا؟

پہلے میں ایک سوال کا جواب دیتا ہوں، اس پر پھر بات سمجھ آئے گی۔

مَیں جدہ میں تھا تو مجھے ایک شخص نے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو خلیفۂ وقت نے چیف جسٹس - قاضی القضاۃ - بننے کے لیے منصب

پیش کیا تو امام صاحب نے قبول نہیں کیا۔ اس نے امام صاحب رحمہ اللہ کو کوڑے مارے پھر بھی قبول نہیں کیا۔ حضرت امام صاحب کو جیل میں ڈالا پھر بھی قبول نہیں کیا۔ زہر دے کر امام صاحب کو شہید کر دیا، امام صاحب نے آخر وقت تک اس عہدہ کو قبول نہیں کیا۔ آپ بتاؤ کہ جس امام کے ہم مقلد ہیں اس امام کا جنازہ جیل سے اٹھا ہے یا کسی مسجد سے اٹھا ہے؟ (جیل سے۔ سامعین) اب اگر کوئی عالم جیل میں جائے تو اس کا ساتھ دینا چاہیے یا اس کو چھوڑ دینا چاہیے؟ (ساتھ دینا چاہیے۔ سامعین) لیکن ہم ایسا نہیں کرتے۔ مجھے دو مہینے جیل ہو جائے تو آپ میں سے پیچھے دس پندرہ رہ جائیں گے اور اگر داخلے سے پہلے جیل ہو جائے تو داخلہ کم ہو جائے گا، جو تعاون کرتے ہیں جب جیل آ جائے تو وہ تعاون چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ مولوی صاحب تو جیل جاتے ہیں۔

متکلمِ اسلام کا تعجب:

میری ایک کتاب پر کام چل رہا ہے ان شاء اللہ چھپ کر منظرِ عام پر آ جائے گی، اس کا نام ہے "تعجبات"۔ تو میرے تعجبات ہیں۔ ان میں سے ایک بہت بڑا تعجب یہ ہے کہ جب ہم اسٹیج پر اپنے اکابر علمائے دیوبند کی مدح کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایسے تھے کہ کچھ ریل میں اور کچھ جیل میں، لوگ پوچھتے کہ شاہ جی! کیا حال ہے؟ تو شاہ جی فرماتے: کیا پوچھنا! آدھی جیل میں کاٹی اور آدھی ریل میں کاٹی۔ تو اس کو فخر کے طور پر بیان کرتے ہیں اور جب ماننے کی بات آتی ہے تو اس کو مانتے ہیں جو ہمیشہ ریل میں ہو، اس کو نہیں مانتے جو کبھی ریل میں ہو کبھی جیل میں۔ بھائی! یا تو "جیل جانا اکابر کی شان ہے" ایسے بیان مت کرو اور اگر یہ اکابر کی شان ہے تو پھر ان کو مانو جو جیل جاتے ہیں، پھر ان کا ساتھ دو! مجھے تعجب ہے کہ کہتے کچھ اور ہیں کرتے کچھ اور ہیں۔

تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو شہید کر دیا گیا لیکن آپ نے قاضی القضاۃ کا

عہدہ قبول نہیں کیا۔ حضرت امام صاحب کی دلیل بہت عجیب تھی۔ حاکمِ وقت نے کہا کہ آپ چیف جسٹس کا عہدہ قبول کریں۔ آپ نے فرمایا کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ اس نے کہا کہ نہیں، آپ کو کرنا پڑے گا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ یہ جو میرا جملہ ہے کہ میں قاضی القضاۃ کے عہدے کا اہل نہیں ہوں میں یہ سچ بول رہا ہوں یا جھوٹ بول رہا ہوں؟ اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں تو جھوٹے آدمی کو قاضی نہیں بنانا چاہیے اور اگر میں سچ بول رہا ہوں تو نا اہل کو عہدہ نہیں دینا چاہیے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ کیسی عجیب دلیل ہے! خیر امام صاحب قاضی نہیں بنے۔

اس امت کے پہلے قاضی القضاۃ- چیف جسٹس- قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ ہیں۔ تو مجھ سے اس بندے نے سوال کیا کہ اگر قاضی القضاۃ بننا برا تھا تو امام ابو یوسف کیوں بنے؟ اگر بننا اچھا تھا امام ابو حنیفہ کیوں نہیں بنے؟

میں ایک اصول پیش کرتا ہوں اور اس پر بہت سارے عقائد اور مسائل چھیڑا کرتا ہوں۔ اصول یہ ہے کہ جب معصوم پر اعتراض ہو تو محفوظ کو پیش کرتے ہیں اور جب ماجور پر اعتراض ہو تو محفوظ کو پیش کرتے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم پر اعتراض ہو تو اس کا جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے مل جاتا ہے اور جب مجتہد پر اعتراض ہو تو اس کا جواب صحابی کی زندگی سے مل جاتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ صحابہ نے تو نبی کو دیکھا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کام کریں گے اور جو مجتہد ہے اس نے یا تو صحابہ کو دیکھا ہے یا بعد والے کو دیکھا ہے، تو ان کی زندگی پر جو اعتراض ہو وہ صحابہ کی زندگی سے ملے گا۔

تو میں نے ان سے کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں حکومت بھی دی، مدینہ منورہ میں آپ کو دولت بھی دی اور مدینہ منورہ میں اللہ نے آپ کو طاقت بھی دی۔ سوال یہ ہے کہ یہ تین چیزیں اللہ نے مکہ میں کیوں نہیں دیں؟

طاقت، دولت اور حکومت! اگر کوئی شخص پوچھے کہ یہ چیزیں بہتر تھیں تو مکہ میں کیوں نہیں دیں اور اگر بہتر نہیں تھیں تو مدینہ میں کیوں دی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا حق تھا کہ آپ کو دولت بھی ملتی، آپ کو حکومت بھی ملتی اور آپ کو طاقت بھی ملتی لیکن اگر مکہ میں مل جاتی تو صحابہ پر اعتراض ہوتا کہ انہوں نے کلمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں نہیں پڑھا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت کی وجہ سے پڑھا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کی وجہ سے پڑھا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طاقت کی وجہ سے پڑھا ہے۔ چونکہ یہ الزام ان پر لگ سکتا تھا اس لیے اللہ نے یہ تینوں چیزیں مکہ میں نہیں دیں۔ اب جو صحابہ کلمہ پڑھ رہے تھے تو خالص محبت پیغمبر میں پڑھ رہے تھے، کوئی حاکم تھا تو حکومت چھوڑ کر خدمت میں آ رہا ہے، جو طاقت والا تھا وہ حضور پر نثار ہو رہا ہے، جو مالدار تھا وہ مال کو لٹا کر آ رہا ہے تو صحابہ نے کلمہ مال اور حکومت کی وجہ سے نہیں پڑھا بلکہ اللہ کے نبی کی محبت میں پڑھا ہے۔ لیکن جب مدینہ میں آئے ہیں تو حق چونکہ انہی کا تھا اس لیے خدا نے حکومت بھی دی ہے، طاقت بھی ہے اور پھر دولت بھی دی ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ قاضی القضاۃ بن جاتے تو آج دنیا میں جو لوگ مسلمان ہیں کم از کم ساٹھ ستر فیصد ان میں حنفی ہیں اتنی اکثریت کے ساتھ احناف ہوتے تو لوگ کہتے کہ حنفیت کے پھیلنے کی وجہ یہ تھی کہ امام اعظم ابو حنیفہ چیف جسٹس تھا، طاقت تھی، قلم تھا اور علم تھا اس وجہ سے حنفی مذہب پھیل گیا۔ تو ان کا جنازہ جیل سے اٹھا اور شاگرد قاضی القضاۃ بنا ہے یہ بتانے کے لیے کہ حنفیت کے پھیلنے کی وجہ قاضی القضاۃ کا عہدہ نہیں ہے لیکن چونکہ حق انہی کا تھا اس لیے ان کے شاگردوں کو دیا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم دے سکتے تھے پیغمبر کو لیکن ہم نے دیا کیوں

نہیں؟ اس لیے کہ یہ دنیا دار الابتلاء اور دار الامتحان ہے، اس لیے ہم ان کو نہیں دیتے۔

عذاب کی خبر دینا خوش خبری کیسے ہے؟

﴿يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿٢٢﴾﴾

قیامت کے دن جب ملائکہ کو دیکھ لیں گے تو اس دن ان مجرمین کے لیے کوئی خوش خبری نہیں ہو گی یعنی خوش خبری نہیں ملے گی۔

بظاہر اعتراض ہوتا ہے کہ سورۃ آل عمران میں تو ہے: ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢١﴾﴾ کہ ان کفار کو عذاب کی بشارت دو اور یہاں فرماتے ہیں کہ قیامت کو ان کے لیے کوئی خوشخبری نہیں ہو گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جو فرمایا جا رہا ہے کہ قیامت کے دن ان کے لیے کوئی خوشخبری نہیں ہو گی اس کا معنی یہ ہے کہ جن چیزوں سے بندہ خوش ہوتا ہے وہ قیامت کے دن ان کو نصیب نہیں ہوں گی، بندہ راحت سے اور عزت سے خوش ہوتا ہے۔ نہ ان کو راحت ملے گی نہ عزت ملے گی۔

اور ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ میں عذاب کا معنی خوش خبری نہیں ہے، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ جب ان کو بار بار سمجھایا جا رہا ہے کہ تم یہ کام نہ کرو ورنہ عذاب ہو گا تو وہ کہتے کہ ہم عذاب بھگت لیں گے لیکن تمہاری بات نہیں مان سکتے۔ تو فرمایا کہ یہ خود عذاب پر خوش ہیں نا! تو ان کو عذاب کی خوش خبری دے دو۔

جیسے دنیا میں کوئی شخص کہتا ہے کہ دیکھو بیٹا! باہر نہ جانا ورنہ پکڑے جاؤ گے۔ وہ باہر چلا گیا اور پکڑا گیا۔ پھر بندہ تھانے جا کر اس سے ملتا ہے کہ اب خوش ہے نا؟ میں تجھے کہتا تھا نا کہ باہر نہ جاؤ! تو وہ خوش نہیں ہوتا لیکن اصل میں تنبیہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔

کاش میں فلاں کو دوست نہ بناتا!

﴿يٰوَيۡلَتٰى لَيۡتَنِىۡ لَمۡ اَتَّخِذۡ فُلَانًا خَلِيۡلًا ﴿۲۸﴾﴾

مکہ کے مشرکین میں عقبہ بن ابی معیط ایک مشرک سردار تھا۔ اس کی عادت یہ تھی جب سفر سے واپس آتا تو معزز لوگوں کی دعوت کرتا۔ اس نے دعوت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بلایا تو حضور بھی تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تُو اللہ کی وحدانیت اور میری رسالت کی گواہی دے تو میں تیرا کھانا کھاؤں گا وگرنہ نہیں کھاؤں گا۔ اس نے کلمہ پڑھ لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا کھالیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے گئے۔

عقبہ بن ابی معیط کا ایک گہرا دوست تھا ابی بن خلف۔ اس کو پتا چلا کہ عقبہ مسلمان ہو چکا ہے تو وہ سخت غصہ ہوا۔ وہ عقبہ کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ عقبہ! میں نے سنا ہے کہ تم نے کلمہ پڑھ لیا ہے؟ اس نے کہا کہ پڑھا تو ہے لیکن میری مجبوری تھی کہ مکہ کے معزز مہمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے ہوئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ تو کلمہ نہیں پڑھے گا تو میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ اگر میں نہ پڑھتا تو وہ کھانے سے اٹھ جاتے تو سارے لوگ اٹھ جاتے، یوں میری بہت بے عزتی ہو جاتی۔ تو میں نے اپنی عزت رکھنے کے لیے کلمہ پڑھ لیا تھا۔

ابی بن خلف نے کہا کہ تو جب تک ان کے چہرے پر نعوذ باللہ تھوکے گا نہیں میں تیری باتوں کو قبول نہیں کر سکتا اور ہماری دوستی نہیں چل سکتی، اب جا اور یہ کام کر! تو عقبہ گیا اور ابی بن خلف کے کہنے پر العیاذ باللہ یہ کام کر گزرا۔ پھر یہ دونوں بدر میں قتل ہوئے۔

تو فرمایا کہ یہی عقبہ قیامت کو یہی باتیں کرے گا: ﴿يٰوَيۡلَتٰى لَيۡتَنِىۡ لَمۡ

اَتَّخِذۡ فُلَانًا خَلِيۡلًا ﴿۲۸﴾ اے کاش! میں ابی بن خلف کو اپنا دوست نہ بناتا اور آج یہ جہنم اور ذلت کی سزا مجھے نہ بھگتنی پڑتی!

یہ واقعہ تو خاص ہے لیکن آپ یہ تو سمجھتے ہیں کہ اصول تفسیر کا ایک مسلمہ ضابطہ ہے: "اَلۡعِبۡرَۃُ بِعُمُوۡمِ اللَّفۡظِ لَا بِخُصُوۡصِ السَّبَبِ" آیات اپنے مورد کے ساتھ خاص نہیں ہوتی وہاں عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے اور شان نزول کے باہر بھی آپ اس کو بیان فرما سکتے ہیں۔ آج بھی جب انسان گناہ کرتا ہے تو اس گناہ کی بہت بڑی وجہ دوستی ہوتی ہے۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

تقدیر؛ علمِ الٰہی اور امرِ الٰہی دونوں کا مجموعہ ہے:

﴿وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ؕ وَ کَفٰی بِرَبِّکَ هَادِیًا وَّ نَصِیۡرًا ﴿۳۱﴾﴾

اللہ نے اپنے پیغمبر کو تسلی دی ہے کہ یہ جو آپ کے سامنے باتیں کرتے ہیں، الزام لگاتے ہیں، آپ کی بات نہیں مانتے تو آپ حوصلہ رکھیں! یہ معاملہ آپ کے ساتھ نہیں ہے بلکہ ہر نبی کے ساتھ ان کے دور میں ایسا ہوتا تھا۔

یہاں ایک سوال سمجھیں: ﴿وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ ہر دور میں ہر نبی کے لیے دشمن خود بناتے ہیں تو پھر دشمن کا کیا قصور ہے؟

اس سوال کا جواب سمجھنے سے پہلے تقدیر کا معنی سمجھیں! عام بندے سمجھتے ہیں کہ تقدیر صرف امر الٰہی کا نام ہے حالانکہ تقدیر صرف امرِ الٰہی کا نام نہیں ہے بلکہ علمِ الٰہی اور امرِ الٰہی دونوں کے مجموعے کا نام تقدیر ہے۔ اللہ کے علم میں تھا کہ میں فلاں بندے کو اختیار دوں گا تو وہ بندہ اپنے اختیار سے یہ کام کرے گا۔ یہ "علمِ الٰہی" ہوا، اور اللہ نے اس کو لکھ دیا کہ فلاں بندہ یہ کام کرے گا تو یہ "امرِ الٰہی" ہوا۔ اب علمِ الٰہی؛ امرِ

الٰہی کے خلاف ہو یا امرِ الٰہی؛ علمِ الٰہی کے خلاف ہو ایسا نہیں ہو سکتا۔ تو تقدیر صرف "علمِ الٰہی" کا نام نہیں بلکہ تقدیر علمِ الٰہی اور امرِ الٰہی کے مجموعے کا نام ہے۔ اور بندہ مجبور محض ہو ایسا بھی نہیں کیونکہ ہونا بندے کے اختیار کے ساتھ تھا۔ یہ ہے تقدیر کا معنی!

اب اشکال کا جواب سمجھیں کہ ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا﴾ کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے علم میں تھا کہ میں نبی بھیجوں گا، پھر لوگوں کو اختیارات دوں گا تو کچھ اختیار سے مانیں گے اور کچھ اختیار سے دشمن بنیں گے۔ تو خدا نے لکھ دیا کہ ہر نبی کے ساتھ دشمن ہوں گے۔ اس لیے نہیں کہ خدا نے لکھ دیا ہے تو دشمن ہو گئے بلکہ خدا کے علم میں تھا کہ ہوں گے تو لکھ دیا اور کوئی کام خدا کے علم کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہتے ہیں کہ اللہ کی تقدیر کے خلاف کچھ بھی نہیں ہوتا۔

خواہشات کو خدا بنانے کا معنی:

﴿اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۟ۙ﴾

یہاں اللہ رب العزت نے فرمایا کہ بہت سارے لوگ ہیں جو اپنی خواہش کو خدا بنا لیتے ہیں۔ اپنی خواہش کو خدا بنانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اللہ کی بات چھوڑے اور اپنی خواہش کے مطابق کام کرے۔

صفتِ ملکیت صفتِ بہیمیت:

﴿اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۟ۧ﴾

یہاں کفار کے بارے میں فرمایا کہ یہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ جانور سے بھی بدتر ہیں۔

اس کی دو وجوہات ذہن نشین فرما لیں! ایک وجہ تو میں عام طور پر پیش کرتا

ہوں۔ اللہ رب العزت نے انسان کی فطرت میں گناہ کرنے کا مادہ بھی رکھا ہے اور اس گناہ کو کنٹرول کرنے کی قوت بھی رکھی ہے۔ ہم اس کو سمجھانے کے لیے یوں کہتے ہیں کہ اللہ نے ہر بندے کی جبلت میں دو چیزیں رکھی ہیں:

1: ملکیت 2: بہیمیت

"ملکیت" کا معنی ہے فرشتہ پن اور بہیمیت کا معنی ہے ڈنگر پن۔ فرشتہ پن کا معنی مان کر چلنا اور ڈنگر پن کا معنی من مانی کرنا۔ تو جب انسان کے مزاج میں من مانی ہے اور جانور کے مزاج میں من مانی ہے تو جب یہ من مانی کرتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿كَالْاَنْعَامِ﴾ کہ یہ جانور کی طرح ہو گیا ہے کہ جانور کا کام من مانی کرنا تھا اور یہ بھی من مانی کر رہا ہے۔ مزید یہ کہ جانور کی فطرت میں مان کر چلنا نہیں تھا اور اس کی فطرت میں مان کر چلنا بھی تھا لیکن پھر بھی من مانی کر رہا ہے تو فرمایا ﴿بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا﴾ یہ جانور سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔

میں اس کی مثال دیتا ہوں۔ یہاں سرگودھا سے اسلام آباد ایک کوچ نان اے سی چلتی ہے اور ایک اے سی والی چلتی ہے۔ اے سی والی کوچ کا کرایہ زیادہ ہے۔ آپ اے سی کوچ میں پانچ سو روپے دے کر بیٹھتے ہیں۔ راستے میں اے سی کوچ کا ائیر کنڈیشن خراب ہو گیا۔ اب نان اے سی کی کھڑکیاں کھلی ہیں اور ہوا چل رہی ہے لیکن اے سی کوچ میں حبس ہے۔ کرایہ بھی زیادہ لیا۔ اب راستے میں آپ اے سی کوچ کو کیا کہتے ہیں کہ "یہ نان اے سی کی طرح ہے" یا "نان اے سی سے بھی بدتر ہے" نان اے سی سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ نان اے سی میں اے سی تھا بھی نہیں اور کام کرتا بھی نہیں تھا اور اس میں اے سی ہے اور پھر بھی کام نہیں کرتا تو یہ نان اے سی سے بدتر ہے۔

فرمایا: ﴿اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ﴾ کہ یہ جانوروں کی طرح ہیں ﴿بَلْ هُمْ

﴿اَضَلُّ سَبِيۡلًا﴾ یہ جانور کی طرح تو ہے کہ جانور من مانی کرتا ہے اور یہ بھی من مانی کرتا ہے لیکن جانور کے مزاج میں مان کر چلنا نہیں تھا اس لیے من مانی کرتا ہے اور اس کے مزاج میں مان کر چلنا تھا پھر بھی من مانی کرتا ہے تو یہ اس سے بھی بدتر ہے۔

زنانِ مصر کے جملے کی وضاحت:

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ آپ کے ذہن میں ہوگا۔ زلیخا کو جب مصر کی عورتوں نے طعنہ دیا تو زلیخا نے کہا کہ تم نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا ہے؟ کہا کہ نہیں دیکھا۔ اس نے کہا: تم نے اس غلام کو دیکھا نہیں، اگر دیکھ لیتی تو مجھے کبھی بھی طعنہ نہ دیتی۔ خیر اس نے دکھانے کے لیے دستر خوان لگایا۔ پھل رکھے چھریاں رکھیں۔ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَ اٰتَتۡ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنۡهُنَّ سِكِّيۡنًا﴾ اس نے ہر عورت کو چھری دے دی اور پھل رکھ دیے۔ یوسف علیہ السلام سے کہا: ﴿اخۡرُجۡ عَلَيۡهِنَّ﴾ آپ تشریف لائیں! یوسف علیہ السلام جب باہر آئے۔ نبی تھے، علم غیب نہیں ہے، کیا پتا کہ باہر کیا تماشا ہے۔ جب ان عورتوں نے دیکھا ﴿وَ قَطَّعۡنَ اَيۡدِيَهُنَّ﴾ تو اپنی انگلیاں کاٹیں اور زبان سے جملہ کہا: ﴿مَا هٰذَا بَشَرًا﴾ یہ بشر نہیں ہے۔ اب دیکھو! یوسف علیہ السلام بشر تھے اور یہ کہتی ہیں کہ بشر نہیں ہے اور پورے قرآن میں اللہ نے ان کے جملے کی تردید نہیں کی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا جملہ ٹھیک ہے۔

اب بظاہر یہ ہمارے اھل السنۃ و الجماعۃ احناف دیوبند کے عقیدے کے خلاف ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نبی ہیں اور ہم نبی کو بشر مانتے ہیں۔ وہ عورتیں ان کو بشر نہیں کہتیں اور قرآن تردید نہیں کر رہا تو جب قرآن کوئی بات ذکر کرے اور تردید نہ کرے تو وہ ہماری شریعت ہوتی ہے۔ تو جب تردید نہیں کی تو بظاہر پتا چلتا ہے کہ وہ جملہ ٹھیک تھا۔

ہم کہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام بشر یعنی انسان ہیں اور انسان کی فطرت میں تقاضا گناہ بھی ہوتا ہے اور تقاضائے گناہ کے کنٹرول کرنے کی طاقت بھی ہوتی ہے۔ تقاضائے گناہ کو "بہیمیت" کہتے ہیں اور تقاضائے گناہ کے کنٹرول کرنے کی طاقت کو "ملکیت" کہتے ہیں۔ تو جو ان عورتوں نے کہا تھا: ﴿مَا هٰذَا بَشَرًا﴾ تو اس میں بشریت کی نفی نہیں ہے بلکہ بشریت کی ضمن میں بہیمیت کی نفی ہے۔ مطلب یہ کہ یہ وہ بشر نہیں ہے جو گناہ کرتا ہو، دلیل یہ ہے کہ ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ یہ وہ بشر نہیں ہے جو گناہ کرے، یہ وہ بشر ہے جو گناہ نہ کرے، اور جو گناہ نہ کرے اسے "مَلَكٌ" کہتے ہیں، پھر صرف "مَلَكٌ" نہیں کہا بلکہ "مَلَكٌ كَرِيْمٌ" کہا۔ کیونکہ جس ذات کی طبیعت میں گناہ کا تقاضا نہ ہو اور وہ گناہ نہ کرے اسے "مَلَكٌ" کہتے ہیں اور جس ذات کی طبیعت میں گناہ کا تقاضا ہو اور پھر بھی گناہ نہ کرے تو اسے "مَلَكٌ كَرِيْمٌ" کہتے ہیں۔

ہم اہلِ بدعت سے کہتے ہیں کہ اگر یہ تمہاری دلیل ہے تو تمہارے دعویٰ کے مطابق تو نہیں ہے۔ کیونکہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ "نبی بشر نہیں ہوتا" لیکن تمہارا یہ دعویٰ تو نہیں کہ "نبی فرشتہ ہوتا ہے"۔ یہ تمہاری دلیل تب بنتی جب تمہارا دعویٰ ہوتا کہ نبی بشر نہیں ہوتا بلکہ فرشتہ ہوتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ "نبی فرشتہ نہیں ہوتا" اور وہ عورتیں کہہ رہی ہیں کہ "یہ فرشتہ ہے"... تو تردید جس طرح ﴿مَا هٰذَا بَشَرًا﴾ کی نہیں ہے اسی طرح تردید ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ کی بھی نہیں ہے تو بتاؤ! یہ تمہاری دلیل کیسے بنی؟

سائے کا کم زیادہ ہونا:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ

جَعَلۡنَا الشَّمۡسَ عَلَيۡهِ دَلِيۡلًا ﴿۴۵﴾

اللہ رب العزت نے اپنی قدرت بتائی ہے کہ دیکھو! اللہ سائے کو کیسے پھیلا دیتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو سائے کو ایک ہی جگہ ٹھہرا کر رکھتا۔ پھر اللہ نے سورج کو اس پر دلیل بنا دیا ہے۔

جب سورج نکلتا ہے تو سایہ مغرب کی طرف بڑھتا ہے۔ جب سورج زوال کے وقت اوپر آتا ہے تو سایہ سمٹ جاتا ہے یا کالعدم ہو جاتا ہے۔ جب سورج مغرب کی طرف جاتا ہے تو سایہ مشرق کی طرف جاتا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿ثُمَّ قَبَضۡنٰهُ اِلَيۡنَا قَبۡضًا يَّسِيۡرًا ﴿۴۶﴾﴾

پھر ہم آہستہ آہستہ اس سائے کو اپنی طرف سمیٹتے رہتے ہیں۔ سورج مغرب کی طرف جا رہا ہے تو سایہ سمٹ رہا ہے، جب شام ہوتی ہے تو سایہ ختم ہو جاتا ہے۔

یہاں ﴿قَبَضۡنٰهُ اِلَيۡنَا﴾ سے کیا مراد ہے کہ ہم سائے کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں! آپ کو یاد ہو گا، میں نے عرض کیا تھا کہ ﴿بَلۡ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ﴾[60] والی آیت کے تحت علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اَلْمُرَادُ الرَّفْعُ اِلٰى مَوْضِعٍ لَا يَجْرِىْ فِيْهِ حُكْمُ غَيْرِ اللّٰهِ.[61]

کہ جہاں ظاہری حکم بھی اللہ کا ہو اور حقیقی حکم بھی اللہ کا ہو تو وہاں نسبت اللہ اپنی طرف کرتے ہیں۔ یہاں اس آیت ﴿ثُمَّ قَبَضۡنٰهُ اِلَيۡنَا﴾ میں سائے کے سمٹ جانے کا ذکر ہے تو اس میں ظاہری اختیار بھی اللہ کا ہے اور حقیقی اختیار بھی اللہ کا ہے۔ اس لیے اس کو اللہ اپنی طرف منسوب کرتے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ جہت سے پاک ہیں،

60۔ النساء 158:4

61۔ التفسیر الکبیر للرازی: ج 11 ص 104

جسم سے پاک ہیں اور مکان سے پاک ہیں۔

نعمت الٰہیہ:

﴿وَ هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَكُمُ الَّیۡلَ لِبَاسًا وَّ النَّوۡمَ سُبَاتًا وَّ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُوۡرًا ﴿۴۷﴾﴾

اللہ نے اپنی قدرتیں بیان کی ہے۔ اللہ نے رات کو لباس بنایا۔ جس طرح لباس اپنے پورے جسم کو ڈھانپ لیتا ہے اسی طرح رات پوری انسانیت کو ڈھانپ لیتی ہے۔ ﴿وَّ النَّوۡمَ سُبَاتًا﴾ نیند کو راحت کا ذریعہ بنایا۔ ''سَبْتٌ'' کا معنی ''کاٹنا'' ہوتا ہے اور نیند بھی چونکہ تھکاوٹ کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے اس لیے اس کو ''سُبَاتًا'' فرمایا۔

﴿وَّ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُوۡرًا ﴿۴۷﴾﴾

اور دن کو زندگی بنایا ہے۔ یعنی دن میں بندہ اٹھ کر چلتا ہے اس لیے اس کو فرمایا ہے کہ ہم نے دن کو زندگی بنا دیا ہے۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ رات آتی ہے تو سب کو نیند آتی ہے، دن ہوتا ہے تو سارے جاگتے ہیں۔ اگر اللہ یوں نہ فرماتے تو کسی کے دل میں رات کو سونا ہوتا، کسی کے دل میں دن کو سونا ہوتا تو پوری دنیا کا نظام درھم برھم ہو جاتا۔ خدا نے پوری انسانیت کا مزاج ایک جیسا بنا دیا ہے کہ رات کو سونا ہے اور دن کو جاگنا ہے۔ اس لیے اصل کام کا وقت دن اور سونے کا وقت رات ہے۔

قرآن کے ذریعے جہاد کرنے کا معنی:

﴿فَلَا تُطِعِ الۡكٰفِرِیۡنَ وَ جَاهِدۡهُمۡ بِهٖ جِهَادًا كَبِیۡرًا ﴿۵۲﴾﴾

کفار کی بات مت مانیں اور قرآن کریم کو لے کر کفار کا مقابلہ کریں۔

یہاں ''جہاد'' کا معنی جہاد نہیں کرنا، جہاد کا معنی مقابلہ کرنا ہے۔ پھر اشکالات ختم ہو جائیں گے۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین فرمائیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جہاد ہر اس کام کو کہتے ہیں جس میں مشقت ہو۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ نے دعوت بالقرآن کو جہاد فرمایا، لہذا جہاد کا معنی قتال نہیں کرنا چاہیے۔ جب کوئی یہ بات کرے تو آپ ان سے پہلا سوال یہ کریں کہ جہاد فرض مکہ میں ہوا یا مدینہ میں؟ وہ کہیں گے: مدینہ میں۔ آپ کہیں کہ یہ آیت تو مکی ہے، تو جب جہاد مدینہ میں فرض ہوا تو مکہ میں اللہ کس کو جہاد فرمارہے ہیں؟ معلوم ہوا کہ یہ بات غلط ہے جو آپ نے کی ہے۔

ہاں بسا اوقات قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ لغوی معنی کو لے کر جہاد کا لفظ استعمال فرماتے ہیں۔ اس کا معنی ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ اس سے قتال کی نفی ہورہی ہے۔ لغوی معنی استعمال ہورہا ہے اور لغۃً مشکل کام کو جہاد کہا جائے تو ہم بھی اس کے مخالف نہیں لیکن شرعاً، اصطلاحاً اور عرفاً جہاد کا معنی صرف قتال ہے۔

نسبی و سسرالی رشتے:

﴿وَ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ مِنَ الۡمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهۡرًا﴾

وہی ذات ہے جس نے پانی کے قطرے سے انسان بنایا ہے، پھر اس کو نسبی تعلقات بھی دیے اور سسرالی تعلقات بھی دیے۔

"نَسَبًا" کہتے ہیں جو ماں اور باپ کی طرف سے رشتہ ہو اور "صِهۡرًا" کہتے ہیں جو بیوی کی طرف سے رشتہ ہو۔ ایک گندہ قطرہ پانی تھا اور خدا نے کتنے تعلقات اس کے ساتھ جوڑ دیے ہیں۔

پیغمبر کی صفات کا خلاصہ:

﴿وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِیۡرًا ﴿۵۶﴾﴾

پیغمبر کی جتنی صفات ہیں ان کا خلاصہ دو صفتیں ہیں: مبشر اور نذیر۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دین خلاصتاً دو چیزوں کا نام ہے، ﴿وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ اوامر اور نواہی۔

اللہ فرماتے ہیں: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝﴾ [62]

اس لیے خیر کو لینا ہے اور شر سے بچنا ہے۔ اوامر پر عمل کرنا ہے اور نواہی سے بچنا ہے۔

اور موت کے بعد ابدی اور دائمی ٹھکانے دو ہی ہیں: جنت یا جہنم۔ "بَشِيْرًا" کا معنی کہ جنت کی طرف بلاتا ہے اور "نَذِيْرًا" کا معنی کہ جہنم سے بچاتا ہے۔ تو ہمارے ذمے کام ہے کہ پیغمبر کے وصف بشیر کو بھی اختیار کریں اور نبی کی صفتِ نذیر کو بھی اختیار کریں۔

جو یہ کہتے ہیں کہ صفت بشیر ہی کو لیں تو وہ آدھے دین کی بات کرتے ہیں، ہم مرکز سے آدھے دین کی نہیں بلکہ پورے دین کی بات کرتے ہیں۔ اگر اللہ قرآن میں کہتے ہیں کہ نکاح کرو تو ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ زنا نہ کرو! اور یہ کہا ہے کہ حلال پانی پیو تو یہ بھی کہا ہے کہ شراب نہ پیو! اگر یہ کہا ہے کہ حلال جانور کھاؤ تو یہ بھی کہا ہے کہ خنزیر مت کھاؤ! اگر یہ کہا ہے کہ توحید اختیار کرو تو یہ بھی کہا ہے کہ شرک سے بچو! اگر حکم ہے کہ سنت پر چلو تو یہ بھی حکم ہے کہ بدعت سے بچو! اس لیے نبی کا صحیح وارث وہ ہے جو امت کو دونوں باتیں بتائے کہ آپ نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا!

دینی امور پر اجرت کا جواز:

﴿قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ﴾

62۔ الزلزال 99:7،8

اے پیغمبر! آپ فرما دیجیے کہ میں تمہیں دین کی بات بتاتا ہوں لیکن اس پر میں تم سے اجر نہیں مانگتا۔

اس آیت کو سمجھیں گے تو اشکال ختم ہو جائے گا۔

یہاں مسئلہ چلتا ہے کہ اجرت علی تعلیم الدین جائز ہے یا نہیں؟ دین کا کام کریں تو اس پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟ یاد رکھنا! ایک ہے کہ آدمی دین کا کام کرے اور اجرت کے لیے کرے یہ سوال ہے، ایک ہے کہ دین کا کام کرے اور اجرت کے لیے نہ کرے یہ اجرت علی تعلیم الدین نہیں ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تجارت فرماتے تھے لیکن جب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کا کام شروع کیا تو تجارت آپ نے چھوڑ دی، پھر آپ کا گزر بسر کہاں سے ہوتا تھا؟ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال تھا، حضرت خدیجہ اپنے شوہر کو مال دے رہی تھیں یا نبی کو دے رہی تھیں؟ (نبی کو دے رہی تھیں۔ سامعین) شوہر کے ذمہ بیوی کا خرچہ ہے یا بیوی کے ذمہ شوہر کا خرچہ ہے؟ (شوہر کے ذمہ بیوی کا خرچ ہے۔ سامعین) اب حضرت خدیجہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مال دے رہی ہیں تو یہ نبی کو دے رہی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں تجارت نہیں کی، صحابہ رضی اللہ عنہم ہدایا دیتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایہ ملتے تو تھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ میں تم سے مانگتا نہیں ہوں۔ اس سے ایک بات تو یہ سمجھیں کہ دین کا کام پیسوں کے لیے کرنا یہ حرام ہے، دین کا کام کریں اور ضرورت کے تحت پیسے آپ کو ملیں اور آپ لے لیں تو یہ جائز ہے۔

اور دوسری بات اچھی طرح سمجھیں! یہ جو اللہ کے نبی نے فرمایا تھا:

﴿مَآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ﴾

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا تھا یا کفار سے فرمایا تھا؟ (کفار کو۔ سامعین) کفار مخالف تھے یا معتقد تھے؟ (مخالف تھے۔ سامعین) اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مخالف! میں تم سے پیسے نہیں مانگتا، اللہ کے لیے دین بیان کرتا ہوں۔

اور آج کے دور میں اجرت کس سے لی جاتی ہے، مخالف سے یا موافق سے؟ (موافق سے۔ سامعین)) ہمارا مسئلہ تو موافقین کا ہے اور لوگ دلیل مخالفین کی دیتے ہیں۔ تو یہ تو دیکھو کہ دلیل دعویٰ کے مطابق ہے بھی یا نہیں؟

بھائی! آپ اپنے معتقد کے پاس جائیں، وہاں بیان کریں اور کہیں کہ میں کھانا بھی آپ کے ہاں کھاؤں گا تو بتاؤ کہ وہ آپ کا معتقد اس کو برا سمجھتا ہے؟ (نہیں۔ سامعین) اور آپ جائیں مشرک کو بات سمجھانے کے لیے اور اس سے کہیں کہ جی! ہم دودھ بھی پییں گے، کیا آپ ایسے کہتے ہیں؟ (نہیں۔ سامعین) جب مخالف سے دین کی بات ہو تو آپ مخالف کو سمجھائیں تو کہتے ہیں کہ میرا کوئی ذاتی نفع نہیں ہے، میں اپنی گاڑی پر آیا ہوں، اپنا خرچ کرتا ہوں، میں آپ سے اجرت لیے بغیر آپ کی خیر خواہی کے لیے آیا ہوں۔

تو موافق کی بات الگ ہوتی ہے اور مخالف کی بات الگ ہوتی ہے۔ قرآن تو سمجھو! اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو فرما رہے ہیں ﴿مَآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ﴾ تو یہ بات مشرکین سے فرما رہے ہیں، یہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے نہیں فرما رہے تھے۔

اور مسجد کا امام جو تنخواہ لیتا ہے یہ کسی مشرک اور کافر سے نہیں لیتا، یہ اپنے معتقد سے لیتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی سمجھیں کہ جو مخالفین ہیں وہ نہیں سمجھے تو انہوں نے اعتراض کیا ہے اور ہم نہیں سمجھے تو ہم جواب نہیں دے پائے۔

اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین)

عباد الرحمٰن کی صفات:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿٦٣﴾﴾

ان آیات میں اللہ رب العزت نے عباد الرحمٰن کی صفات بیان فرمائی ہیں کہ عباد الرحمٰن کون ہوتے ہیں؟ ہم سب کو چاہیے کہ عباد الرحمٰن بنیں اور ان صفات کو اپنانے کی کوشش کریں۔ اللہ کے بندے کون ہیں؟ فرمایا:

1: ﴿الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾

اکڑ کر نہیں چلتے بلکہ عاجزی سے چلتے ہیں۔

2: ﴿وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾

جب جاہل ان سے بات کریں تو وہ ان کو سلام کہہ دیتے ہیں۔

یہاں جاہل سے مراد غیر عالم نہیں ہے۔ یہاں جاہل سے مراد جہالت والا ہے۔ بے شک عالم ہو لیکن جاہلوں کی طرح چلے۔ جس طرح حدیث پاک میں ہے:

"مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ"[63]

یہاں کفر کا معنی یہ نہیں کہ کافر ہو گیا بلکہ یہاں کفر کا معنی ہے کہ اس نے کافروں والا کام کیا ہے۔

تو یہاں جاہل سے مراد یہ نہیں کہ عالم نہ ہو، یہاں جاہل سے مراد ہے کہ جو جاہلوں کی طرح چلے، بعض لوگوں کے پاس علم بھی ہو گا لیکن وہ ضدی ایسے ہوتے ہیں

63۔ المعجم الاوسط للطبرانی: ج2 ص299 رقم الحدیث 3348

جیسے جاہل ہوتے ہیں۔ ان کو سلام کہنے کا معنی یہ نہیں کہ السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا جائے بلکہ سلام کا معنی یہ ہے کہ ان سے جان چھڑاؤ!

3: ﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا﴾

یہ رات گزارتے ہیں سجدے اور قیام کی حالت میں یعنی یہ تہجد کا اہتمام کرتے ہیں۔

4: ﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا﴾

اپنی زبان سے کہتے ہیں: اے اللہ! ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا دے، جہنم کا عذاب بہت سخت ہے۔

5: ﴿وَالَّذِيْنَ إِذَآ أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾

میانہ روی کرتے ہیں، نہ تو فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ ہی بخل سے کام لیتے ہیں، ﴿وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ بلکہ یہ اعتدال کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

6: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ﴾

اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہیں پکارتے یعنی یہ شرک نہیں کرتے۔

7: ﴿وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ﴾

ناحق کسی کو قتل نہیں کرتے۔

8: ﴿وَلَا يَزْنُوْنَ﴾

یہ زنا نہیں کرتے۔ زنا کا معنی صرف یہ نہیں کہ آدمی بدفعلی کرے۔ حدیث پاک میں ہے کہ ہاتھ کا زنا پکڑنا ہے، آنکھ کا زنا دیکھنا ہے۔ تو یہ سب زنا کی قسمیں ہیں۔

﴿وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ یَلۡقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ یُّضٰعَفۡ لَہُ الۡعَذَابُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ یَخۡلُدۡ فِیۡہٖ مُہَانًا ﴿۶۹﴾﴾

جو شخص بھی یہ کام کرے گا تو اپنے کیے کی سزا بھگتے گا، قیامت کے دن اس کو دگنا عذاب بھی ہو گا اور ذلیل ہو کر ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو اللہ فرما رہے ہیں ﴿وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ یَلۡقَ اَثَامًا﴾ تو یہ کفر کا عذاب بیان فرما رہے ہیں یعنی ﴿لَا یَدۡعُوۡنَ﴾ کی ضد ہو گی "یَدۡعُوۡنَ"۔ اگر اللہ کے ساتھ کسی اِلٰہ کو پکارے یعنی کفر کرے اور ساتھ قتل بھی کرے تو اس کا عذاب کیا ہو گا؟ دوام ہو گا کیونکہ کفر ہے اور ذلیل بھی ہو گا۔ اس کی وجہ میں بتا چکا ہوں کہ مؤمن فاسق اگر جہنم میں جائے گا تو اس کو ذلیل نہیں کیا جائے گا بلکہ گناہوں سے پاک کیا جائے گا۔ مؤمن کا جہنم میں جانا ذلت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ گناہوں سے پاک ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس لیے مؤمن کو جہنم میں جو عذاب ہو گا اس کو حقیقتاً عذاب نہیں کہتے، ہاں صورت عذاب کی ہوتی ہے در حقیقت تزکیہ ہوتا ہے۔ عذاب اور ہے اور تزکیہ اور ہے۔

﴿اِلَّا مَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمۡ حَسَنٰتٍ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۷۰﴾﴾

جو توبہ کرے، ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو اللہ اس کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیتے ہیں۔ اللہ غفور ہیں کہ گناہوں کو معاف کر دیتے ہیں اور اللہ رحیم ہیں کہ پھر بدل کر نیکیاں عطا فرما دیتے ہیں۔

جب اللہ دو صفتیں اکٹھی ذکر فرمائیں تو عام طور پر پہلی صفت دعویٰ ہوتی ہے اور دوسری دلیل ہوتی ہے۔ اللہ رب العزت "غفور" ہیں کیوں؟ اس لیے کہ تم مستحقِ

رحمت ہو اور اس لیے بھی کہ وہ "رحیم" بھی ہے۔

9: ﴿وَ الَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ﴾

فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

10: ﴿وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾

اور جب گناہ کی جگہ سے گزریں تو گزر جاتے ہیں، وہاں کھڑے نہیں ہوتے۔

11: ﴿وَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا﴾

جب قرآن کریم کی آیات پڑھیں تو اندھے اور بہرے ہو کر مشرکین کی طرح گرتے نہیں ہیں بلکہ قرآن کو سمجھتے ہیں، اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور عمل کرتے ہیں۔

12: ﴿وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا﴾

اور یہ کہتے ہیں کہ اللہ! ہماری گھر والیوں اور ہماری اولاد کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک کا ذریعہ بنا اور ہمیں متقین کا امام بنا!

اب دیکھو! اس سے کیا بات ثابت ہو رہا ہے؟ کہ متقین کا پیشوا بننا یہ بری چیز نہیں ہے۔ دعا مانگتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں متقین کا پیشوا بنا دے! کیا معنی کہ ہم نیکی کا ایسا کام کریں کہ لوگ ہمیں دیکھ کر نیکیاں کریں، وہ نیکیاں کریں گے تو ان کا ثواب ہمیں بھی ملے گا۔

﴿اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا ﴿۷۵﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿۷۶﴾﴾

اللہ ان کو صبر کی وجہ سے جنت کے بالا خانے دیں گے، وہاں ان کا استقبال دعاؤں اور سلام کے ساتھ کیا جائے گا۔ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بہترین ٹھکانہ ہے۔

منکرین کو تنبیہ:

﴿قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ۝﴾

اے پیغمبر! آپ فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ کو نہیں پکارتے تو اللہ کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب جبکہ تم نے جھٹلا ہی دیا ہے تو اب اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تمہیں عذاب ضرور ملے گا۔

اللہ ہم سب کو شریعت سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الشعراء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿طٰسٓمّٓ ۝۱ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۝۲﴾

حروفِ مقطعات:

﴿طٰسٓمّٓ ۝۱﴾

یہ تینوں حروف مقطعات میں سے ہیں۔ "مقطعات" قطع سے ہے، قطع کا معنی ہے کاٹنا۔ چونکہ ان کو اکٹھا نہیں پڑھتے بلکہ کاٹ کاٹ کر الگ الگ پڑھتے ہیں جیسے طا... سین... میم... اس لیے ان کو حروف مقطعات کہتے ہیں اور قرآن کریم میں حروف مقطعات جہاں پر بھی ہیں یہ متشابہات میں سے ہیں۔ متشابہات ان کو کہتے ہیں جن کا معنی اللہ کے علاوہ کسی کو معلوم نہ ہو۔

بعض لوگوں نے ان دنوں میں ایک نیا نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کریم کی بعض آیات پہلے متشابہات تھیں اب وہ آیات متشابہات نہیں ہیں، کیونکہ اب لغت عام ہو رہی ہے، تحقیقات ہو رہی ہیں اور الفاظ کے معانی اب کھل کر سامنے آرہے ہیں، اس لیے یہ الفاظ متشابہات نہیں رہے۔

مُتَشابہ اور مشتبہ میں فرق:

یہ بات یاد رکھیں کہ متشابہ الگ چیز ہے اور مشتبہ الگ چیز ہے، بعض

لوگوں نے متشابہ کو مشتبہ سمجھا اور کہا کہ یہ آیات مشتبہ ہیں یعنی ان کا معنی مشتبہ ہے، ان کے معنی پر پہلے شبہات تھے، اب تحقیق ہوگئی ہے تو شبہات ختم ہوگئے۔ “میں عرض کرتا ہوں کہ متشابہات کا معنی مشتبہ ہونا نہیں ہے، مشتبہ ہونا اور ہوتا ہے اور متشابہ ہونا اور بات ہے۔ مثلاً قرآن کریم کی یہ آیت ”الٓمّٓ“ متشابہ ہے کہ اس کا معنی اللہ ہی کو معلوم ہے، اللہ کے علاوہ کوئی اس کا معنی نہیں جانتا، یہ آیت مشتبہ نہیں ہے کہ اس پر پہلے شبہات تھے اور تحقیق سے ختم ہوگئے۔ ان دونوں میں فرق اچھی طرح سمجھ لیں۔ ہاں اگر بعض آیات بعضوں کے لیے مشتبہ ہوں کہ ان کا معنی نہ کھلے اور تحقیق کریں تو معنی کھل جائے تو یہ بات اور ہے۔ تو ہم یہ نہیں کہتے کہ قرآن کریم کی بعض آیات محکمات ہیں اور بعض مشتبہات ہیں بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ بعض آیات محکمات ہیں اور بعض متشابہات ہیں۔ متشابہات اور چیز ہیں اور مشتبہات اور چیز ہیں۔

پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی فکرِ امت:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۳﴾

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی بے حد فکر تھی کہ لوگ کلمہ پڑھیں، دین پر آئیں اور جنت میں جائیں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کڑھتے بھی بہت تھے، محنت بھی فرماتے تھے، لوگوں کی باتیں برداشت بھی بہت فرماتے تھے تو اللہ رب العزت نے یہ بات سمجھائی کہ اگر یہ لوگ آپ کی بات نہ مانیں تو کیا آپ اپنے آپ کو ختم کر دیں گے؟ ”بَاخِعٌ“ کا لفظ ”بَخْعٌ“ سے نکلا ہے، ”بَخْعٌ“ کہتے ہیں جانور کو ذبح کرتے کرتے اس کی گردن کی خاص رگ تک پہنچ جانے کو، اس رگ کو ”بِخَاعٌ“ کہتے ہیں۔ تو اس کا معنی یہ ہے کہ کیا آپ ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے اپنے

آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے؟ آپ خود کو مار دیں گے؟ اگر یہ لوگ بات مانتے ہیں تو ان کا اپنا نفع ہے، نہیں مانتے تو ان کا اپنا نقصان ہے، آپ کا کوئی نقصان نہیں بلکہ ایک مقام پر ہے:

﴿لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ [64]

اگر آپ ہدایت پر ہیں تو گمراہ لوگ آپ کو کچھ نقصان نہیں دے سکتے۔

آپ کے ذمے سمجھانا ہے، آپ سمجھا دیں اور زیادہ فکر نہ کریں۔ اس سے یہ مسئلہ کھل کر سامنے آتا ہے کہ کسی بندے کو نیکی پر لانے کے لیے خود گناہ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ کسی بندے کو سنت پر لانے کے لیے بدعت کا ارتکاب درست نہیں ہے کیونکہ دوسرے بندے کا سنت پر آنا یہ متوقع ہے اور ہمارا بدعت کر کے گناہِ کبیرہ کرنا متیقن ہے اور متوقع نیکی کے لیے یقینی گناہ کرنا جائز نہیں ہے۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی نور اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے: اگر کوئی شخص جہنم میں جانا چاہتا ہے تو شوق سے جائے، ہم اپنے کندھے پر بٹھا کر جہنم میں نہیں چھوڑ سکتے۔

ہدایت پر لانے کے لیے گناہ کا ارتکاب جائز نہیں:

میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ ایک مرتبہ تبلیغ کے لیے کچھ علماء چل رہے تھے۔ ایک عالم نے مجھے فون کیا کہ لاہور میں فلاں مسجد میں ہماری جماعت ہے تو اس امام کا یہ عقیدہ ہے، اب ہم اس کے پیچھے نماز پڑھیں؟ میں نے کہا کہ بالکل نہ پڑھیں۔ اس نے کہا کہ اگر نہیں پڑھیں گے تو یہ لوگ دعوت میں جڑیں گے نہیں تو اس سے ان کی مسجد میں کام نہیں ہو گا! میں نے کہا کہ اس مسجد میں مرد ہوتے

64۔ المائدۃ 105:5

ہیں لیکن عورتیں نہیں ہوتیں۔ جس طرح مردوں کے لیے جنت جانے کا مسئلہ ہے اسی طرح خواتین کے لیے بھی ہے۔ اگر لاہور میں کچھ اہل بدعت مرد ہیں اور آپ ان کو اھل السنۃ بنا کر جنت میں لے جانا چاہتے ہیں تو لاہور میں ایسے گناہ کے اڈے بھی ہیں جہاں عورتیں زنا کرتی ہیں تو ان کو بھی زنا سے نکال کر جنت میں لے جانا چاہیے۔ اب ان کو زنا سے نکالنے کے لیے یہ حل اختیار کرنا کہ ان سے دوستی لگاؤ، زنا کرو اور جب دوستی لگ جائے پھر ان کو دین پر لے آؤ، کیا یہ جائز ہے؟ کہا: جی یہ تو جائز نہیں ہے۔

میں نے کہا کہ ایک زانیہ عورت سے زنا کرکے نکاح کی طرف لانا جائز نہیں ہے تو مبتدع آدمی کو سنت پر لانے کے لیے بدعات کر کے اپنی نماز خراب کرنا کیسے جائز ہو گا؟ فرق یہ ہے کہ زنا کی قباحت ہمارے ذہن میں ہے اور بدعت کی قباحت ہمارے ذہن میں نہیں ہے، زنا کے خلاف گفتگو ہوتی ہے تو ذہن بنا ہے کہ یہ بہت گندہ کام ہے اور بدعات کے خلاف گفتگو نہیں ہوتی تو ہمارا ذہن نہیں بنا کہ یہ بھی بہت گندہ کام ہے۔ اس لیے آپ سوشل میڈیا پر بہت سارے لوگوں کو دیکھو گے کہ وہ گندے اور فاسد العقیدہ لوگوں میں گھسے ہوتے ہیں، پوچھیں کہ کیوں؟ تو کہتے ہیں کہ جی یہ لوگ دین پر آجائیں گے۔ بات سمجھو کہ ان کو دین پر لانے کے لیے ان کے پاس جانا گناہ نہیں ہے لیکن ایسے امور کا ارتکاب کرنا کہ جس سے اپنے کمزور عقیدے والے لوگ ان اہلِ بدعت اور اہلِ کفر کو ٹھیک سمجھنا شروع کر دیں تو یہ بڑی غلطی ہے۔

میں آپ کو یہاں بتاتا ہوں کہ دیکھو فلاں اہل بدعت ہے ٹھیک نہیں ہے، فلاں ملحد ہے ٹھیک نہیں ہے، پھر وہ ہمارے ادارے میں آئے، ہم اس کو کھانا بھی کھلائیں، اس کو سونے کی جگہ بھی دیں تو آپ ہم سے پوچھیں گے کہ مولانا! آپ ہمیں کہتے تھے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے لیکن وہ آپ کے پاس آیا تو آپ نے اس کے ساتھ یہ معاملہ کیوں کیا؟ تو ہم آپ کو سمجھائیں گے کہ یہ ہمارے مہمان تھے اور مہمان کا تو حق

ہوتا ہے خواہ کافر ہی کیوں نہ ہو، اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ ہم ان کو ٹھیک سمجھتے ہیں، مہمان ہونے کی وجہ سے ہم نے ان کی عزت کی ہے۔ اب جب ہم یہ وضاحت کر دیں گے تو آپ کا ذہن کبھی الجھن کا شکار نہیں ہو گا۔

اس لیے آپ یہ بات اچھی طرح ذہن میں رکھ لیں۔ آپ نے کل مقتدا بننا ہے، اللہ تعالیٰ آپ سے خوب کام لے، جب آپ اہل کفر یا اہل بدعت سے کسی خاص مسئلے پر اکٹھے بیٹھیں تو اپنے ورکر کو ضرور بتائیں کہ یہ بندہ ٹھیک نہیں لیکن ہم ضرورت کے تحت اس کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ اگر یہ طریقہ اپنا لیں گے تو اس سے ورکر ٹوٹتا اور کٹتا نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکمِ تبلیغ:

﴿وَ اِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰۤی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا یَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ﴿۱۲﴾ وَ یَضِیْقُ صَدْرِیْ وَ لَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۴﴾﴾

اللہ رب العزت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ فرعون کی قوم کے پاس جاؤ، ان کو دعوت دو اور اللہ سے ڈرنے کی بات کرو! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالی سے عرض کیا کہ اے اللہ! میں ڈر محسوس کرتا ہوں کہ وہ کہیں مجھے جھٹلا نہ دیں۔ دوسری بات یہ کہ میرا دل تنگ ہونے لگتا ہے اور میری زبان بھی نہیں چلتی اور مجھ سے ایک ایسا کام ہوا تھا کہ جس کو یہ لوگ گناہ سمجھتے ہیں، ان کی نگاہوں میں ایک جرم میرے اوپر ہے۔ وہ کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام شہر میں نکلے تو ایک قبطی اور ایک اسرائیلی کو دیکھا کہ دونوں آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قبطی کو سمجھایا لیکن وہ نہیں سمجھا ﴿فَوَكَزَهٗ مُوْسٰی﴾ تو موسیٰ علیہ السلام نے اس کو مکا

مارا، ﴿فَقَضٰى عَلَيۡهِ﴾ وہ جلالی مکا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تھا، لگا اور بندہ مر گیا۔

دوسرے دن پھر ایسے ہوا کہ وہی اسرائیلی کسی اور سے جھگڑ رہا تھا۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے سمجھایا لیکن وہ نہیں سمجھا تو اس کو سمجھانے کے لیے مکا اٹھایا تو اس اسرائیلی نے سمجھا کہ مجھے ماریں گے۔ اس نے کہا کہ موسیٰ! کل اس کو مارا تھا اور آج مجھے مار رہے ہیں۔ تو اس اسرائیلی کے بولنے کی وجہ سے چھپا ہوا قتل کا معاملہ کھل گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جان بوجھ کر تو قتل نہیں کیا تھا یعنی یہ قتل عمد نہیں تھا بلکہ قتل خطا تھا جس کا گناہ نہیں ہوتا۔ موسیٰ علیہ السلام وہاں سے مدین چلے گئے۔ پھر آگے لمبا قصہ ہے کہ وہاں شعیب علیہ السلام کی بیٹی سے نکاح ہوا۔ واپسی راستے میں نبوت ملی۔ واپس تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری سونپی تو آپ علیہ السلام عرض کرنے لگے کہ اے اللہ! مجھے ایک تو یہ ڈر ہے کہ یہ مجھے جھٹلائیں گے، میں اکیلا ہوں اور یہ سارے ایک طرف ہیں تو میرا دل تنگ ہو گا، آپ میرے ساتھ میرے بھائی ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت دے دیں تاکہ کوئی میری تائید کرنے والا ہو، اور میری زبان زیادہ کھل کر نہیں چل سکتی، اگر میں کہیں اٹکوں تو میرا بھائی بات شروع کر دے، اللہ رب العزت نے موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کو قبول فرمایا اور حضرت ہارون علیہ السلام کو نبوت عطا کر کے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھیج دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ جو فرمایا: ﴿وَلَهُمۡ عَلَیَّ ذَنۡۢبٌ فَاَخَافُ اَنۡ یَّقۡتُلُوۡنِ﴾ کہ مجھے یہ خدشہ ہے کہ وہ مجھے مار ہی نہ ڈالیں کہ تُو تو ہماری قوم کے ایک فرد کا قاتل ہے۔ اے اللہ! اس کا کیا ہو گا؟ تو اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس بات کے جواب میں فرمایا: ﴿کَلَّا﴾ کہ یہ تمہیں نہیں مار سکتے، ﴿فَاذۡهَبَا بِاٰیٰتِنَاۤ اِنَّا مَعَکُمۡ مُّسۡتَمِعُوۡنَ﴾ تم ہمارے دلائل لے کر جاؤ، ہم تمہارے ساتھ ہیں، تمہاری

گفتگو سنیں گے۔ آگے پھر پوری گفتگو ہے۔

نبی معصوم ہوتا ہے:

میں صرف ﴿وَ لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ﴾ پر بات کرتا ہوں کہ اس کا معنی کبھی یہ نہ کرنا کہ موسیٰ علیہ السلام جرم کا اعتراف کر رہے ہیں - معاذ اللہ - بلکہ جس کام کو قبطی لوگ گناہ سمجھتے تھے موسیٰ علیہ السلام نے اس کو ذکر کیا کہ ان کی نگاہ میں ان کے بندے کا قتل یہ جرم ہے، تو ان کی نگاہ میں میں ان کا مجرم ہوں تو وہ کہیں مجھے مار نہ دیں۔ لہذا ﴿وَ لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ﴾ سے کوئی بندہ یہ استدلال نہ کرے کہ نبی معصوم نہیں ہوتا۔

طبعی اور عقلی خوف:

اور یہ جو موسیٰ علیہ السلام خوف کی بات کرتے ہیں تو سمجھ لیں کہ ایک ہوتا ہے عقلی خوف اور ایک ہوتا ہے طبعی خوف، ﴿فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ﴾ میں جس خوف کا ذکر کیا ہے یہ طبعی خوف تھا عقلی خوف نہیں تھا۔ طبعی اور عقلی خوف میں فرق یہ ہے کہ مثلاً ہمیں عقلاً محبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے والدین اور بچوں اور بیوی سے زیادہ ہے لیکن طبعاً جو محبت ہے وہ کھانے سے زیادہ ہے، گھر والوں سے زیادہ ہے، ماں باپ سے زیادہ ہے۔ عقل اور طبیعت میں فرق کا پتا اس وقت چلتا ہے جب عقلی اور طبعی محبت میں تقابل ہو جائے تو پھر پتا چلتا ہے کہ ایمان کیا ہے۔

یعنی اگر کوئی بندہ یہ کہے کہ میں تمہاری والدہ کو گالی دوں یا تمہارے نبی کو؟ تو ہم کہیں گے کہ اگر آپ نے ضرور گالی دینی ہے تو ہماری ماں کو دے دو، ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ نہ کہنا۔ اب دیکھو! عقلی محبت طبعی محبت پر غالب آگئی، اسی کا نام ایمان ہے۔ عام طور پر عقلی محبت مغلوب رہتی ہے اور طبعی محبت غالب رہتی ہے لیکن

جب دونوں کا تقابل ہوتا ہے تو پھر عقلی محبت غالب ہو جاتی ہے اور طبعی محبت مغلوب ہو جاتی ہے۔ بندہ بسا اوقات الجھن میں پڑ جاتا ہے کہ میں تو مؤمن نہیں ہوں کیونکہ مجھے حضور سے زیادہ اپنے گھر سے پیار ہے۔ تو میں بتا رہا ہوں کہ یہ طبعی پیار ہوتا ہے عقلی نہیں ہوتا۔

تو موسیٰ علیہ السلام کا خوف یہ طبعی تھا عقلی نہیں تھا، عقلاً ہر مؤمن سمجھتا ہے کہ اللہ سے ڈرنا چاہیے۔

فرعون کا احسان جتلانا:

﴿قَالَ اَلَمۡ نُرَبِّكَ فِيۡنَا وَلِيۡدًا وَّلَبِثۡتَ فِيۡنَا مِنۡ عُمُرِكَ سِنِيۡنَ ۝١٨ وَفَعَلۡتَ فَعۡلَتَكَ الَّتِىۡ فَعَلۡتَ وَاَنۡتَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝١٩﴾

جب فرعون سے بات چلی تو فرعون نے کہا کہ ہم نے تیری پرورش کی، تجھے پالا اور تو نے اپنی عمر کے بہت سارے سال ہم میں گزارے، اور یہاں رہ کر تو نے ایک کام بھی کر ڈالا تھا، یہ اشارہ کر رہا تھا فرعون اس قتل کی طرف، پھر کہنے لگا کہ آج تو ناشکرا ہو کر ہم سے باتیں کرتا ہے! موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہارا بندہ قتل ہوا تھا تو ﴿فَعَلۡتُهَاۤ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيۡنَ﴾ مجھ سے یہ کام ہوا تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا، بے خبری میں مارا گیا تھا، میرا قتل کا ارادہ نہیں تھا بس غلطی سے ہو گیا تھا۔ لیکن جب مجھے خوف ہوا کہ تم مجھے قتل کر دو گے تو میں یہاں سے چلا گیا۔ پھر اللہ نے مجھے نبوت دی ہے۔ باقی جو تم میرے اوپر احسان جتلاتے ہو تو اس احسان کی وجہ یہ تھی کہ تم نے میری قوم کو غلام بنا رکھا تھا۔

اب دیکھو! موسیٰ علیہ السلام نے کتنی پیاری بات فرمائی جب اس نے کہا کہ ہم نے تمہیں بیٹا بنا کر رکھا اور آج تم یہ باتیں کرتے ہو؟! تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿وَ تِلۡكَ نِعۡمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنۡ عَبَّدۡتَّ بَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ﴾ کہ یہ جو تم احسان جتلا رہے ہو کہ مجھے پالا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا کر رکھا ہوا تھا۔ تم نے خواب دیکھا تھا کہ تمہاری حکومت چھنے گی تو تم نے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنا شروع کیا، اگر تم انہیں مارنا شروع نہ کرتے تو میں تمہارے گھر میں کبھی نہ پلتا، اللہ نے تمہارے گھر میں مجھے پالا، یہ جو تمہارے گھر میں پلا ہوں تو اس کی وجہ بھی تم خود ہو، اگر بنی اسرائیل کے بچوں کا قتل نہ ہوتا تو میری ماں کیوں مجھے دریا کے حوالے کرتی۔ تو اب سوچو کہ میری پرورش کرنے میں تمہارا کیا احسان تھا جو تم آج جتلا رہے ہو؟!

مکالمۂ فرعون:

﴿قَالَ فِرۡعَوۡنُ وَمَا رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿٢٣﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا ؕ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّوۡقِنِيۡنَ ﴿٢٤﴾ قَالَ لِمَنۡ حَوۡلَهٗۤ اَلَا تَسۡتَمِعُوۡنَ ﴿٢٥﴾ قَالَ رَبُّكُمۡ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿٢٦﴾ قَالَ اِنَّ رَسُوۡلَكُمُ الَّذِيۡۤ اُرۡسِلَ اِلَيۡكُمۡ لَمَجۡنُوۡنٌ ﴿٢٧﴾﴾

اب فرعون کہتا ہے: ﴿وَمَا رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ رب العالمین کیا ہے؟ اس نے یہ نہیں کہا: ﴿وَمَنۡ رَّبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ کہ رب العالمین کون ہے بلکہ کہا کہ رب العالمین کیا ہے؟ تو اس کا سوال اللہ کی حقیقت اور ماہیت کے متعلق تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: ﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا﴾ اللہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے سب کا رب ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا تعارف صفات کے ذریعے کروایا کیونکہ اللہ کی حقیقت اور ماہیت سمجھنا بندے کے بس میں نہیں ہے تو جس چیز کو بندہ سمجھ نہیں سکتا وہ آپ سمجھاتے کیوں؟ تو اس نے سوال اور کیا اور موسیٰ علیہ السلام نے جواب اور دیا۔

فرعون نے اپنے ارد گرد کے لوگوں سے کہا کہ سن بھی رہے ہو کہ موسیٰ کیا کہہ رہا ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ کہ وہ تمہارا بھی خدا ہے اور تمہارے پچھلے باپ دادوں کا بھی خدا ہے۔ فرعون نے کہا کہ تمہارا نبی تو دیوانہ لگتا ہے۔ معاذ اللہ۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کی بات کی پرواہ نہ کی بلکہ بات جاری رکھی اور فرمایا: ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ؕ﴾ کہ اللہ تو مشرق اور مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان سب کا رب ہے۔ اب فرعون کو غصہ آیا اور اس نے کہا کہ اگر تو نے میرے علاوہ کسی اور کو معبود بنایا تو میں تجھے قید کر لوں گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اگر میں کوئی معجزہ پیش کروں تو پھر بھی ایسا کرو گے؟ اس نے کہا: اگر سچے ہو تو پھر لاؤ معجزہ! موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا کو زمین پر مارا تو اژدھا بن گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے دوسرا معجزہ دکھایا کہ اپنا ہاتھ بغل میں ڈالا اور باہر نکالا تو وہ سورج کی طرح چمکنے لگا۔

حکیم کا جواب سائل کی ضرورت کے پیش نظر ہوتا ہے:

یہاں سے ایک بات یہ سمجھ میں آئی کہ سائل کا سوال کے مطابق جواب دینا ضروری نہیں ہے، مجیب کو یہ بات دیکھنی چاہیے کہ میں نے جواب کیا دینا ہے؟ یہ بڑی الجھن کی بات ہوتی ہے کہ کوئی بندہ جب سوال کرتا ہے تو ہم اسی سوال کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں اور ہمیں اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ اگر ہم نے وہ جواب نہ دیا تو لوگ کیا کہیں گے؟! ہم اس کو اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ دیکھیں کہ جو سوال اس نے کیا ہے اگر اسی کا جواب دینا مناسب ہے تو دیں ورنہ جو مناسب ہو وہ جواب دیں اور یہ طریقہ کار اور اسلوب قرآن کریم میں کئی مقامات پر ہے۔

1: مثلاً مشرکین مکہ نے جب پوچھا تھا کہ اللہ کس چیز کا بنا ہوا ہے؟ تو اللہ نے نبی

صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا تھا کہ آپ فرمائیں ﴿هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ کہ اللہ ایک ہے۔

2: ایک اور مقام پر ہے ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ﴾[65] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے سوال کیا کہ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کی وجہ کیا ہے؟ جواب دیا: ﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ﴾ تم یہ نہ پوچھو کہ چاند بڑا چھوٹا کیوں ہوتا ہے بلکہ تم یہ پوچھو کہ چاند کے فوائد کیا ہیں؟ تو چند فوائد بتا دیے کہ اس سے تم عبادات اور معاملات کے اوقات طے کرتے ہو، اس سے تم مہینے متعین کر کے حج کرتے ہو۔ اسی طرح اس سے دن متعین کر کے تم رمضان کے روزے رکھتے ہو، اگر عورت کو طلاق ہو جائے تو اس کے ذریعے سے وہ عدت پوری کرتی ہے۔ تو ان کے سوال کے جواب میں اس چیز کو بیان کیا جو ان کے لیے فائدہ مند تھی اور وہ اس کو سمجھ بھی سکتے تھے۔

3: قرآن کریم میں ہے: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ﴾[66] کہ وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ فرمایا: ﴿قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ آپ فرما دیں یہ نہ پوچھو کہ کیا خرچ کریں بلکہ یہ پوچھو کہاں خرچ کریں؟ تو بتا دیا کہ والدین، عزیز و اقارب، یتیم، مسکین اور مسافروں پر خرچ کرو! تو یہاں بھی سوال کسی اور چیز کے بارے میں ہے، جواب اور دیا گیا۔

اس سے ایک اصول یہ سمجھ میں آیا کہ ہمیشہ ہر بندے کے سوال کے مطابق جواب نہیں دیتے بلکہ عالم کو دیکھنا چاہیے کہ یہاں کون سا جواب دینا مناسب ہے اس

65۔ البقرۃ 189:2

66۔ البقرۃ 215:2

کے مطابق بات کہنی چاہیے۔

متکلم اسلام اور ایک ٹیلفونک کال:

آج رات میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، مجھے ایک شخص نے فون کیا کہ مولانا صاحب! میں حنفی ہوں۔ میں نے کہا کہ یہ کہانی مت ڈالو کہ تم کون ہو تم سوال کرو! کہنے لگا کہ یہ میں نے کتاب میں پڑھا ہے کہ جب عورت کو تین طلاق ہو جائے تو یہ جو حلالہ کرتے ہیں ...، میں نے کہا کہ دنیا میں کوئی بھی حلالہ نہیں کرتا، تم جھوٹ بولتے ہو۔ اب میں نے اس کے سوالات کے دروازے بند کیے۔ میں نے کہا کہ کون حلالہ کرتا ہے؟ کہنے لگا کہ میں نے سنا ہے کہ دیوبند والے مستقل حلالہ کرتے ہیں، ان کے پاس انتظام ہوتا ہے، دفتر ہوتا ہے...، میں نے کہا کہ کوئی نہیں کرتا، نہ کوئی انتظام ہوتا ہے اور نہ کوئی ایسا دفتر ہوتا ہے، یہ تم لوگ جھوٹ بولتے ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر تم اپنی بیوی کو تین طلاق دے دو تو تمہاری غیرت اس بات کو گوارا کرے گی کہ اس کو ایک رات کے لیے میرے پاس بھیج دو؟ کہا کہ نہیں۔ تو میں نے کہا کہ اور کس کی غیرت گوارا کرتی ہے؟ اللہ کے نبی نے اس پر لعنت بھیجی ہے، اس لیے تم لوگوں نے کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ خیر وہ اس سے تھوڑا سنبھل گیا۔ چونکہ وہ بڑی عجیب طرز سے سوال کرتے ہیں کہ یہ کہے گا کہ طلاق ہو جائے تو پھر کسی اور مرد سے نکاح کریں، پھر وہاں سے طلاق لیں اور پہلے کے پاس آ جائے۔ یہ لوگ اس کی پھر ریکارڈنگ کرتے ہیں اور وہ ریکاڈنگ سنا کر کہتے ہیں کہ جی مولانا گھمن صاحب بھی کہہ رہے ہیں کہ حلالہ ہے۔

پھر اس نے کہا کہ اچھا یہ بتائیں کہ ماموں فوت ہو جائے تو ممانی سے نکاح کرنا جائز ہے؟ میں نے کہا: ممانی اور چچی سے ماموں اور چاچو کے فوت ہو جانے کے بعد یا ان کے طلاق دے دینے کے بعد نکاح جائز ہے لیکن معاشرے میں اس نکاح کو معیوب

سمجھا جاتا ہے۔ اب اگر میں صرف اتنا کہتا کہ نکاح جائز ہے تو اس نے کئی جاہلوں کو دھوکہ دیناتھا کہ مولانا گھمن صاحب کہتے ہیں کہ ممانی سے نکاح جائز ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ چوتھے پارے کا آخری رکوع پڑھ لو اور اس کی تفسیر دیکھ لو، تمہیں خود سمجھ میں آجائے گا کہ نکاح کر سکتے ہیں یا نہیں؟ میرے گھر والے اس وقت ساتھ بیٹھے تھے تو مجھے کہنے لگے کہ آپ سیدھا بتا دیتے کہ نکاح کر سکتے ہیں! میں نے کہا: یہ اتنی سیدھی بات نہیں جتنا تم سمجھتی ہو، آپ کو معلوم نہیں کہ کیا جواب دینا ہوتا ہے، یہ میرا فن ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میں نے کیا جواب دینا ہے۔ تو سوال کرنے والا کیا سوال کرتا ہے اس کو آپ نہیں سمجھتے۔

تو میں صرف اتنی بات عرض کر رہا ہوں کہ سائل جو سوال کیا کرتا ہے اس کو نہ دیکھیں بلکہ آپ یہ دیکھیں کہ آپ نے جواب کیا دینا ہے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات پہلے بیان ہو چکے ہیں آپ کے علم میں ہیں، اس لیے میں ان واقعات کی تفصیل نہیں بیان کر رہا بلکہ میں خاص خاص آیات پر بات کر رہا ہوں۔

جادوگروں سے مقابلہ:

﴿قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَ عِصِيَّهُمْ وَ قَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۴۵﴾﴾

فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے اپنے جادوگر جمع کر لیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں سے فرمایا کہ پھینکو جو کچھ تم نے پھینکنا ہے۔ انہوں نے رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں، وہ سانپ نظر آئے۔ جب

موسیٰ علیہ السلام نے عصا پھینکا تو اس نے ساری رسیوں اور لاٹھیوں کو نگل لیا، ان جادو گروں کا سارا جادو ختم ہو گیا۔ جب جادو ختم ہو گیا تو ﴿فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ﴾ جادو گر سجدے میں گرا دیے گئے۔ انہوں نے سجدہ کیا نہیں بلکہ ان کو سجدے میں گرا دیا گیا۔ ﴿فَاُلْقِيَ﴾ مجہول کا صیغہ ہے یعنی ان کو سجدے میں ڈال دیا گیا اور انہوں نے کہا ﴿اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٧﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿٤٨﴾﴾ کہ ہم رب العالمین پر ایمان لاتے ہیں جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے، انہوں نے صرف ﴿اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کہنے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ ساتھ ﴿رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ﴾ کی وضاحت بھی کی ہے۔

جہاں ضرورت ہو وضاحت کر دینی چاہیے:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں وضاحت ضروری ہو وہاں وضاحت ضرور کرو، مجمل بات کبھی نہ کرو! اگر وہ لوگ یہ بات کہتے کہ ہم رب العالمین پر ایمان لائے تو فرعون کہتا کہ رب العالمین تو میں ہوں، یہ تو مجھ پر ایمان لائے ہیں، اس لیے انہوں نے وضاحت سے کہا: ﴿رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ﴾ کہ ہم اس رب العالمین پر ایمان لائے ہیں جو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا رب ہے۔ انہوں نے وضاحت کر دی تاکہ الجھن ہی ختم ہو جائے۔ تو جہاں وضاحت کی ضرورت ہو تو وہاں نام لے کر فتنے کی وضاحت کرو، اگر ضرورت نہ ہو تو بلاوجہ مصائب اور مسائل کو اپنے گلے میں مت ڈالو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ:

﴿وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿٧٠﴾﴾

یہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا جا رہا ہے۔ میں سارے واقعات پیش بھی نہیں کر رہا اور ان پر پوری تفصیل سے بات بھی نہیں کر رہا، میں نے

آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ دروس ہیں، ان میں کسی آیت سے کوئی مسئلہ نکلتا ہو کوئی عقیدہ حل ہوتا ہو تو ہم صرف ان آیات پر بات کرتے ہیں۔

جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوت دی اور یہ کہا کہ تم کس کی پوجا کرتے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ ہم بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا یہ بت تمہاری باتیں سن سکتے ہیں؟ کیا یہ تمہیں نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ﴿بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ﴾ کہ ہمارے باپ دادا ایسا کرتے تھے تو ہم بھی یہی کریں گے۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ﴿فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ یہ سب ہمارے دشمن ہیں سوائے اللہ کی ذات کے۔ دشمن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی وجہ سے بندے جہنم میں جائیں گے۔

ادب کا تقاضا:

﴿الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ﴿۷۸﴾ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ﴿۷۹﴾ وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿۸۰﴾ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ﴿۸۱﴾﴾

ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی صفات کو بیان فرمایا کہ اللہ وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، وہ میری رہنمائی فرماتا ہے، وہ مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے، اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا بھی دیتا ہے اور اللہ مجھے موت بھی دے گا اور زندگی بھی دے گا اور مجھے امید ہے وہ قیامت کے دن مجھے معاف بھی فرمائے گا۔

یہاں ﴿وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ﴾ پر ادب کا تقاضا سمجھیں۔ مرض بھی من جانب اللہ ہوتا ہے اور شفا بھی من جانب اللہ ہوتی ہے لیکن بیماری عموماً آدمی کی بدپرہیزی کی وجہ سے ہوتی ہے، دنیا میں جو بیماری آتی ہے تو ننانوے فیصد امراض ایسے

ہیں کہ اسبابِ مرض ہم بندے اختیار کرتے ہیں پھر بیماری آجاتی ہے مثلاً ناموافق غذا کھالی تو بیمار ہوگئے، سفر لمبا کیا تو بیمار ہوگئے اور موسم میں کپڑوں کا خیال نہیں کیا تو بیمار ہوگئے کیونکہ اللہ نے ان چیزوں میں یہ سبب رکھا ہوتا ہے کہ اس کھانے سے یہ تکلیف ہوگی، اس کھانے سے یہ تکلیف ہوگی، اس سے یہ ہوگا اور جب اللہ سے شفا مانگیں تو اللہ یوں نہیں فرماتے کہ جب میں ایک چیز سے منع کرتا ہوں تو تم کیوں کرتے ہو، جب میں کہتا ہوں کہ ان چیزوں میں احتیاط کرو تو تم کیوں نہیں کرتے؟ یوں نہیں ہوتا بلکہ ہم مرض کے اسباب اختیار کرتے ہیں اس کے باوجود اللہ تعالیٰ شفا دیتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام مرض کی نسبت اپنی طرف کرتے ہیں اور شفا کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں، جب ہم نے ناموافق غذا کھائی تو بیمار ہوگئے اور موافق دوا کھائی تو شفا مل گئی۔ دونوں کام ہم نے کیے ہیں لیکن مرض کی نسبت اپنی طرف ہے اور شفا کی نسبت اللہ کی طرف ہے کیونکہ مرض اچھی چیز نہیں ہے اس کی نسبت اللہ کی طرف کرنا یہ ادب کے خلاف تھا، اس لیے فرمایا کہ اسبابِ مرض اختیار کرکے بیمار میں ہوجاتا ہوں اور اللہ کا کرم یہ ہے اللہ پھر بھی شفا عطا فرمادیتے ہیں۔

اچھے تذکرے کی خواہش:

﴿وَاجۡعَلۡ لِّیۡ لِسَانَ صِدۡقٍ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۸۴﴾﴾

ابراہیم علیہ السلام نے جہاں اور دعائیں مانگی ہیں وہاں ایک دعا یہ بھی مانگی کہ اے اللہ! میرا اچھا تذکرہ بعد والوں کی زبان پر جاری فرمادے۔ اس سے بظاہر عام بندے کو شبہ ہوتا ہے کہ یہ ریا ہے، حالانکہ یہ ریا نہیں ہے یعنی لوگ میرا اچھا تذکرہ کریں، مجھے اچھے لفظوں سے یاد کریں اس میں ریا اور دکھلاوا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ایسا کام کر جاؤں جو صدقہ جاریہ بن جائے اور لوگ اس کام کی وجہ سے جنت میں جائیں تو جب نیک کام کی بنیاد میں رکھوں گا تو لوگ مجھے اچھے لفظوں سے یاد

کریں گے۔ آدمی کے دل میں یہ خواہش ہو کہ لوگ مجھے اچھے لفظوں سے یاد کریں یہ جائز ہے بشرطیکہ اس آدمی کی خواہش حبِ جاہ اور حبِ دنیا کی نہ ہو کہ جب لوگ مجھے اچھا سمجھیں گے تو میری عزت کریں گے، مجھے پیسے دیں گے اور مجھے لیڈر بھی مانیں گے، اور دوسری شرط یہ ہے کہ آدمی ایسے عمل کی وجہ سے یہ خواہش نہ رکھے جو اس نے کیا نہ ہو مثلاً اس کی خواہش ہو کہ میں جب کمرے میں چلا جاؤں اور دروازہ بند کر لوں اور میں نوافل بھی نہ پڑھوں اور لوگ سمجھیں کہ یہ اندر جا کے نوافل پڑھتا ہے تو یہ جائز نہیں ہے، اور تیسری شرط یہ ہے کہ آدمی اس خواہش کے لیے کہ لوگ مجھے اچھا سمجھیں کوئی غلط کام کرے تو یہ بھی جائز نہیں ہے جیسے آج ہمارے ہاں بیماری چل پڑی ہے کہ اہلِ باطل کو بھی ساتھ ملاؤ تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ بڑا امت کو جوڑنے والا ہے تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔

ہاں اگر مقصود یہ ہو کہ لوگ مجھے اچھا سمجھیں گے تو میری بات سنیں گے، اچھا سمجھیں گے تو میری بات قبول کریں گے، اچھا سمجھیں گے تو دینی امور میں میرا ساتھ دیں گے تو یہ جائز ہے، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا خود مانگی ہے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ شَكُوْرًا وَاجْعَلْنِيْ صَبُوْرًا وَاجْعَلْنِيْ فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا وَفِيْ أَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا. [67]

اے اللہ! مجھے شکر کرنے والا بندہ بنا دے، مصیبت آئے تو اس پر صبر کرنے والا بنا دے، مجھے میری اپنی نگاہوں میں چھوٹا کر دے اور دوسروں کی نگاہوں میں بڑا کر دے۔

لوگ بڑا سمجھیں گے تب آپ کی بات مانیں گے، جب بڑا نہیں سمجھیں گے

67۔ مسند البزار: ج10 ص315 رقم الحدیث 4439

تو آپ کی بات کیسے مانیں گے؟! ہمارے شیخ حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "وَفِيْ أَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا" بننے کے لیے "فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا" ہونا ضروری ہے، جب بندہ اپنی نگاہ میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے تو پھر لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل بن جاتا ہے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو لوگوں کی نگاہ میں بڑا کرے تاکہ لوگ ہم سے فائدہ اٹھائیں، اور یہ بات اچھی طرح یاد رکھنا! ایسے اسباب اختیار کرنا کہ جس سے لوگ ہماری بات کو سنیں یہ جائز ہے اور یہ بھی ایک سبب ہے کہ لوگ ہمیں اچھا سمجھیں۔

حضرت مولانا ابرار الحق ہردوئی کی مرید کو نصیحت:

حضرت مولانا ابرار الحق ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے ایک مرید نے خط لکھا کہ حضرت! میں دکان پر ہوتا ہوں، کبھی وقت بھی مل جاتا ہے تو اس میں باتیں بہت ہوتی ہیں تو میں کیا کروں؟! فرمایا کہ تسبیح ساتھ رکھ لو اور ذکر کیا کرو۔ اس نے پھر خط لکھا: حضرت ہاتھ میں تسبیح رکھ کر ذکر کرتا ہوں تو دل میں خیال آتا ہے کہ لوگ مجھے نیک سمجھتے ہیں۔ حضرت فرمانے لگے کہ تم کیا چاہتے ہو کہ لوگ تمہیں برا سمجھیں پھر ٹھیک ہے؟ بھائی آپ کی خواہش نہیں ہے کہ لوگ آپ کو اچھا سمجھیں لیکن آپ کے عمل سے پھر بھی وہ اچھا سمجھتے ہیں تو اس کو خدا کی نعمت اور کرم سمجھیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ:

﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۰۶﴾﴾

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا جب ان سے ان کے بھائی حضرت نوح علیہ السلام نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں ہو؟ نوح علیہ السلام اللہ کے

نبی ہیں اور قوم کافر ہے پھر بھی نوح علیہ السلام کو ان کا بھائی کہا جارہا ہے تو یہ دینی بھائی نہیں بلکہ یہ قومی بھائی ہیں۔ ان کی قوم شرک کرتی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے محنت کی لیکن قوم نہیں مانی اور آپ علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تبلیغ کی ہے اور آخر کار بد دعا کی کہ اللہ! اس قوم کو ہلاک فرمادیں۔

حضرت ھود علیہ السلام کی تبلیغ:

﴿كَذَّبَتْ عَادُ ۨالْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٢٣﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٢٤﴾﴾

قوم عاد نے بھی رسولوں کو جھٹلایا جب ان سے ان کے بھائی حضرت ہود علیہ السلام نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں ہو؟

حضرت ہود علیہ السلام ان کے قومی بھائی تھے۔ ان کی قوم چونکہ ظالم بھی تھی اور بڑی بڑی عمارتیں بھی بناتی تھی تو فرمایا کہ تم ایسے کام نہ کیا کرو، فضول عمارتیں نہ بنایا کرو۔ آپ حضرات ایک بات یاد رکھیں کہ بڑے سے بڑا مکان بنانا شرعاً جائز ہے جب اس کی ضرورت ہو اور ضرورت نہ ہو بلکہ صرف نام و نمود کے لیے بڑا مکان کیا چھوٹا سا مکان بھی بنانا جائز نہیں ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام کی تبلیغ:

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٤١﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٤٢﴾﴾

قوم ثمود نے بھی رسولوں کی تکذیب کی جب ان سے ان کے بھائی حضرت صالح علیہ السلام نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں ہو؟

حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو بہت سمجھایا مگر قوم نہیں مانی۔ بالآخر قوم کے مانگنے پر ایک معجزہ یعنی اونٹنی ایک چٹان سے نکلی۔ طے ہوا کہ ایک دن یہ اونٹنی پانی پیے گی اور ایک دن قوم کے جانور پانی پییں گے۔ اس قوم نے صالح علیہ السلام کی

اونٹنی کو مار ڈالا تو ان پر خدا کا عذاب آیا اور وہ لوگ برباد ہو گئے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی تبلیغ:

﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ۨالْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٦٠﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٦١﴾﴾

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا جب ان سے ان کے بھائی حضرت لوط علیہ السلام نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں ہو؟ حضرت لوط علیہ السلام اہل سدوم کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ آپ کی قوم عمل بد کرتی تھی، وہ لوگ لڑکوں کے ساتھ غیر فطری فعل کرتے۔ اس گناہ پر ان کی پوری قوم کو تباہ کر دیا گیا۔

غیر فطری عمل حرام ہے:

یہاں اس آیت ﴿وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ﴾ پر ایک نکتہ سمجھ لیں۔ یہاں "مِنْ اَزْوَاجِكُمْ" میں مِنْ بیانیہ ہے یا تبعیضیہ ہے۔ اگر مِنْ بیانیہ ہو تو اس کا معنی یہ ہو گا کہ تم نے چھوڑ دیا اس کو جو خدا نے تمہارے لیے بنایا ہے یعنی تمہاری بیویاں، ان کو چھوڑ کر تم مردوں سے اپنی حاجت پوری کرتے ہو! اور اگر مِنْ تبعیضیہ ہو تو پھر معنی ہو گا کہ تم نے بعض وہ چھوڑ دیا جو خدا نے تمہاری بیویوں میں سے تمہارے لیے بنایا تھا یعنی تم اپنی بیویوں کا قبل چھوڑ کر دُبر استعمال کرتے ہو۔

تو اگر مِنْ تبعیضیہ ہو تو اس آیت سے یہ بھی ثابت ہو گا کہ جس طرح مرد سے لواطت حرام ہے اسی طرح اپنی منکوحہ سے بھی حرام ہے، اگرچہ اس کی حرمت پر مستقل حدیث موجود ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا:

"مَلْعُونٌ مَنْ أَتَى امْرَأَتَهُ فِي دُبُرِهَا."[68]

وہ شخص ملعون ہے جو اپنی عورت کے ساتھ غیر فطری عمل کرے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

وحی کا نزول قلب اطہر پر:

﴿وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٩٢﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿١٩٣﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿١٩٤﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿١٩٥﴾﴾

یہ قرآن مجید رب العالمین کا نازل کیا ہوا ہے، اسے فرشتہ روح الامین لے کر اترا ہے، یہ قرآن مجید آپ کے دل پر اتارا ہے تاکہ آپ پیغمبروں میں شامل ہو جائیں جو لوگوں کو ڈراتے ہیں اور یہ قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کے پیغام کو واضح کرنے والی ہے۔

اس آیت میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کو "الروح الامین" فرمایا گیا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر وحی لاتے تھے۔ میں کئی بار یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ جب امتی سو جائے تو اس کا دل اور آنکھ دونوں سو جاتے ہیں اور جب پیغمبر سو جائے تو نبی کی آنکھ سوتی ہے اور نبی کا دل جاگتا ہے اور وحی پیغمبر کی آنکھ اور کان پر نہیں بلکہ دل پر آتی ہے اس لیے پیغمبر جاگتے ہوں اور جبرائیل علیہ السلام آئیں تب بھی وحی ہے اور پیغمبر سو جائیں اور خواب دیکھیں تو تب بھی وحی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وحی کا تعلق پیغمبر کے قلبِ اطہر سے ہے اور جب حضور جاگ رہے ہوں دل تب بھی جاگتا ہے اور اگر نبی سو رہے ہوں دل تب بھی جاگتا ہے۔

ایک علمی نکتہ:

68۔ مسند احمد: ج9ص416رقم الحدیث10158

"الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ" سے مجھے یاد آیا کہ میں نے آپ کی خدمت میں آیت ﴿مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ پیش کی تھی اور بتایا تھا کہ جس میں تقاضائے معصیت نہ ہو اور پھر معصیت نہ کرے اس کو "مَلَكٌ" کہتے ہیں اور اگر تقاضائے معصیت ہو اور اس کو کنٹرول کرے اس کو ﴿مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ کہتے ہیں۔ اس پر کل عصر کے بعد ایک طالب علم نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ اللہ نے قرآن کریم میں جبرائیل امین کو "رسول" بھی کہا اور "کریم" بھی کہا، فرمایا: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ﴾۔ میں نے کہا کہ جبرائیل کو ﴿رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ﴾ کہا یا ﴿مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ کہا؟ جواب دیا کہ ﴿رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ﴾ کہا، میں نے کہا کہ ملک کریم الگ ہوتا ہے رسول کریم الگ ہوتا ہے، دونوں میں فرق سمجھ آجائے تو جواب سمجھ میں آگیا، اور دوسری بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ ایک لفظ جب دو جگہ پر آئے تو ہر مرتبہ اس کا ایک ہی معنی نہیں ہوتا۔ کبھی ایک لفظ کے کئی معنی ہوتے ہیں، خود لفظ "کریم" کے علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے پانچ معنی لکھے ہیں۔

عرب کے ہاں شعر کا مفہوم:

﴿وَ الشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾﴾

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے شعراء کی مذمت بیان فرمائی ہے کہ شعراء کے پیچھے گمراہ لوگ چلتے ہیں اور شاعر ہر قسم کی وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں اور ایسی بات کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔ اس لیے ان سے بچنا چاہیے۔

ہمارے ہاں شعر کا معنی اور ہے، جس کو ہم شعر کہتے ہیں یہ شعر عرفی اور شعر اصطلاحی ہے ورنہ لغتِ عرب میں شعر کا معنی مسجَّع اور مقفّٰی کلام نہیں ہوتا بلکہ

لغتِ عرب میں شعر کا معنی ہوتا ہے ایسی بات جو فرضی ہو اور غیر تحقیقی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو شعر نہیں پڑھتے تھے، اگر شاعر کا معنی ہو مسجّع اور مقفّٰی کلام کہنے والا تو پھر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ شاعر کیوں کہتے تھے حالانکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم تو شعر نہیں پڑھتے تھے؟ اور اللہ بھی فرماتے ہیں: ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ﴾ کہ ہم نے نبی کو شعر نہیں سکھایا اور شعر نبی کے لائق ہی نہیں ہے۔

عرب جن کی فطرت میں شاعری تھی، وہاں دس دس سال کی بچی سو سو اشعار کے قصیدے پڑھتی تھی تو وہ جانتے تھے کہ شعر کا معنی کیا ہے اور حضور پاک شعر نہیں پڑھتے تھے لیکن وہ پھر بھی کہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شاعر ہیں۔

تو عرب کے اس ماحول میں شاعر کا معنی یہ ہے کہ یہ خیالی باتیں کرتا ہے، فرضی باتیں کرتا ہے -العیاذ باللہ- من گھڑت باتیں کرتا ہے جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے اہلِ منطق ادلہ فرضیہ کو اور غیر تحقیقی بات کو ”ادلہ شعریہ“ کہتے ہیں۔ کبھی آپ منطق میں پڑھیں گے کہ یہ دلیل شعری ہے۔ اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ یہ غلط دلیل ہے، غیر تحقیقی بات ہے، فضول سی بات ہے۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی؟ (آ گئی۔ سامعین) اسی وجہ سے عرب کہتے تھے کہ یہ شاعر کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی تردید فرماتے ہیں کہ یہ شاعر کا کلام نہیں ہے۔

البتہ عرف اور اصطلاح میں شاعر اسے کہتے ہیں جو مقفّٰی اور مُسجّع کلام کرے اور یہاں ﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ﴾ میں شعراء سے مراد مُسجّع اور مقفّٰی کلام کہنے والے شعراء ہیں، ان کی عادت یہ ہوتی ہے کہ یہ عموماً ایسی باتیں کرتے ہیں جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لیے فرمایا کہ ان کے پیچھے وہی لوگ چلتے ہیں جو گمراہ ہیں اور خود یہ شاعر لوگ بھی بھٹکتے رہتے ہیں، کبھی ادھر جاتے ہیں اور کبھی ادھر جاتے ہیں۔ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا

مِنۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا ؕ﴾ ہاں! جو ایمان لائیں، نیک عمل کریں، اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کریں اور اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد اس کا بدلہ لیں تو ان کے لیے شعر کہنا جائز ہے۔ معلوم ہوا کہ جن اشعار میں خیالی باتیں ہوں تو وہ ٹھیک نہیں ہیں لیکن اگر شعر وشاعری اللہ کے دین کے لیے ہو اور دین پر ہونے والے ظلم کے انتقام کے لیے ہو، نبوت کی شان میں مدح کے لیے ہو تو پھر کہنا جائز ہے بلکہ بعض مقامات پر مستحب ہے اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً." [69]

کہ اشعار میں دانائی اور حکمت ہوتی ہے۔ شعر میں آدمی چھوٹے سے جملے میں بہت بڑی بات کہہ دیتا ہے جو کہ نثر میں نہیں کہہ پاتا۔ غالب شاعر تھا، وہ کہا کرتا تھا:

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

مولانا محمد احمد صاحب بہت بڑے عالم اور بزرگ تھے، وہ فرماتے تھے:

عشق نے احمد ہے کمّا کر دیا
ورنہ ہم تو آدمی تھے نام کے

غالب کے ہاں عشق اور تھا اور ان کے ہاں عشق اور تھا، وہ عشق مجازی کا رونا روتا تھا اور یہ عشق حقیقی کی باتیں کرتے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج مبارک تھا کہ مسجد نبوی کے منبر پر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بٹھاتے اور فرماتے: حسان! ہماری مدح میں

69۔ سنن ابن ماجۃ، رقم:3756

شاعری کرو اور جب وہ شعر پڑھتے تو اللہ کے نبی دعائیں دیتے:

اَللّٰھُمَّ أَیِّدْہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ.[70]

اے اللہ! جبرائیل امین کے ذریعے حسان کی مدد فرما! حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے شاعری میں حضور صلی اللہ علیہ کی مدح کا حق ادا فرمایا ہے۔

حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا قصیدہ:

صحیح مسلم میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ابو سفیان نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو اور مذمت میں کلام کہا۔ اس وقت تک ابو سفیان مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حسان کو بلاؤ! آپ نے حضرت حسان سے فرمایا: ابو سفیان کو جواب دو لیکن یہ یاد رکھنا کہ میرا اور ابو سفیان کا نسب اوپر ایک ہے، کہیں ہمارا نسب بھی مجروح نہ ہو جائے، اس لیے تم پہلے ابو بکر صدیق کے پاس جا کر نسب سمجھ لو کیونکہ وہ علم الانساب کے ماہر ہیں۔ پھر حضرت حسان حضرت ابو بکر صدیق کے پاس گئے، وہاں سے واپس لوٹ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! ابو بکر صدیق نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب مجھے بتا دیا ہے، اس ذات کی قسم جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش میں سے ایسے نکال لوں گا جیسے گوندھے ہوئے آٹے میں سے بال کو نکال لیا جاتا ہے۔ ام المؤمنین امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ روح القدس ہمیشہ تیری مدد کرتے رہیں گے جب تک تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مخالفین کو جواب دیتا رہے گا۔ پھر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قصیدہ پڑھا

70۔ المعجم الکبیر للطبرانی: ج2 ص418 رقم الحدیث 3501

اور ابوسفیان کو فی البدیہہ جواب دیا۔ فرمایا:

هَجَوْتَ مُحَمَّدًا فَأَجَبْتُ عَنْهُ وَعِنْدَ اللّٰهِ فِي ذَاكَ الْجَزَاءُ

تو نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو اور برائی کی ہے تو میں نے حضور کی طرف سے اس کا جواب دیا اور اس کا اصل بدلہ اللہ تعالیٰ ہی دے گا۔

هَجَوْتَ مُحَمَّدًا بَرًّا تَقِيًّا رَسُوْلَ اللّٰهِ شِيْمَتُهُ الْوَفَاءُ

تو نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو اور برائی کی ہے جو نیک اور پرہیز گار ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور آپ کی خصلت وفا کرنا ہے۔

فَإِنَّ أَبِيْ وَوَالِدَتِيْ وَعِرْضِيْ لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِنْكُمْ وِقَاءُ

میرے ماں باپ اور میری عزت و آبرو؛ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت وآبرو بچانے کے لیے قربان ہیں۔

ثَكِلْتُ بُنَيَّتِيْ إِنْ لَمْ تَرَوْهَا تُثِيْرُ النَّقْعَ مِنْ كَنَفِيْ كَدَاءُ

اگر تم گھوڑوں کو مقام کداء کے دونوں جانب سے گرد و غبار اڑاتا ہوا نہ دیکھو تو میں خود پر گریہ اور آہ وزاری کروں گا۔ مطلب یہ کہ تم پر ہم نے حملہ نہ کیا تو سمجھو میں ختم ہو گیا۔

يُبَارِيْنَ الْأَعِنَّةَ مُصْعِدَاتٍ عَلٰى أَكْتَافِهَا الْأَسَلُ الظِّمَاءُ

ایسے گھوڑے جو تمہاری طرف دوڑتے ہوئے آئیں گے، ان کے کندھوں پر ہم نے ایسے نیزے رکھے ہوئے ہیں جو تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔

تَظَلُّ جِيَادُنَا مُتَمَطِّرَاتٍ تُلَطِّمُهُنَّ بِالْخُمُرِ النِّسَاءُ

ہمارے گھوڑے تمہاری طرف دوڑتے ہوئے آئیں گے اور ان گھوڑوں کے چہروں کو ہماری عورتیں اپنے دوپٹوں سے صاف کرتی ہیں۔

فَإِنْ أَعْرَضْتُمْ عَنَّا اعْتَمَرْنَا وَكَانَ الْفَتْحُ وَانْكَشَفَ الْغِطَاءُ

اگر تم ہم سے نہ بولو تو ہم عمرہ کر لیں گے اور فتح ہمارا مقدر ہو گی اور حقائق سے پردہ اٹھ جائے گا۔

وَإِلَّا فَاصْبِرُوْا لِضِرَابِ يَوْمٍ يُعِزُّ اللهُ فِيْهِ مَنْ يَشَاءُ

ورنہ اس دن کا انتظار کرو جس دن اللہ تعالیٰ عزت والوں کو عزت دے گا۔

وَقَالَ اللهُ قَدْ أَرْسَلْتُ عَبْدًا يَقُوْلُ الْحَقَّ لَيْسَ بِهِ خَفَاءُ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے ایک بندے کو رسول بنا کر بھیجا ہے جو حق سچ بات کہتا ہے اور اس کی بات میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے۔

وَقَالَ اللهُ قَدْ أَرْسَلْتُ جُنْدًا هُمُ الْأَنْصَارُ عَرْضَتُهَا اللِّقَاءُ

اور اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ میں نے ایک لشکر بھیجا ہے جو انصار ہیں اور ان کا مقصد صرف دشمن کا مقابلہ کرنا ہے، اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد اور غرض نہیں ہے۔

لَنَا فِيْ كُلِّ يَوْمٍ مِنْ مَعَدٍّ سِبَابٌ أَوْ قِتَالٌ أَوْ هِجَاءُ

ہم تو ہر روز ایک نہ ایک چیز کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں، کبھی کافروں کی بری عادات اور غلط کاموں پر ان کی مذمت کرنے میں لگے ہوئے ہیں، کبھی کافروں سے جنگ کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور کبھی ان کافروں کی ہجو کرنے میں لگے ہیں۔

فَمَنْ يَهْجُوْ رَسُوْلَ اللهِ مِنْكُمْ وَيَمْدَحُهُ وَيَنْصُرُهُ سَوَاءُ

تم میں سے جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرے اور ان کی تعریف کرے یا ان کی مدد کرے، سب برابر ہے۔ یعنی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

وَجِبْرِيلٌ رَسُوْلُ اللهِ فِيْنَا وَرُوْحُ الْقُدُسِ لَيْسَ لَهُ كِفَاءُ

اور جبریل امین کو ہمارے پاس خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے اور روح القدس کا کوئی بھی مد مقابل نہیں ہے۔ یعنی جب اللہ کا اتنا عظیم اور مقرب فرشتہ ہم

میں ہے تو تم کس طرح ہم سے مقابلہ کرو گے ؟![71]

اب دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم شاباش دے رہے ہیں۔ تو حضور کی مدح میں ایسے قصیدے پڑھنا جائز ہیں، اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ میں محفل حمد و نعت کے حق میں ہوں، جو لوگ مخالفت کرتے ہیں وہ ٹھیک نہیں کرتے۔ بھائی! اگر نعت کا طرز اچھا نہیں ہے تو نعت کہنے کو برا نہ کہو بلکہ کوشش کرو کہ طرز اچھا ہو جائے! اگر نعت خواں کوئی بدعت شروع کر دے تو بدعت کو ختم کرنے کی کوشش کرو لیکن نعت خوانی کو برا نہ کہو! تو ان بنیادوں پر ان محفلوں کی مخالفت کبھی نہیں کرنی چاہیے۔

فتح خیبر کے موقع پر اشعار کا تبادلہ:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی طرف گئے ہیں۔ خیبر میں یہود کا معروف و مشہور پہلوان مرحب ہے، اس کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ وہ یہ اشعار پڑھتا ہوا مقابلے کے لیے نکلا:

قَدْ عَلِمَتْ خَيْبَرُ أَنِّيْ مَرْحَبُ شَاكِي السِّلَاحِ بَطَلٌ مُجَرَّبُ

پورا خیبر جانتا ہے کہ میرا نام مرحب ہے، میں اسلحہ اٹھائے ہوئے ہوں، بہت بہادر پہلوان ہوں اور تجربہ کار آدمی ہوں۔

أَطْعَنُ أَحْيَانًا وَ حِيْنًا أَضْرِبُ إِذَا الْحُرُوْبُ أَقْبَلَتْ تَلَهَّبُ

جب جنگ شروع ہوتی ہے اور شعلے مارتی ہے تو اس وقت میں کبھی نیزے کا وار کرتا ہوں اور کبھی تلوار سے حملہ کرتا ہوں۔

مرحب کی یہ بات سن کر حضرت عامر رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھے، فرمایا:

قَدْ عَلِمَتْ خَيْبَرُ أَنِّيْ عَامِرٌ شَاكِي السِّلَاحِ بَطَلٌ مُغَامِرٌ

71۔ صحیح مسلم، رقم:2490

اگر خیبر تجھے جانتا ہے کہ تو مرحب ہے تو خیبر مجھے بھی جانتا ہے کہ میرا نام عامر ہے، میں بھی اسلحہ سے لیس ہوں، بہادر پہلوان ہوں اور جب لڑتا ہوں تو موت کی پرواہ نہیں کرتا۔ اب میدان ہمارا فیصلہ کرے گا۔

حضرت عامر آگے بڑھے اور مرحب پر وار کیا، آپ کی تلوار چھوٹی تھی، وار کیا تو مرحب پیچھے ہٹ گیا اور تلوار اپنے گھٹنے کو لگی، حضرت عامر شہید ہو گئے۔ بعضوں نے کہا کہ ان کے اعمال ختم ہو گئے کیونکہ اپنی تلوار سے فوت ہوئے ہیں؟ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: عامر کو اللہ دوہرا اجر دے گا۔ محدثین فرماتے ہیں کہ ایک اجر شہید ہونے کا اور ایک اجر اپنوں کی باتیں سننے کا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عامر کی جگہ پر آگے بڑھے اور یہ رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھے:

أَنَا الَّذِيْ سَمَّتْنِيْ أُمِّيْ حَيْدَرَهْ   كَلَيْثِ غَابَاتٍ كَرِيْهِ الْمَنْظَرَهْ

أُوْفِيْهِمْ بِالصَّاعِ كَيْلَ السَّنْدَرَه

میں وہ شخص ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر یعنی شیر رکھا ہے، میں جنگل کے شیر کی طرح ہوں کہ میری ہیبت دیکھ کر مجھ سے دنیا ڈرتی ہے، آج تجھے ناپ ناپ کر دوں گا۔

آپ رضی اللہ عنہ نے ایک وار کیا، مرحب کے سر کے دو ٹکڑے کر دیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہو رہے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض نہیں ہو رہے۔ لیکن ہم اپنے آپ کو دیکھیں کہ ہم کیسے صوفی ہیں! ہم کیسے متقی ہیں! ہم کیسے داعی اور مبلغ ہیں کہ ہم ان باتوں پر ناراض ہوتے ہیں۔ میں بار بار کہتا ہوں کہ اپنے ایمان کی فکر کرو! اگر کوئی ضدی کافر ہو اور مر جائے تو اس کے مرنے پر افسوس نہیں ہے بلکہ اس کافر کے مرنے پر خوشی ہے۔ آپ نے وہ واقعہ پڑھا ہو گا کہ ایک جنگ کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اعلان فرما رہے ہیں:

مَنۡ قَتَلَ قَتِيۡلًا فَلَهٗ سَلَبُهٗ.[72]

کہ جو شخص کسی کافر کو قتل کرے گا تو اس کافر کا سامان اس مجاہد کے لیے انعام ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ترغیب دے رہے ہیں۔

میں اس لیے عرض کرتا ہوں کہ دعوت کا معنی ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم شرعی حدود کا بیڑا اغرق کرکے رکھ دیں۔ میں نے کتنی بار آپ کو سمجھایا ہے کہ مرکز کی یہ خوبی ہے کہ ہم غلط بات نہیں کہتے اور میں اپنے فضلاء کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ اگر حق بات نہیں کہہ سکتے تو خاموش ہو جانا لیکن غلط بات کبھی نہ کہنا، آپ جہاد کا صحیح معنی نہیں بیان کرسکتے تو خاموش ہو جانا لیکن غلط معنی کبھی بیان نہیں کرنا! آپ کسی کا ساتھ نہیں دیتے تو چپ ہو جانا لیکن ان کے زخموں پر نمک مت چھڑکنا! جہنم کے دروازے اپنے لیے مت کھولنا! اللہ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

در سخن مخفی منم:

خیر میں عرض یہ کررہا تھا کہ آدمی مؤمن ہو اور نیک اعمال کرے اور اللہ کو یاد کرے اور اس پر ظلم ہو تو بدلے کے لیے شعر کہے تو شریعت نے اس کی اجازت دی ہے، اس لیے ہر شعر برا نہیں ہوتا۔ میں اس پر اکثر یہ واقعہ سنایا کرتا ہوں کہ ایک بار ایران کے بادشاہ کے منہ سے ایک جملہ نکل گیا:

در ابلق کسے کم دیدہ موجود

"ابلق" وہ موتی ہوتا ہے جو سفید ہو اور اس میں سیاہی کی آمیزش ہو۔ اس نے کہا کہ ایسا موتی دنیا میں کسی نے نہیں دیکھا۔ یہ "کم" بمعنی عدم ہے۔ اب اس نے اپنے سرکاری شعراء سے کہا کہ اس شعر کو پورا کرو۔ انہوں نے بہت کوشش کی لیکن

72۔ السنن الکبریٰ للبیہقی: ج6 ص607 رقم الحدیث 13142

شعر پورا نہیں ہوا۔ یہ مصرعہ چلتے چلتے ہندوستان پہنچا۔ عالمگیر بادشاہ کی بیٹی زیب النساء آئینہ کے سامنے کھڑی آنکھوں میں سرمہ ڈال رہی تھی۔ جب اس نے آنکھوں میں سرمہ ڈالا تو آنکھ سے ایک آنسو نکلا جس کے اندر سیاہ سرمہ ملا ہوا تھا۔ اس نے فوراً شعر تیار کرلیا۔ یہ خاتون نیک بہت تھی اور شاعرہ بھی تھی۔ اس نے کہا:

در ابلق کسے کم دیدہ موجود　　　　مگر اشکِ بتانِ سرمہ آلود

کہ دنیا میں ابلق موتی یعنی وہ موتی جس میں سفیدی اور سیاہی ملی ہوتی ہے کسی نے نہیں دیکھا لیکن محبوب کی آنکھ کا آنسو کہ جب اس میں سرمہ مل جائے تو وہ ابلق موتی بن جاتا ہے۔

کیسا اس خاتون نے کلام کیا۔ اب عالمگیر نے کہا کہ یہ لو شعر اور ایران کے بادشاہ کو بھیج دو۔ بادشاہ کو جب یہ مکمل شعر ملا تو بادشاہ عش عش کر اٹھا کہ یہ کیسا شاعر ہے جس نے شعر مکمل کیا ہے! اور شاعر کا ذوق دیکھو کہ اس نے کتنی بلند بات کی ہے! شعر و شاعری میں تو یہی باتیں ہوتی ہیں نا جس پر سبھی مرتے ہیں۔ اب بادشاہ نے کہا کہ اس شاعر کو ہمارے دربار میں لاؤ ہم اس کی زیارت کرنا چاہتے ہیں، ہم اسے انعام دیں گے۔ یہ پیغام عالمگیر کے پاس آیا تو عالمگیر پریشان ہوا کہ بیٹی کو ایرانی بادشاہ کے دربار میں کیسے بھیجوں! بیٹی نے جب اپنے والد کی پریشانی دیکھی تو کہا بادشاہ کو ہمارا یہ شعر بھیج دیجیے۔ وہ شعر یہ تھا:

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

میں اپنے کلام میں اس طرح چھپی ہوئی ہوں جس طرح پھول میں اس کی خوشبو چھپی ہوتی ہے۔ جو شخص مجھے ملنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ میرا کلام دیکھ لے، کلام دیکھنے سے ہی ملاقات ہو جائے گی۔ جس طرح آپ خوشبو کو نہیں دیکھ سکتے البتہ

پھول کے ذریعے اسے محسوس کر سکتے ہیں اسی طرح ہمیں بھی نہیں دیکھ سکتے البتہ کلام کے ذریعے محسوس کر سکتے ہیں! بادشاہ سمجھ گیا کہ یہ شاعر مرد نہیں ہے بلکہ عورت ہے اور یہ عورت ہمارے دربار میں آنے والی نہیں ہے۔ تو دیکھو شاعری سے بندہ کیسی بات کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ النمل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿طٰسٓ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡقُرۡاٰنِ وَ کِتَابٍ مُّبِیۡنٍ ۙ﴿۱﴾ ہُدًی وَّ بُشۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَ ہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ﴿۳﴾﴾

حروفِ مقطعات:

﴿طٰسٓ ۟﴾

اس پر کل بات ہوئی تھی کہ یہ "طٰسٓ" اور اس جیسے کلمات یہ حروف مقطعات میں سے ہیں اور متشابہات میں سے ہیں جن کا معنی اللہ رب العزت کی ذات کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

تذکرہ حضرت موسیٰ علیہ السلام:

﴿اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِاَہۡلِہٖۤ اِنِّیۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیۡکُمۡ مِّنۡہَا بِخَبَرٍ اَوۡ اٰتِیۡکُمۡ بِشِہَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّکُمۡ تَصۡطَلُوۡنَ ﴿۷﴾﴾

ان آیات میں حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ فرمایا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے مدین تشریف لے گئے اور شعیب علیہ السلام کی بیٹی

سے آپ کا نکاح ہوا۔ ان کے ساتھ آپ واپس تشریف لا رہے تھے تو راستے میں بعض روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی گھر والی امید سے تھیں۔ چونکہ سردی تھی اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ قریب میں آگ نہیں تھی۔ انہوں نے دیکھا تو دور کوہ طور پر انہیں آگ جلتی ہوئی محسوس ہوئی تو گھر والوں سے کہا ﴿اِنِّیۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا﴾ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ وہاں آگ ہے، میں وہاں جاتا ہوں اور آگ لے کر آتا ہوں یا ممکن ہے کہ وہاں کوئی بندہ مل جائے جس سے راستے کا پتا چل جائے گا۔ موسیٰ علیہ السلام وہاں تشریف لے گئے تو ﴿نُوۡدِیَ اَنۡۢ بُوۡرِكَ مَنۡ فِی النَّارِ وَ مَنۡ حَوۡلَهَا﴾ وہاں آپ نے یہ آواز سنی کہ بابرکت ہے وہ جو آگ میں ہے اور بابرکت ہے وہ جو آگ کے قریب ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ ﴿مَنۡ فِی النَّارِ﴾ سے مراد موسیٰ علیہ السلام کی ذات ہے۔ موسیٰ علیہ السلام ایسی جگہ پر تھے جہاں یہ محسوس کر رہے تھے کہ میرے چاروں طرف آگ ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ موسیٰ علیہ السلام بھی برکت والے ہیں اور ان کے آس پاس جو ملائکہ ہیں وہ بھی برکت والے ہیں۔ ﴿وَ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ اللہ رب العزت جہات سے پاک ہیں، یہ جو خاص جہت میں آپ نے آگ دیکھی ہے یہ خدا نہیں ہے، اللہ جہات سے پاک ہیں۔

درخت سے آواز آئی:

﴿یٰمُوۡسٰۤی اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الۡعَزِیۡزُ الۡحَكِیۡمُ ۙ﴿۹﴾﴾

یہاں سے آواز آئی کہ اے موسیٰ! میں اللہ ہوں، غالب ہوں اور حکمت والا ہوں، اور قرآن کریم کی بعض آیات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو آواز اس درخت

میں سے آئی تھی ﴿اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ﴾ باتیں دونوں ٹھیک ہیں یعنی وہ درخت تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس درخت کو آگ لگی ہوئی ہے اور اس میں سے آواز آئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آواز سنی۔ یہ اللہ رب العزت کی آواز تھی جو بالکل بے کیف تھی اور ان کو بتایا گیا کہ یہ آواز اللہ رب العزت کی ہے۔ اب اس درخت سے آواز کا آنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ درخت بولتا ہے بلکہ اصل بات یہ تھی کہ اس درخت پر تجلی الٰہی پڑی اور درخت نے اللہ کی آواز کو آگے نقل کر دیا۔

اب یہاں منصور حلاج کا واقعہ سمجھیں کہ جو کہتے تھے "انا الحق، انا الحق، انا الحق"۔ فقہاء نے ان کے قتل کا فتویٰ دیا اور صوفیاء کہتے ہیں کہ وہ بالکل ٹھیک تھے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ فقیہ کا معاملہ مسائل کا ہے، وہ امت کو اشتباہ سے بچاتا ہے اور صوفیاء کا معاملہ بالکل جدا ہے۔ صوفیاء کہتے ہیں کہ وہ جو "انا الحق" فرماتے تھے وہ اپنے بارے میں "انا الحق" نہیں کہہ رہے تھے بلکہ اللہ رب العزت کا "انا الحق" کہنا نقل فرما رہے تھے۔ تو یہ حکایت ہو رہی تھی اور یہ کفر نہیں ہوتا۔

اسی طرح بعض بزرگوں کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے کہا "سُبۡحَانِیۡ مَا أَعۡظَمَ شَأۡنِیۡ"، تو لوگوں نے کہا کہ یہ کافر ہے۔ جب ہم اللہ کے بارے میں کہیں تو ہم یوں کہیں گے: "سُبۡحَانَهٗ مَا أَعۡظَمَ شَأۡنُهٗ" اور وہ بزرگ جو کہہ رہے تھے "سُبۡحَانِیۡ مَا أَعۡظَمَ شَأۡنِیۡ" تو وہ اپنے بارے میں نہیں کہہ رہے تھے بلکہ اللہ کے کلام کو نقل فرما رہے تھے۔ تو اللہ رب العزت کی جو تجلیات ہیں اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ تجلی منصور حلاج کی زبان پر ہو اور "أَنَا الۡحَقُّ" کی آواز وہاں سے نکلے، اللہ چاہے تو وہ تجلیات کسی درخت پر پڑیں اور اس سے ﴿اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ﴾ کی آواز آئے، تو جس طرح وہ درخت سے نکلنے والی آواز درخت کی اپنی نہیں تھی اسی طرح

منصور حلاج کی زبان سے نکلنے والی آواز ان کی اپنی نہیں ہے بلکہ وہ حکایت کو نقل فرما رہے ہیں۔

مسئلہ وحدۃ الوجود:

یہاں بعض حضرات نے مختصر طور پر وحدۃ الوجود کا مسئلہ بیان کیا ہے۔ مَیں اس مسئلہ پر مستقل ایک دن تخصص کی درسگاہ میں بات کروں گا کہ وحدت الوجود کیا ہے اور وحدت الشہود کیا ہے؟

وحدت الوجود کا معنی عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز ہے وہ خدا ہی ہے اور صوفیاء کے بارے میں عام لوگوں کا ذہن یہ ہے کہ صوفیاء ہر چیز کو خدا سمجھتے ہیں حالانکہ معاملہ یہ نہیں ہے۔ وحدت الوجود کا معنی ہوتا ہے کہ حقیقی وجود اللہ تعالیٰ کا ہے اور باقی وجود کالعدم ہیں، گویا کہ فنا ہیں۔ ایک تو دنیا میں اللہ کی ذات کے علاوہ کسی چیز کا وجود اپنا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ کی ذات کے علاوہ دنیا میں کسی وجود کو بقاء حاصل نہیں ہے بلکہ تمام وجود فانی ہیں۔ تو ایسا وجود جو اَز خود ہو اور بغیر کسی کے پیدا کرنے کے ہو اور فانی بھی نہ ہو بلکہ باقی ہو تو وہ صرف اللہ کا وجود ہے، اسے وحدۃ الوجود کہتے ہیں۔

تو خدا کی ذات پر صوفیاء کی نظر اتنی ہوتی ہے کہ باقی اشیاء ان کی نظر میں کالعدم ہوتی ہیں، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں صرف ایک ہی وجود ہے، باقی کوئی وجود نہیں ہے۔ اگر یہ بات دیکھیں تو غلط بھی نہیں ہے بالکل ٹھیک ہے۔ حقیقی وجود دنیا میں صرف ایک ہے، باقی وجود فنا کے درجے میں ہیں، اللہ رب العزت کی ذاتِ گرامی کے مقابلے میں ان کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ تو یہ وحدت الوجود کا معنی ہے۔

اور وحدت الشہود کا معنی یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں ایک اللہ کا وجود ان کو نظر آتا ہے اور خدا کی ذات پر اتنی گہری نظر ہوتی ہے کہ باقی چیزوں کے وجود انہیں نظر

نہیں آتے۔ اس کی مثال ایسے سمجھیں جیسے سورج نکل آئے تو ستارے ختم نہیں ہوتے، ستارے موجود تو ہوتے ہیں لیکن سورج اتنی تیز روشنی کے ساتھ آتا ہے کہ ستارے ماند پڑ جاتے ہیں اور نظر نہیں آتے۔ تو جس طرح سورج کے ہوتے ہوئے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں اور نظر نہیں آتے بالکل اسی طرح صوفیاء کی اللہ کی ذات پر اتنی گہری نگاہ ہوتی ہے کہ باقی چیزوں کا وجود انہیں نظر نہیں آتا۔ تو اس میں بھی حرج کی کوئی بات نہیں ہے۔

یہ بات سمجھیں کہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود عقائد کا نہیں بلکہ تصوف کا مسئلہ ہے اور تصوف کے مسائل کو تصوف کی عبارات اور تصوف کی اصطلاحات سے سمجھنا چاہیے، یہ عقائد کی اصطلاحات سے سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ باقی وحدۃ الوجود پر مستقل بات کرنے کی ضرورت ہے جس میں اس مسئلہ پر ہونے والے اشکالات کا رد ہو کیونکہ اس کی بنیاد پر بہت سارے لوگ آج کل اہلِ حق پر کفر کے فتوے لگا رہے ہیں کہ تم وحدۃ الوجود کے قائل ہو۔ تو اس مسئلہ کو مستقل سمجھنے کی ضرورت ہے۔

عطائے معجزہ کے وقت موسیٰ علیہ السلام کو تسلی:

﴿وَ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۰﴾﴾

موسیٰ علیہ السلام کو اللہ رب العزت نے فرمایا کہ اپنی لاٹھی پھینکو! آپ نے پھینکی تو وہ اژدھا بن گیا۔ موسیٰ علیہ السلام اس اژدھے سے خوف محسوس کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ڈرنے کی بات نہیں ہے! ایسے مقامات پر پیغمبر ڈرتے نہیں ہیں، ڈرتا تو وہ ہے جس نے ظلم کیا ہو۔ یہ استثناء منقطع ہے۔ اور وہ بھی اگر توبہ کر لے تو اسے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور آپ سے تو کوئی گناہ بھی نہیں ہوا۔

یہ بات کہہ کر موسیٰ علیہ السلام کی ایک الجھن کو دور کیا ہے کہ جو آپ نے

قبطی کو قتل کیا تھا وہ قتل کرنا گناہ تو نہیں تھا لیکن موسیٰ علیہ السلام اپنے اوپر بوجھ محسوس کر رہے تھے کہ میرے ہاتھ سے ایک بندہ قتل ہو گیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ اگر کوئی بندہ واقعتاً ظلم کر لے، پھر توبہ کر لے تو ہم اس کو بھی معاف کر دیتے ہیں اور آپ نے تو کوئی ظلم نہیں کیا، آپ کا کوئی گناہ بھی نہیں تھا پھر بھی آپ اس الجھن میں ہیں، آپ اس الجھن کو چھوڑیں اور کھل کر دین کا کام کریں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ بات سمجھائی جا رہی ہے۔

یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے شاگرد کسی علاقے میں کام کرے اور وہ بعض الجھنیں اپنے استاد کو بتاتا ہے کہ استاد جی! جب میں پڑھتا تھا تو مجھ سے یہ غلطی ہوئی تھی۔ استاد کہتا ہے کہ یہ تو غلطی تھی ہی نہیں، ہم نے تو اس کا اختیار دیا ہوا تھا، تم اس الجھن کو چھوڑو اور بس کام کرو! تو استاد کی طرف سے تسلی دی جا رہی ہوتی ہے۔ تو اللہ رب العزت نے موسیٰ علیہ السلام کی الجھن کو دور کر کے تسلی عطا فرمائی۔ اس موقع پر ﴿مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوٓءٍ﴾ کا معنی اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔

نو نشانیوں کا بیان:

﴿وَاَدْخِلْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿١٢﴾﴾

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ اپنی بغل میں ہاتھ ڈالیں، جَیب کٹی ہوئی چیز کو کہتے ہیں، بعض اسے گریبان کہتے ہیں اور بعض بغل کہتے ہیں، جب بغل میں ہاتھ ڈالیں گے تو ہاتھ چمکتا ہوا باہر نکلے گا، بالکل صاف وشفاف ہو گا، اس میں کوئی عیب نہیں ہو گا۔ ﴿فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ﴾ یہ دونوں چیزیں – عصا کا سانپ بننا اور ہاتھ کا چمکتے ہوئے بغل سے نکلنا – ان نو نشانیوں میں سے ہیں جو ہم آپ کو دے رہے ہیں، آپ ان کو لے کر فرعون

اور اس کی قوم کی طرف جائیں۔ وہ نو نشانیاں یہ تھیں:

1: ید بیضا... چمکتا ہوا ہاتھ۔

2: عصا... جب موسیٰ علیہ السلام لاٹھی پھینکتے تو وہ اژدھا بن جاتی، کبھی لاٹھی پھینکی تو بارہ چشمے نکل آئے، کبھی لاٹھی پھینکی تو سمندر میں بارہ راستے بن گئے۔

3: نقص ثمرات... ایک وقت ایسا آیا کہ فرعونیوں کے پھلوں میں کمی آگئی۔

4: سنین... یعنی قحط سالی۔ فرعونی قحط میں مبتلا ہوئے، کھانے کو کچھ نہیں ملتا تھا، فرعونیوں نے موسیٰ علیہ السلام سے دعا کی درخواست کی۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی۔ جب قحط ختم ہو گیا تو فرعونی پھر اپنی سرکشی میں مبتلا ہو گئے۔

5: طوفان... اس طوفان سے گھبرا کر فرعون کی قوم نے موسیٰ علیہ السلام سے دعا کی درخواست کی کہ یہ عذاب ہم سے دور ہو جائے۔ موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ طوفان دور ہوا۔

6: ٹڈی دل... ایک عذاب ٹڈیوں کا ان پر مسلط کر دیا گیا۔ ٹڈی دل نے ان کے سارے کھیتوں اور باغوں کو کھالیا۔

7: قمل... یعنی جوئیں، کپڑوں میں جوئیں، بالوں میں جوئیں، ہر چیز میں جوئیں پڑ گئیں تو ان کے لیے کھانا مشکل ہو گیا، موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ دعا کریں۔ آپ نے دعا کی جوؤں کا عذاب ختم ہو گیا لیکن یہ لوگ پھر نڈر ہو گئے۔

8: ضفادع... مینڈک، ہر چیز میں مینڈک کھانے میں، پینے میں۔

9: دم... خون، جو کھاتے پیتے وہ خون بن جاتا۔

آپ اندازہ کریں کس قدر ضدی قوم تھی کہ اس قدر تباہیوں کے باوجود یہ پھر بھی ٹھیک نہیں ہوتے تھے۔ اللہ رب العزت ہمیں سمجھ عطا فرمائیں کہ ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح امتی بنیں، اسی میں خیر ہے۔ (آمین)

ضد؛ قبول حق میں سخت رکاوٹ ہے:

﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴾

ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھے اور انہیں موسیٰ علیہ السلام کی سچائی اور حقانیت کا یقین ہو چکا تھا پھر بھی ظلم اور تکبر کی وجہ سے انکار کرتے رہے۔ یہاں ﴿وَاسْتَيْقَنَتْهَا﴾ کا جملہ یہ حالیہ جملہ ہے، ترجمہ یوں کریں گے: حالانکہ ان کا دل یقین کرتا تھا کہ بات بالکل ٹھیک ہے لیکن پھر بھی انکار کرتے تھے۔

دنیا میں ایسے ہوتا ہے کہ آدمی ضد اور حسد کی وجہ سے کسی بات کو قبول نہیں کرتا، دل مانتا ہے کہ یہ بات ٹھیک ہے پھر بھی قبول نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ضد اور حسد کی آگ سے محفوظ فرمائے۔ (آمین)

نبی کی وراثت علمی ہوتی ہے:

﴿وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ﴾

حضرت داؤد علیہ السلام والد تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام ان کے بیٹے تھے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث بنے۔ نبی کی وراثت مالی نہیں ہوتی۔ پیغمبر کے مال کا دنیا میں کوئی وارث نہیں بنتا اور پیغمبر اپنے کسی رشتہ دار کا دنیاوی امور میں وارث نہیں بنتا۔ تو پیغمبر نہ وارث ہوتا ہے نہ مُورِث ہوتا ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث بنے اور یہ وراثت مالی نہیں بلکہ علمی اور روحانی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے علم، فکر اور روحانیت کے وارث حضرت سلیمان علیہ السلام بنے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک بیٹا تو نہیں تھا بلکہ انیس بیٹے تھے

لیکن وارث صرف ایک بیٹا حضرت سلیمان بنا۔ تو اگر یہ وراثت مالی ہوتی تو ایک بیٹے کو نہیں بلکہ تمام بیٹوں کو مساوات کے ساتھ ملتی کیونکہ مساوات کے بغیر تقسیم پیغمبر کی شان کے لائق نہیں ہے۔ اس لیے حضرت سلیمان علیہ السلام جو حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث بنے ہیں تو یہ وراثت مالی نہیں بلکہ یہ وراثت علمی ہے۔

اور مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے ایک روایت ذکر کی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث بنے تھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان علیہ السلام کے وارث ہوئے۔ [73]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے چودہ سو سال بعد تشریف لا رہے ہیں، درمیان میں لوگ وارث نہیں بنے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وارث بن رہے ہیں۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ یہ وراثت مالی نہیں بلکہ وراثت علمی تھی۔

باغ فدک کا مسئلہ:

اس سے یہ مسئلہ بڑے آرام سے سمجھ آجاتا ہے کہ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئیں اور ان سے فرمایا کہ خیبر میرے ابو جی کا مال ہے اور میں ان کی وارث ہوں، تو خیبر کا جو باغ ہے باغ فدک؛ وہ مجھے وراثت میں دے دیں!

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے خود آپ کے والد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ:

73۔ معارف القرآن: ج6 ص566

"إِنَّا مَعْشَرَ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُوَرَثُ مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ."[74]

فرمایا کہ ہم نبیوں کے گروہ ہیں، ہمارے مال میں کوئی وارث نہیں ہوتا، جو مال نبی چھوڑ کر جائے وہ امت کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔

حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کو بات سمجھ میں آگئی، سیدہ رضی اللہ عنہا چھ ماہ تک زندہ رہیں لیکن انہوں نے پھر کبھی بھی باغ فدک کا مطالبہ نہیں کیا، جبکہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا ناراض تھیں اس لیے بات نہیں کی۔ ہم کہتے ہیں کہ سیدہ رضی اللہ عنہا ناراض نہیں تھیں بلکہ انہوں نے جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے اپنے بابا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنی تو انہیں مسئلہ سمجھ میں آگیا، اسی لیے انہوں نے تادم حیات پھر کبھی بھی مطالبہ نہیں کیا۔ یہ بات غلط ہے کہ وہ ناراض تھیں، اور ہمیں بہت سی باتوں پر تعجب ہوتا ہے اب آپ کو بھی تعجب ہو گا۔ ہمیں تعجب کیا ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا جن کا وراثت کا دعویٰ تھا ان کو مسئلہ سمجھ میں آگیا اس لیے انہوں نے وراثت پر پھر کبھی بات نہیں کی لیکن تیرہ چودہ سو سال گزر گئے اور آج لوگ لڑ رہے ہیں کہ جی! صدیق نے حضرت زہراء کو وراثت کیوں نہیں دی؟! ہے نا تعجب کی بات کہ جن کا تعلق بھی نہیں ہے وہ ابھی تک لڑ رہے ہیں کہ جی! باغ فدک تھا کس کا اور لے کون گیا! حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو کیوں نہیں ملا؟

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مطالبے کی وجہ:

یہاں ایک بات سمجھ لیں کہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو شبہ کیوں ہوا کہ یہ ہمارا مال ہے؟ دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کے فتح ہونے کے بعد اپنی

74۔ المعجم الاوسط للطبرانی: ج3 ص276 رقم الحدیث 4578

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو پورے سال کا خرچ اس فدک کے باغ سے دیتے تھے لیکن ازواج مطہرات اس مال میں سے ضرورت کا رکھتیں اور باقی خرچ کر دیتی تھیں۔ تو حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو شبہ یہ ہوا کہ اگر یہ مال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس مال سے سال کا خرچہ گھر والوں کو کیوں دیتے تھے؟ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا تھا اور ان کے جانے کے بعد ہم اولاد وارث ہیں لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب یہ مسئلہ سمجھایا تو حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو مسئلہ سمجھ میں آ گیا۔

حیات الانبیاء علیہم السلام کی دلیل بطرزِ نانوتوی:

اسی حدیث کے ضمن میں میں یہ بات کہتا ہوں کہ قاسم العلوم والخیرات بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ اسی حدیث "إِنَّا مَعْشَرَ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُوَرَثُ مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ" سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نبی اپنی قبر میں زندہ ہوتا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص زندہ ہو، روح اور جسم کا تعلق ہو تو مال کا مالک وہ بندہ خود ہوتا ہے، دوسرے بندے کا اس مال سے حق وابستہ نہیں ہوتا لیکن جب اس شخص کی روح اور جسم کا تعلق ختم ہو جائے، اس پر موت آ جائے تو اس کے وارث اس کے مال کے مالک بن جاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مال کا کوئی وارث کیوں نہیں بنا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب پیغمبر پر موت آتی ہے تو ظاہر پر موت آ جاتی ہے لیکن قلبِ اطہر میں حیات رہتی ہے تو جب حضور کی روح کا جسم سے تعلق باقی ہے تو آپ کا مال آپ کی مِلک سے نکلا نہیں ہے، اس لیے اس مال کا کوئی وارث بنا بھی نہیں ہے۔

تو پیغمبر کے مال کا رشتہ داروں کی مِلک نہ بننا اس بات کی دلیل ہے کہ روح کا جسدِ اطہر کے ساتھ ایسا تعلق موجود ہے کہ پیغمبر کا مال اس کی مِلک سے نہیں نکلتا اور پھر

فرمایا "مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ" کہ جو مال ہم چھوڑیں وہ ہمارے رشتہ داروں کا نہیں بلکہ امت کے لیے صدقہ ہے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ حدیث پاک کا جزء بھی دلیل ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں کیونکہ کسی شخص کا مال صدقہ تب بنتا ہے جب صدقہ کرنے والا صدقہ کرتے وقت زندہ ہو، اگر صدقہ کرنے والا صدقہ کرتے وقت زندہ نہ ہو تو مال صدقہ کیسے بنے گا؟! پیغمبر پر موت آ بھی رہی ہے اور مال امت کے لیے صدقہ بن بھی رہا ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ بوقت موت پیغمبر میں اب بھی حیات موجود ہے تبھی تو مال صدقہ بنا ہے! صدقہ بننے کے لیے متصدق کا زندہ ہونا ضروری ہے تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر پر موت ہے لیکن قلبِ اطہر میں حیات ہے، اب بطور وراثت کے مال نبوت کا تقسیم نہ ہونا یہ بھی دلیلِ حیات ہے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ساری بحث اپنی کتاب "آب حیات" میں لکھی ہے۔

حضرت نانوتوی کے علوم:

حضرت سہارنپوری المہند علی المفند میں لکھتے ہیں کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے آب حیات میں وہ تحقیق بیان فرمائی ہے کہ جو آپ سے پہلے کسی نے نہیں فرمائی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اس کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں کہ پٹرول میں حرارت ہوتی ہے اگرچہ بظاہر ٹھنڈک ہی کیوں نہ ہو۔ اگر آپ ٹھنڈے پٹرول کو جلتی آگ پر ڈال دیں تو آگ بھڑک اٹھتی ہے حالانکہ پٹرول ٹھنڈا ہے، اس کے ظاہر میں برودت ہے لیکن پٹرول میں حرارت ہے جس کی وجہ سے آگ بھڑک اٹھی ہے، اور اگر آپ جلتی آگ پر گرم پانی ڈال دیں تو آگ پھر بھی بجھ جاتی ہے، کیونکہ اگرچہ پانی اوپر سے گرم ہے لیکن پانی میں خاصہ برودت کا ہے جو آگ کو بجھا رہا ہے۔ اسی طرح پیغمبر کے ظاہر پر موت بھی ہو تو پیغمبر کے قلبِ اطہر میں حیات ہوتی ہے اس لیے مولانا

نانوتوی فرماتے ہیں کہ پیغمبر کی جو موت ہے وہ مزیلِ حیات نہیں ہوتی بلکہ ساترِ حیات ہوتی ہے یعنی حیات کو چھپا لیتی ہے جبکہ امتی کی موت مزیلِ حیات ہوتی ہے کہ حیات کو ختم کر دیتی ہے۔ جیسے ایک دیا جل رہا ہو، آپ اس کے اوپر الٹا پیالہ رکھیں تو اس پیالے کی وجہ سے دیا بجھتا نہیں ہے بلکہ چھپ جاتا ہے تو پیغمبر کے قلبِ اطہر میں جو حیات کا دیا جلتا ہے اس کے اوپر موت کا پیالہ آ جائے تو حیات کا دیا بجھتا نہیں ہے، وہ چھپ جاتا ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

اگر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم بندے کو سمجھ آ جائیں تو لطف آتا ہے، جب سمجھ میں نہیں آتے تو "وَالنَّاسُ أَعۡدَاءٌ لِمَا جَهِلُوۡا" پھر لوگ اس کی مخالفت مول لیتے ہیں کہ بندہ ٹھیک نہیں کہتا۔ اللہ رب العزت ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

پرندوں کی بولیاں:

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمۡنَا مَنۡطِقَ الطَّيۡرِ وَاُوۡتِيۡنَا مِنۡ كُلِّ شَىۡءٍ ؕ﴾

اے لوگو! ہمیں پرندں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ضرورت کی ہر چیز دی گئی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے پرندوں کی بولیوں کے ساتھ دیگر جانوروں کی بولیاں بھی سکھائی تھیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام سے اور جانوروں نے بھی بات کی اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو جواب دیا ہے۔ لیکن یہاں بطورِ خاص سلیمان علیہ السلام "مَنۡطِقَ الطَّيۡرِ" فرما کر پرندوں کی بولی کی بات کر رہے ہیں لیکن باقی جانوروں کی بولیوں کی بات نہیں کر رہے حالانکہ سلیمان علیہ السلام چیونٹی کی بات بھی سمجھتے ہیں جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ جب چیونٹی نے کہا ﴿يَاَيُّهَا النَّمۡلُ

﴿ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ﴾ کہ اے چیونٹیو! اپنی اپنی بِلوں میں گھس جاؤ! سلیمان علیہ السلام نے چیونٹی کی آواز کو سنا اور سمجھ بھی گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف پرندوں کی بولیاں نہیں بلکہ سلیمان علیہ السلام دوسرے جانوروں کی بولیاں بھی سمجھتے تھے۔ یہاں بطورِ خاص "مَنْطِقَ الطَّيْرِ" پرندوں کی بولیوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ آگے جو گفتگو آرہی ہے اس کا تعلق پرندے کے ساتھ ہے اسی لیے فرمایا کہ ہمیں پرندوں کی بولیاں بھی سکھائی گئی ہیں۔

اہلِ بدعت کے استدلال کا جواب:

﴿وَ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ حضرت سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہمیں ہر چیز دی ہے۔ ﴿كُلِّ شَيْءٍ﴾ کے بارے میں ایک بات یاد رکھ لیں، اہلِ بدعت عموماً دھوکہ دیتے ہیں۔ اہلِ بدعت کہتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا: ﴿وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ کہ دیکھو! آدم علیہ السلام کو اللہ نے تمام چیزوں کا علم دیا۔ یہاں "کل" کا لفظ ہے اور کل عموم کے لیے آتا ہے۔ جب آدم علیہ السلام کے پاس ہے تو حضور ان سے افضل ہیں تو حضور کے پاس تو بطریق اولیٰ ہو گا۔ اس سے اہلِ بدعت علم غیب ثابت کرتے ہیں۔

یہ بات یاد رکھیں کہ "کل" کا لفظ ہمیشہ عمومِ کلی کے لیے نہیں آتا بلکہ بعض اوقات لفظ "کل" لایا جاتا ہے لیکن اس سے ایک خاص حد تک عموم مراد ہوتا ہے بالکلیہ عموم مراد نہیں ہوتا۔ جیسے یہاں فرمایا کہ ﴿وَ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ ہمیں ہر چیز دی گئی تو اب یہاں یہ معنی نہیں کہ دنیا بھر کی تمام چیزیں سلیمان علیہ السلام کو دی گئی تھیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ سلطنت میں جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کو وہ دی گئی تھیں جیسے فوج، طاقت، افراد، وزیر، مشیر وغیرہ۔ اگر

لفظ ”کل“ کا عموم کلی والا معنی مراد لیا جائے کہ دنیا جہاں اور تمام عالم کی ہر ہر چیز دی گئی تو یہ معنی درست نہیں بنتا کیونکہ آگے جو قصہ آرہا ہے ملکہ سباء کا تو اس کے پاس جو تخت تھا وہ تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس نہیں تھا تو پھر عموم کلی والا معنی کیسے ٹھیک ہوگا؟ تو یہاں لفظ ”کل“ کا یہی مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں حکومت دی ہے اور حکومت کے متعلقہ جتنے امور ضروری ہوتے ہیں خدا نے مجھے سارے عطا فرمادیے ہیں، اور یہاں ”کل“ سے عموم کلی مراد نہیں اس پر ایک اور دلیل خود آگے قرآن کریم کی یہ آیت ہے: ﴿اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَ اُوْتِیَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ وَّ لَهَا عَرْشٌ عَظِیْمٌ ﴿۲۳﴾﴾ ہدہد نے کہا کہ میں نے ایک ایسی عورت کو دیکھا ہے جو لوگوں پر حکومت کرتی ہے اور اس کو ہر چیز ملی ہے اور اس کا ایک تخت بھی ہے۔ اب اس عورت کو ہر چیز کہاں ملی ہے! اس کو تو شوہر نہیں ملا تھا اور ہر چیز کیا اس کو ملنی ہے! ملکہ بلقیس تو سلیمان علیہ السلام کے پاس آنے سے پہلے کنواری تھی، اس لیے اہلِ بدعت کا ”مِنْ كُلِّ شَیْءٍ“ کا معنی یہ کرنا کہ سلیمان علیہ السلام کو ہر ہر چیز ملی ہے، بالکل غلط ہے۔

چیونٹی کی گفتگو سننا:

﴿حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ یّٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ ۙ وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾﴾

اس سورت کا نام سورۃ النمل ہے، اس لیے کہ سورت کے درمیانی حصہ میں میں چیونٹیوں کا ذکر آیا ہے۔ سلیمان علیہ السلام کا لشکر جا رہا تھا، راستے میں چیونٹیوں کی بستی تھی تو ایک چیونٹی نے آواز دے کر باقی چیونٹیوں سے کہا: ﴿یّٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ﴾ کہ اے چیونٹیو! اپنی اپنی بِلوں میں گھس جاؤ! ﴿لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ ۙ وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ﴾ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان علیہ

السلام کا لشکر تمہیں روند ڈالے گا اور انہیں پتا بھی نہ چلے کہ ہمارے پاؤں کے نیچے کچھ آیا ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے جب چیونٹی کی یہ بات سنی تو ﴿فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا﴾ آپ علیہ السلام مسکرا پڑے اور کہا: اے اللہ! آپ نے جو نعمت مجھے دی ہے اور میرے والدین کو دی ہے مجھے اس کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرما اور مجھے توفیق دے کہ میں نیک اعمال کروں جو تجھے پسند ہوں اور اپنی رحمت کے ساتھ مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما! تو سلیمان علیہ السلام کے پاس سب نعمتیں موجود ہیں اس پر اللہ کا شکر ادا فرما رہے ہیں۔

پرندوں کی حاضری اور ہدہد کی غیر حاضری:

﴿وَ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ﴿۲۰﴾﴾

سلیمان علیہ السلام چونکہ بادشاہ تھے اور بادشاہ کے ذمہ ہے اپنی رعایا کی نگرانی کرنا تو سلیمان علیہ السلام بھی نگرانی کرتے تھے اور پوچھتے تھے کہ فلاں کدھر ہے؟ فلاں کدھر ہے؟ آپ سفر میں ہیں تو آپ نے سفر میں پوچھا کہ ہدہد کدھر ہے؟ یہ کیوں پوچھا؟ اس لیے کہ ہدہد کی خاصیت یہ ہے کہ زمین کے نیچے اس کو پانی نظر آتا ہے، پانی کتنا گہرا ہے اس کو پتا چلتا ہے۔ تو سلیمان علیہ السلام اپنے لشکر کے ساتھ ہدہد رکھتے تھے، جہاں پڑاؤ ہوتا تو اس سے پوچھتے کہ پانی کہاں پر ہے؟ ہدہد بتاتا کہ نیچے پانی ہے، آپ علیہ السلام جنات سے فرماتے کہ پانی نکالو۔ وہ نکالتے تو بس تھوڑی دیر بعد وہاں پر تالاب بن جاتا تھا اور لشکر وہاں سے پانی پیتا تھا۔ دنیا میں اللہ نے سلیمان علیہ السلام کو کیا حکومت عطا فرمائی تھی! سبحان اللہ۔

چونکہ ہدہد نہیں تھا اس لیے حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: ﴿مَا لِيَ لَآ

أَرَى الْهُدْهُدَ ۖ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ﴾ مجھے کیا ہو گیا ہے کہ مجھے ہدہد نظر نہیں آرہا یا وہ کہیں غائب ہو گیا ہے؟! حضرت سلیمان علیہ السلام نے پہلے اپنی بات کی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے کہ مجھے ہدہد نظر نہیں آ رہا۔ پہلے نسبت اپنی طرف کی امت کو یہ بات سمجھانے کے لیے کہ میرے ذمہ ہے کہ میں ان کی نگرانی کروں، مجھے خدشہ ہے کہ وہ چھوٹا سا پرندہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس کی نگرانی نہیں کر سکا اور وہ کہیں بھٹک گیا ہو اور اس کو کچھ ہو نہ گیا ہو! یہ میری وجہ سے تو کہیں بھٹک نہیں گیا؟! لیکن جب پورا یقین ہو گیا کہ یہ میری وجہ سے نہیں بھٹکا بلکہ وجہ کوئی اور ہو گی تو فرمایا: ﴿أَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ﴾ یہاں "أَمْ" کا لفظ "بَلْ" کے معنی میں ہے، مطلب کہ میری وجہ سے نہیں بلکہ وہ خود کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا ہے۔ اچھا! تلاش کرو کہ وہ کہاں ہے؟ آگے فرمایا کہ اس کو لاؤ ﴿لَأُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا﴾ یا تو میں اس کو اچھی خاصی تنبیہ کروں گا اگر معمولی غلطی ہوئی تو اور ﴿لَاَاذْبَحَنَّهٗ﴾ اگر بہت بڑی غلطی ہوئی تو ذبح کر دوں گا، ﴿أَوْ لَيَأْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ﴾ یا اگر معقول عذر ہوا تو میں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعے سے مستنبط چند مسائل:

اس واقعے سے مفسرین نے چند مسائل بیان فرمائے ہیں:

نمبر1: ایک مسئلہ یہ بیان فرمایا ہے کہ بڑوں کی ذمہ داری ہے اپنے ماتحتوں کی نگرانی کرنا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرماتے تھے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا پوچھتے تھے، جب کوئی نماز میں نہیں ہوتا تو آپ پوچھتے کہ فلاں شخص نماز کے لیے کیوں نہیں آیا؟ جی! بیمار ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جا کر اس کی بیمار پرسی فرماتے۔ فلاں کیوں نہیں آیا؟ جی! اس کی شادی ہے۔ فلاں کیوں نہیں آیا؟ جی! اس کا یہ عذر ہے۔ تو یہ پیغمبر علیہ السلام کا طریقہ ہے۔ اس کا خیال رکھنا چاہیے۔

نمبر2: ماتحت آدمی اگر کوئی جرم کرے تو اس کو سزا دینی چاہیے۔ دیکھو! یہ پرندہ ہے انسان نہیں ہے اور سلیمان علیہ السلام اس کو بھی سزا دینے کی بات کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ جانور جو پالتو ہوں اور کوتاہی کریں تو ان کو اس درجے میں سزا دینا جو قابل برداشت ہو یہ قرآن کریم سے ثابت ہے۔ آپ کا پالتو گدھا ہے، پالتو گھوڑا ہے، پالتو بھینس ہے، وہ نافرمانی کریں کوتاہی کریں تو تھوڑی سی سزا دے سکتے ہیں۔

نمبر3: اگر انسان ہو اور انسان کے ماتحت ہو اور وہ خرابی پیدا کرے تو اس کو تو سزا دینے کی بطریق اولیٰ گنجائش موجود ہے۔

خیر! وہ ہدہد آگیا تو ہدہد نے آکر بتایا کہ میں نے ایک عورت کو دیکھا ہے جس کی بہت بڑی سلطنت ہے، ﴿وَّ لَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٣﴾﴾ اس کا بہت بڑا تخت ہے۔ بطورِ خاص اس کے تخت کا ذکر کیا ہے باقی چیزوں کا ذکر نہیں کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا تختِ شاہی قیمتی بہت تھا اور اس کی پوری سلطنت میں بے بہا قیمت والا اور ایک عجوبہ سے کم نہیں تھا۔ بلقیس نے سات محل بنائے اور ساتوں محلات کے وسط میں اس نے اپنا محل بنایا ہوا تھا یعنی اس کے محل تک پہنچنے کے لیے سات محل کراس کرنے پڑتے تھے۔ ایک بڑا محل، اس میں چھوٹا محل، اس میں پھر چھوٹا، پھر چھوٹا، پھر چھوٹا، پھر چھوٹا۔ اس کا تخت اسی ہاتھ لمبا، چالیس ہاتھ چوڑا اور تیس ہاتھ اونچا تھا اور اس پر جواہرات، سونے اور چاندی جو کچھ اس کے بس میں تھا اس نے لگا دیا تھا۔ تو ہدہد نے کہا کہ وہ لوگ مشرک ہیں، اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر سورج کی پوجا کرتے ہیں شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال مزین کر رکھے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ چلو ہم دیکھتے ہیں کہ تم سچ بولتے ہو یا جھوٹ بولتے ہو! تو سلیمان علیہ السلام نے اس کو ایک خط دیا اور فرمایا: جا کر ان تک پہنچاؤ، پھر ایک طرف بیٹھ جانا اور دیکھنا کہ وہ کیا کہتے ہیں! اس خط کو ہدہد نے لیا، یا تو

مجلس میں جا کر رکھا یا بلقیس اکیلی تھی اس کے پاس جا کر چھوڑا۔

کسی کی نجی زندگی میں مداخلت نہ کریں!

﴿ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ۝۲۸﴾

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہد ہد سے فرمایا تھا کہ جب خط پہنچا دینا تو ذرا ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو جانا، پھر دیکھنا کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔

اس سے مفسرین نے ایک مسئلہ بیان کیا ہے کہ جب کسی کا پیغام لے کر جائیں تو پیغام پہنچا کر اس پر مسلط نہ ہوا کریں بلکہ ایک طرف ہو جائیں، پھر انتظار کریں کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ اس سے کتنی آسانی سے باتیں سمجھ آ رہی ہیں کہ کسی کی چیز کو دیکھو مت! کسی کی چیز کو پڑھو مت! کسی کا میسیج نہ پڑھو! کسی کا خط نہ دیکھو! کسی کی نجی زندگی میں مداخلت نہ کرو!

حضرت سلیمان کا خط ملکہ بلقیس کے نام:

خیر! ہد ہد نے خط پیش کر دیا۔ اب ملکہ نے اپنے وزراء اور خواص کو جمع کیا اور اس نے کہا ”يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ۝۲۹“ اے سرداران قوم! ایک زبردست اور عظیم الشان خط میرے پاس آیا ہے جو سلیمان کی طرف سے ہے اور خط کا مضمون یہ ہے:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۳۰ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝۳۱﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ میرے مقابلے میں بغاوت اور سرکشی نہ کرو بلکہ فرمانبردار بن کر میرے پاس پہنچو!

پوری تاریخ میں سلیمان علیہ السلام کے خط سے جاندار خط آج تک کبھی کسی

طاقت سے لکھ رہا ہے۔

خط کے بارے میں ہمیشہ یاد رکھیں کہ شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنی چاہیے اور بسم اللہ لکھنے کے بعد اپنے نام سے خط کا آغاز کرنا چاہیے مثلاً "مِنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ إِلٰى فُلَانٍ" یہ خط عبد الرحمٰن کی طرف سے فلاں کے نام پر ہے، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ بھی یہی ہے۔ اگر کوئی شخص خط کے شروع میں اپنا نام لکھنے کے بجائے خط کے آخر میں لکھے تو جائز یہ بھی ہے لیکن اگر شروع میں اپنا نام لکھنا چاہیں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے بسم اللہ لکھیں، پھر اپنا نام لکھیں اور پھر خط لکھیں۔

خط لکھنے کا طریقہ:

قرآن کریم میں جو خط موجود ہے اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے ہے، بعد میں بسم اللہ ہے اور اس کے بعد خط ہے۔ اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خط لکھنے والا اگر اپنا نام پہلے لکھے، پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھے، پھر خط لکھے تو یہ بھی جائز ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں ایسا نہیں ہے بلکہ سلیمان علیہ السلام کا خط تو یہ تھا: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مِنْ سُلَيْمَانَ بْنِ دَاوٗدَ اِلٰى بِلْقِيْسَ ابْنَةِ ذِيْ شَرْح وَقَوْمِهَا اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَ اْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ" بلقیس نے جب خط اپنی قوم کو پڑھ کر سنایا تو قوم کو آگاہ کرنے اور یہ بتانے کے لیے کہ یہ کس کا خط ہے سلیمان علیہ السلام کا اسم گرامی پہلے ذکر کر دیا اور کہا "اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ" تو جو جملہ اس نے کہا تھا قرآن نے اسی کو نقل کر دیا، اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اپنا نام بسم اللہ سے پہلے لکھا تھا۔ تو ان مفسرین کا موقف یہ ہے کہ بسم اللہ پہلے لکھی ہوئی تھی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام بعد میں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک طریقہ یہ تھا:

مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ إِلٰى هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ.[75]

کہ شروع میں اپنا نام لکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کے پاس خط جاتا ہے وہ دیکھتے ہی جان لیتا ہے کہ یہ خط کس کا ہے، پھر آگے خط پڑھنے میں دلچسپی ہوتی ہے اور اگر خط کے بالکل آخر میں نام ہو تو دلچسپی کم ہوتی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خط لکھتے تو سنت نبوی کی اتباع کرتے ہوئے پہلے اپنا نام لکھتے اور بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لکھتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

مَا كَانَ أَحَدٌ أَعْظَمَ حُرْمَةً مِنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ أَصْحَابُهٗ إِذَا كَتَبُوْا إِلَيْهِ كِتَابًا بَدَؤُا بِأَنْفُسِهِمْ.[76]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی آدمی قابل تعظیم نہیں لیکن آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم جب آپ کو خط لکھتے تو اپنے نام سے شروع کرتے۔

اس پر دلیل سنن ابی داوٗد کی روایت ہے کہ حضرت علاء حضرمی رضی اللہ عنہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خط لکھتے تھے تو اپنا نام شروع میں لکھتے تھے۔[77]

ملکہ بلقیس کا فیصلہ:

خیر! ملکہ بلقیس نے اپنے وزراء کو بلا کر مشورہ کیا کہ بتاؤ کیا کریں؟ میں تمہارے مشورہ کے بغیر حتمی فیصلہ نہیں کرتی۔ وہ لوگ بڑے سمجھدار تھے، کہا کہ

75۔ صحیح البخاری، رقم:7

76۔ روح المعانی: ج10 ص196

77۔ سنن ابی داوٗد، رقم:5134

﴿نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّ اُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ﴾ ہمارے پاس طاقت بھی ہے اور ہم جنگجو بھی ہیں، اس لیے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، باقی تو ہماری بادشاہ ہے جو فیصلہ کرے ہم تیرے ساتھ ہیں لیکن تو نے گھبرا کر فیصلہ نہیں کرنا! یہ بہت سمجھدار عورت تھی اس نے کہا کہ بات سمجھو کہ ﴿اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا﴾ کہ جب بادشاہ کسی شہر میں داخل ہوں تو تباہی مچا دیتے ہیں، ﴿وَ جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً﴾ اور عزت والے لوگوں کو ذلیل کر کے رکھ دیتے ہیں، اس لیے جذباتی فیصلے نہ کرو بلکہ سمجھداری سے کام لو۔ میں ان کی طرف ہدیہ بھیجتی ہوں اس سے پتا چل جائے گا کہ وہ بادشاہ ہے جس کی خواہش ہوتی ہے کہ میں کسی اور حکومت پر قبضہ کروں اور میری بادشاہی بڑھ جائے یا وہ اللہ کا نبی ہے جو چاہتا ہے کہ اور ملکوں میں اللہ کی شریعت نافذ ہو۔ تو اگر تمہارا مال انہوں نے قبول کر لیا تو اس کا معنی ہے کہ وہ دنیا چاہتے ہیں اور اگر مال قبول نہ کیا تو سمجھنا نبی ہیں، پھر ہمیں ان سے جھگڑنا نہیں چاہیے۔ خیر اس نے ہدیہ بھیجا۔ ہدیہ میں کچھ سونے کی اینٹیں بھیجیں، جواہرات اس کے علاوہ تھے، سو غلام بھیجے اور سو باندیاں بھی۔ باندیوں کو غلاموں والے کپڑے پہنا دیے اور غلاموں کو باندیوں والے کپڑے پہنا دیے تا کہ پتا تو چلے کہ یہ پہچان بھی سکتے ہیں یا نہیں! پھر کچھ سولات بھی کیے۔ سلیمان علیہ السلام کو بذریعہ وحی پتا چل گیا کہ بلقیس نے یہ ہدیہ بھیجا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کے آنے سے پہلے راستے میں جنات کے ذریعے سونے کی اینٹوں کی سڑک بنوا دی اور سڑک کے دونوں طرف عجیب الخلقت جانور بندھوا دیے، جانوروں کا گوبر اور پیشاب سونے کی اینٹوں پر پڑتا تھا اور راستے میں دونوں طرف جنات کھڑے کیے۔ تخت شاہی سجایا اور اس پر چار چار ہزار سونے کی کرسیاں لگوائیں، ایک طرف علماء بیٹھے اور ایک طرف وزرائے سلطنت بیٹھے۔ جب وہ آئے تو بعض روایات میں آتا ہے کہ جب انہوں نے سونے کی اینٹوں پر جانوروں کو

پیشاب اور گوبر کرتے دیکھا تو سونے کی اینٹیں وہیں پھینک دیں کہ ہم سوا اینٹ گفٹ دینا چاہتے ہیں اور یہاں دیکھو کہ جانور سونے پر پیشاپ کر رہے ہیں اور جنات ان کے ماتحت ہیں۔

خیر اس کے باوجود بھی حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کا بہت اکرام کیا، بہت عزت کی جیسے مہمان کی عزت کرتے ہیں، نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ وہ لوگ آئے تو سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ﴾ کہ تم ہمیں مال دینا چاہتے ہو؟ جو مال اللہ نے ہمیں دیا ہے وہ تمہارے اس مال سے بہت بہتر ہے جو تمہیں دیا ہے، ﴿بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ﴾ بلکہ اپنے ہدیہ پر تم خود خوش رہو!، ﴿اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ﴾ ان کے پاس واپس لوٹ جاؤ اور ان کو جا کر بتاؤ کہ ﴿فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾﴾ کہ ہم اب تمہارے پاس ایسا لشکر لائیں گے جس کے مقابلے کی تمہارے پاس ہمت نہیں ہو گی اور پھر ہم تم لوگوں کو ذلیل کر کے وہاں سے نکال دیں گے۔

ملکہ بلقیس کی دربار سلیمانی میں حاضری:

جب یہ لوگ واپس پہنچے تو جا کر ملکہ بلقیس کو بتایا کہ وہ بہت بڑے لوگ ہیں، ان کے لیے مال و دولت تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ملکہ بلقیس سمجھ گئی کہ یہ لوگ کون ہیں! وہ کہنے لگی کہ چلو ہم خود چلتے ہیں اور چل کر اسلام قبول کرتے ہیں، ان کی اطاعت کر لیتے ہیں۔ جب ملکہ بلقیس چلی تو اس نے بارہ ہزار سردار ساتھ لیے اور ہر سردار کی ماتحتی میں ایک لاکھ فوج رکھی۔ اتنا بڑا لشکر اور طاقت لے کر وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچی۔ اور یہ طاقت دکھانے کے لیے نہیں لا رہی تھی چونکہ بادشاہ تھی اس

لیے شاہانہ طرز سے آ رہی تھی، باقی آ اس لیے رہی تھی تا کہ اسلام قبول کرے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ نے ہیبت اتنی عطا کی تھی کہ کوئی بندہ آپ کے سامنے بات نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دن آپ علیہ السلام نے خود دیکھا کہ دور گرد و غبار اڑ رہا ہے تو آپ نے دربار والوں سے پوچھا کہ یہ غبار کیسا ہے؟ آپ کو جواب دیا گیا کہ ملکہ بلقیس اپنے لوگوں کو لے کر خدمت میں حاضر ہو رہی ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ ابھی تین میل کے فاصلے پر تھی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کی اطلاع ہوئی۔

اس کا تخت کون لائے گا؟

سلیمان علیہ السلام نے اپنے مصاحب جمع کیے کہ وہ آ رہی ہے اور پوچھا کہ ﴿اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾﴾ اس کی سلطنت میں سب سے اہم چیز اس کا تخت ہے، بتاؤ اس کے تابعدار بن کر آنے سے پہلے میرے پاس اس کا تخت کون لائے گا؟ ﴿قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ﴾ ایک طاقت ور اور مضبوط جسم والے جن نے کہا کہ جی میں لاتا ہوں اور مجلس برخاست ہونے سے پہلے پہلے لاؤں گا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ اس سے بھی پہلے لاؤ تو ﴿قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ﴾ بعض کہتے ہیں کہ آصف بن برخیا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کا وزیر تھا یا آپ کا خالہ زاد بھائی تھا اس کے پاس کتاب کا علم تھا، اس نے کہا کہ جی! مجھے اجازت دو میں لاتا ہوں اور اتنی دیر میں لاؤں گا کہ آپ آنکھ بند کر کے کھولیں گے تو تخت آپ کے سامنے ہو گا حضرت سلیمان علیہ السلام نے آنکھ بند کی اور کھولی تو تخت ان کے سامنے آ گیا تھا۔

تخت لانے والا کون تھا؟

اور مفسرین میں سے بہت سارے حضرات کی رائے یہ ہے کہ ﴿الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ سے مراد حضرت سلیمان علیہ السلام خود ہیں اور کتاب اللہ کا علم آپ علیہ السلام کے پاس تھا۔ اب مطلب یہ ہے کہ آپ نے عفریت جن سے فرمایا کہ تم تو اس کو اتنی دیر میں لاؤ گے اور میں تیری پلک جھپکنے سے پہلے اس کو لے آتا ہوں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس سے مراد سلیمان علیہ السلام نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے پاس خود علم تھا تو آپ نے کسی اور سے کیوں کہا کہ تخت کون لائے گا؟ مفسرین کہتے ہیں کہ آپ نے یہ سوال یہ بات بتانے کے لیے کیا کہ پیغمبر کا امتی ولی ہے، خدا نے اس کو علم الکتاب کی بنیاد پر یہ کرامت دی ہے کہ یہ لا سکتا ہے اور میں تو نبی ہوں تو اس سے اندازہ کر لو کہ نبی کے معجزے کی طاقت کتنی بڑی ہو گی؟! اس لیے خود نہیں لائے بلکہ اپنے ماتحت سے کہا کہ تم لے کر آؤ۔

اور یہ عرش کیسے لائے تھے؟ بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے تصرف کیا تھا۔ تصرف کہتے ہیں قلبی توجہ اور خیالی طاقت استعمال کرنے کو، وہ اس تخت کو اپنی خیالی طاقت سے لائے تھے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مستقل ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہی "التصرف" ہے اور اس میں پوری بحث کی ہے کہ خیالی اور قلبی توجہ کی حیثیت کیا ہے؟ دیکھو! ہمارے اکابر نے کوئی پہلو چھوڑا نہیں ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ یہ خیالی طاقت نہیں تھی بلکہ یہ اس کی کرامت تھی۔ اچھا جب کرامت تھی تو کرامت تو غیر اختیاری ہوتی ہے تو اس نے کیسے کہا کہ میں پلک جھپکنے سے پہلے لاؤں گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح یہ اس کی کرامت تھی اسی

طریقے سے یہ ان کا بھی کشف تھا اللہ کی طرف سے کہ تم یہ کہہ دو! جتنی جلدی تم کہو گے اتنی جلدی ہم لائیں گے، اگر ولی کی کرامت برحق ہے تو ولی کا کشف بھی تو برحق ہے، تو اس میں الجھن کی کون سی بات ہے؟

یہ بات کہنا اس لیے ضروری ہے کہ ایسے موقع پر ایسی تاویل کریں جو نصوصِ شرعیہ کے خلاف نہ ہو۔ اگر یہ کہیں گے کہ ولی کو اختیار ہے تو یہ نصوص کے خلاف ہے۔ تو جب کوئی ایک نص دیگر نصوص کے خلاف نظر آ رہی ہو تو وہاں مقام کے مناسب تاویل کرنی پڑتی ہے تاکہ نصوص کا باہمی تعارض نہ ہو۔

ملکہ بلقیس کی عقلمندی:

خیر! جب وہ تخت لے کر آ گئے تو سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ تخت کی ہیئت اور شکل وصورت تبدیل کر دو۔ جب ملکہ بلقیس وہاں پہنچی تو سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اَهٰكَذَا عَرْشُكِ﴾ بلقیس! تیرا تخت بھی ایسا ہی ہے؟ اس نے کہا: ﴿كَاَنَّهٗ هُوَ﴾ کہ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ ویسا ہی ہے۔ پھر اس نے خود کہا ﴿وَ اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿٤٢﴾﴾ اے سلیمان! ہمیں پہلے پتا چل گیا تھا کہ خدا نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے اور ہم آپ کی اطاعت اور فرمانبرداری پہلے ہی قبول کر چکے ہیں۔

اب قرآن کریم نے آگے اس عورت کی تعریف کی ہے، فرمایا: ﴿وَ صَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿٤٣﴾﴾ کہ اس عورت کو اللہ پر ایمان لانے سے اس بات نے روک رکھا تھا کہ وہ خدا کے علاوہ کسی اور کی عبادت کرتی تھی اور ایسی قوم سے تعلق رکھتی تھی جو کافر قوم تھی۔ ظاہر بات ہے کہ جب سارا ماحول کافروں کا ہو ایمان کی طرف توجہ نہیں ہوتی لیکن جب اسے اسلام کی طرف بلایا گیا تو فوراً ایمان لائی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ سمجھدار عورت تھی ضدی

نہیں تھی۔ ہاں بعض احوال ایسے تھے کہ جس نے اسے شرک کی طرف مائل کیا ہوا تھا لیکن جب تھوڑی سی دلیل سامنے آئی تو وہ شرک چھوڑ کر توحید کی طرف آگئی۔

شیشے کے محل میں داخلہ:

﴿قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا﴾

سلیمان علیہ السلام نے ان کے آنے پر جنات سے شیشے کا ایک محل بنوایا اور اس محل تک پہنچنے کے لیے درمیان میں ایک تالاب بنایا اور تالاب کے اوپر ایسا شیشہ فٹ کیا کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اوپر کچھ بھی نہیں ہے بس پانی ہی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ آؤ! میں تمہیں ایک محل دکھاؤں! اب ظاہر ہے کہ وہ بادشاہ تھی تو اسی کے مطابق اس کا استقبال ہونا ہے۔ جب آگئی تو قرآن پاک میں ہے ﴿وَ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا﴾ اس نے سمجھا کہ یہ تو پانی میں جانے لگی ہوں تو اس نے فوراً تھوڑے سے پائنچے اوپر کر لیے تاکہ پانی سے گیلے نہ ہوں۔ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ شیشہ ہے آپ آئیں۔ ﴿قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۴﴾﴾ اس نے کہا کہ اے میرے رب! میں نے آج تک اپنی جان پر ظلم کیا ہے، میں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اسلام قبول کرتی ہوں۔ فوراً کلمہ پڑھا۔ یہ خدا کا کتنا بڑا کرم ہوتا ہے کہ اللہ اتنی بڑی طاقت عطا فرمائے اور پھر بھی بندہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے۔

حضرت سلیمان اور ملکہ بلقیس کا نکاح ہوا یا نہیں؟

اس کے بعد ملکہ بلقیس کا سلیمان علیہ السلام کے ساتھ نکاح ہوا یا نہیں ہوا؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ آپ علیہ السلام نے اسے اپنے نکاح میں لے لیا تھا اور بعض

کہتے ہیں کہ نہیں لیا تھا اور بعض مفسرین کی رائے بہت پیاری ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس کا معاملہ ﴿وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۴﴾﴾ پر ختم ہو گیا۔ مطلب یہ کہ قرآن نے جہاں بات ختم کر دی وہاں تم بھی ختم کر دو۔ اس کے نکاح ہونے نہ ہونے سے تفسیر کا کیا تعلق ہے؟ اور بات صرف اتنی ہے کہ یہ معجزہ ہے یہ کرامت ہے یہ ولی ہے یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی ہے اور ملکہ بلقیس نے کلمہ پڑھ لیا بات ختم ہو گئی۔ البتہ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ نکاح ہوا تھا، سلیمان علیہ السلام نے نکاح کیا تھا اور اسے اپنے ملک پر برقرار رکھا تھا اور ایک مہینے میں تین دن حضرت سلیمان علیہ السلام ان کے ہاں جا کر ٹھہرتے تھے اور اس کو تین ایسے محل بنا کر دیے کہ جس کی مثال اس کی سلطنت میں نہیں تھی۔ سلیمان علیہ السلام کے لیے جانا کیا مشکل تھا؟! تخت پر بیٹھتے، وہ اڑا کر لے جاتا، پانچ سو کرسیاں تخت پر رکھی ہوئی ہوتی تھیں اور جہاں حکم ہوتا تخت اتر جاتا۔

عورتوں کی عقل کی چند مثالیں:

ملکہ بلقیس بہت سمجھدار تھی۔ یہ بات ذرا سمجھیں کہ ہمیشہ عورت مرد کی نسبت کم سمجھدار ہو ایسا نہیں ہوتا، یہ جو ہے کہ عورت ناقص العقل ہوتی ہے اس کا معنی یہ ہے کہ جنسِ عورت جنسِ مرد کے مقابلے میں ناقص العقل ہے لیکن ہر عورت ہر مرد کی نسبت ناقص العقل ہو یہ معنی اس کا ہرگز نہیں ہے۔ بعض عورتیں ایسی ہیں کہ مرد سے کئی گنا زیادہ عقلمند ہوتی ہیں اور بعض الجھنیں ایسی ہوتی ہیں جسے خاتون ہی حل کر سکتی ہے عام مردوں کے بس میں نہیں ہوتا۔

مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے مقام پر ہیں۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا آپ کے ساتھ ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خیمے میں ہیں اور آپ کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ کیا پریشانی

ہے؟ فرمایا کہ میرے ساتھ صحابہ ہیں، عربوں کا خون ہے، ہم مدینہ سے یہاں تک پہنچے ہیں، آگے مکے والے کہتے ہیں کہ ہم عمرہ نہیں کرنے دیں گے، میں نے صلح کر لی ہے، اب میں نے واپس جانا ہے اور میں انہیں کہوں کہ حلق یا قصر کروا کر احرام کھول دو! بہت مشکل ہے، یہ بات کیسے مانیں گے کیونکہ ان کے جذبات اتنے سخت ہیں کہ میں سوچ رہا ہوں کہ کون سی بات کروں کہ یہ فوراً مان لیں! حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر اجازت ہو تو میں عرض کروں؟ فرمایا: جی ہاں۔ یہ باتیں میں سمجھانے کے لیے اپنے الفاظ میں بتا رہا ہوں۔ فرمایا کہو! حضور! میری رائے یہ ہے کہ آپ انہیں کچھ بھی نہ کہیں، آپ خیمے سے باہر تشریف لائیں اور اپنا قصر کروا دیں، یہ آپ کے جانثار ہیں، آپ کو دیکھیں گے تو سارے خود بخود شروع ہو جائیں گے اور آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیمے سے باہر نکلے، بالوں کا قصر یا حلق کروایا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے دیکھا تو سارے شروع ہو گئے۔ اب دیکھیں! ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا مشورہ کتنا عمدہ اور اچھا تھا۔ اس لیے ہر عورت ہر مرد کے مقابلے میں ناقص العقل ہو ایسا نہیں ہوتا بلکہ جنسِ عورت جنسِ مرد کے مقابلے میں ناقص العقل ہوتی ہے۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

قصور تیرا ہے یا میرا!

اس موقع پر میں کئی بار یہ واقعہ سنایا کرتا ہوں کہ ابو حمزہ ایک شخص تھا۔ اس کے ہاں چار پانچ بچیاں پیدا ہوئیں، کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ تو ہمارے ہاں بھی یہی ہے اور ابو حمزہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ عورت منحوس ہے، اس کے ہاں بیٹا پیدا نہیں ہوتا لہذا دوسری شادی کر لو تاکہ بیٹا پیدا ہو جائے۔ تو ابو حمزہ کا بھی یہی ارادہ بنا اور اس نے گھر آنا چھوڑ دیا، اپنی بیوی سے قدرے نالاں تھے کہ اس کے ہاں بیٹا کیوں پیدا نہیں ہوتا؟ اس کی بیوی سمجھدار بھی تھی اور بلا کی شاعرہ بھی تھی۔ اس نے ابو حمزہ کے نام ایک خط لکھا

جس میں کچھ اشعار لکھے:

مَا لِأَبِيْ حَمْزَةَ لَا يَأْتِيْنَا غَضْبَانَ أَنْ لَّا نَلِدَ الْبَنِيْنَا

ابو حمزہ کو کیا ہو گیا کہ ہمارے پاس نہیں آتے، وہ اس بات پر ناراض ہیں کہ ہم بیٹا نہیں جنتیں۔

تَاللّٰهِ مَا ذٰلِكَ فِيْ أَيْدِيْنَا فَنَحْنُ كَالْأَرْضِ لِزَارِعِيْنَا

خدا کی قسم! بیٹا جننا ہمارے اختیار میں نہیں ہے، میری مثال زمین کی طرح ہے اور تمہاری مثال کسان کی طرح ہے۔

وَإِنَّمَا نَأْخُذُ مَا أُعْطِيْنَا وَنُنْبِتُ مَا ذَرَعُوْهُ فِيْنَا

زمین میں وہی بیج ہوتا ہے جو بیج کسان ڈالتا ہے اور زمین وہی پودا اگاتی ہے جو کسان نے بیج ڈالا ہوتا ہے۔[78]

ابو حمزہ! اب بتائیں کہ قصور میرا ہے یا آپ کا؟ ابو حمزہ نے معذرت کی اور واپس آکر ہنسنا اور بسنا شروع کر دیا۔ اب بتاؤ! کیسی اس نے سمجھداری کی بات کی ہے۔

میں نے جب پاکستان میں مسلک کا کام شروع کیا تو میں بڑی بھڑکتی خطابت، جذباتی اور بڑی رفتار سے بیان کرتا تھا، میں نے ٹھنڈے انداز سے کام شروع نہیں کیا کیونکہ قوم کو اٹھانا تھا تو قوم اٹھ گئی۔ میرے ایک دوست نے مجھے لاہور سے فون کیا کہ ہمارے گھر آپ کے بیان کی کیسٹ چل رہی تھی تو ہمارے محلے کی ایک خاتون نے کہا کہ یہ بیان مجھے بھی دو۔ اس نے بیان اپنے گھر لگا دیا۔ اس نے کہا کہ اللہ کی شان! اس کی نو بیٹیاں تھیں اور بیٹا کوئی نہیں تھا اور گھر میں اَن بَن رہتی تھی۔ جب عورت نے اس بیان کو سنا، رات شوہر آیا تو کہتی ہے کہ مولانا صاجب کی تقریر سنو! جب یہی واقعہ اس

78۔ تفسیر الشعراوی: ج1 ص4942 باب59، وغیرہ

نے گھر میں سنا تو اس کے شوہر نے معذرت کی کہ تیرا قصور نہیں ہے یہ میرا قصور ہے۔ اب دیکھو! عورت کتنی سمجھدار ہے۔ ناقص العقل ہے لیکن جنسِ مرد کے مقابلے میں۔

منکرین سماعِ موتیٰ کے استدلال کا جواب:

﴿اِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰى وَ لَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِيۡنَ ﴿۸۰﴾ وَ مَاۤ اَنۡتَ بِهٰدِى الۡعُمۡىِ عَنۡ ضَلٰلَتِهِمۡ ؕ اِنۡ تُسۡمِعُ اِلَّا مَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۱﴾﴾

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسلسل دعوت سے کفار نہ مانتے تو آپ غمزدہ ہوتے تھے۔ اللہ تعالی نے اپنے پیغمبر کو تسلی دی ہے کہ اے پیغمبر! ان کو سنانا آپ کے ذمے ہے، آپ سنا سکتے ہیں لیکن منوانا آپ کے بس میں نہیں ہے، اس لیے ان کے نہ ماننے پر آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوا کریں۔ جس طرح قبر پر آپ کسی مردے کو سنا دیں اور وہ بات قبول نہ کرے اسی طرح اگر یہ بات سنیں اور قبول نہ کریں تو یہ مردوں کی طرح ہیں۔ اس لیے یہ قلباً مردے ہیں، آپ زیادہ پریشان نہ ہوا کریں، آپ کے ذمے کفار کو سمجھانا ہے، کافر نہ سمجھیں تو آپ پریشان نہ ہوں، بس بات سنا کر اور سمجھا کر ختم کر دیں۔

ان آیات کے تحت بعض مفسرین سماعِ موتیٰ کی بحث شروع کر دیتے ہیں اور بعض لوگ ان آیات کے تحت بلاوجہ اس بحث کو چھیڑ دیتے ہیں حالانکہ ان آیات کا سماعِ موتیٰ کے مسئلے کے ساتھ دور کا بھی کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے۔ اللہ نے اپنے نبی کو سمجھانا ہے اور انہیں تسلی دینی ہے تو اس کے لیے اللہ رب العزت نے یہ تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ اب اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مردے سنتے نہیں ہیں یہ بالکل فضول سی بحث ہے۔ جو لوگ سماعِ موتیٰ کے منکر ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ حضور مردوں کو سنا

نہیں سکتے لہذا مردے سن بھی نہیں سکتے، کیوں؟ ﴿اِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰى وَ لَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ﴾ کہ اللہ نے موتیٰ کو تشبیہ دی ہے بہرے کے ساتھ اور یہ تشبیہ تب ہی صحیح ہوگی جب مردہ نہ سنے۔ اگر مردہ سن لے تو بہرے کے ساتھ تشبیہ کیسے درست ہوگی؟ تو یہ "صم" کا لفظ بتارہا ہے کہ مردہ نہیں سنتا۔ آپ اندازہ فرمائیں کہ کتنی بڑی بددیانتی اور دھوکہ دیا جارہا ہے!

ہم کہتے ہیں کہ پہلی بات یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے اِسماع کی نفی کی ہے اور اِسماع کی نفی سے سماع کی نفی نہیں ہوتی۔ یہ فرمایا ہے کہ آپ مردوں کو سنا نہیں سکتے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مردے سنتے بھی نہیں۔ قرآن کریم میں ہے: ﴿اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ﴾ اے پیغمبر! آپ جسے چاہیں اسے آپ ہدایت نہیں دے سکتے۔ اب اس کا معنی کوئی بندہ یہ کرے کہ "کسی کو ہدایت مل بھی نہیں سکتی" تو یہ معنی ہرگز درست نہیں ہے کیونکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت نہیں دے سکتے، ہدایت دینے کی نفی تو ہے لیکن کیا اس کی بھی نفی ہے کہ کسی کو ہدایت مل بھی نہیں سکتی؟ اس کی نفی نہیں ہے۔ تو نفیِ اِسماع سے نفیِ سماع نہیں ہوتا۔

اور یہ جو ان لوگوں کا استدلال ہے ﴿وَ لَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ﴾ سے کہ موتیٰ کو بہرے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اگر یہ سن لیں تو بہرے کے ساتھ تشبیہ کیسے ہوئی؟ تو ہم کہتے ہیں کہ قرآن کریم کے آغاز میں سورت بقرۃ کا دوسرا رکوع ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ فَهُمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ﴾ کہ یہ کفار بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، بہرے ہیں تو اب یہ حق کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ تو یہاں فرمایا "صُمٌّ" یہ کفار بہرے ہیں۔ تو کفار سنتے ہیں یا نہیں؟ کفار تو سنتے ہیں لیکن اللہ

فرماتے ہیں کہ یہ بہرے ہیں۔ فرمایا ''بُكْمٌ'' یہ کفار گونگے ہیں۔ ابو جہل اور اس کے ساتھی بولتے تو تھے تو پھر اللہ انہیں ''بُكْمٌ'' کیوں کہتے ہیں؟ ''عُمْيٌ'' یہ اندھے ہیں حالانکہ وہ دیکھتے تھے پھر ''عُمْيٌ'' کیوں فرمایا؟ تو ﴿وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ﴾ میں تو موتیٰ کو صرف ''الصُّمَّ'' فرمایا تو تمہیں اشکال ہو رہا ہے اور سورۃ البقرۃ میں کفار کو ''صُمٌّ'' بھی کہا، ''بُكْمٌ'' بھی کہا، ''عُمْيٌ'' بھی کہا حالانکہ یہ سنتے بھی تھے بولتے بھی تھے دیکھتے بھی تھے۔ اب اس کا کیا مطلب ہے؟ ذرا توجہ رکھنا! اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کفار سنتے ہیں لیکن قبول نہیں کرتے، یہ بولتے ہیں لیکن حق نہیں بولتے، یہ دیکھتے ہیں لیکن صحیح بات نہیں دیکھتے کہ دیکھ کر قبول کر لیں۔ تو ان کی حالت اس بہرے کی طرح ہے جو سنتا ہی نہیں ہے، اس گونگے کی طرح ہے جو بولتا ہی نہیں ہے، اس اندھے کی طرح ہے جو دیکھتا ہی نہیں ہے، اب دونوں برابر ہیں کیونکہ وہ سنتا نہیں اور یہ سنتے ہیں لیکن قبول نہیں کرتے، وہ دیکھتا نہیں اور یہ دیکھتے ہیں لیکن قبول نہیں کرتے، وہ بولتا نہیں اور یہ بولتے ہیں لیکن حق نہیں بولتے، تو ان کے دیکھنے، بولنے اور سننے کیا فائدہ ہے؟

بالکل اسی طرح اس آیت ﴿اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ﴾ میں موتیٰ کو تشبیہ دی ہے ''صُمٌّ'' کے ساتھ جس طرح وہاں کفار کو تشبیہ دی ہے ''صُمٌّ'' کے ساتھ، تو جو معنی کفار کو ''صُمٌّ'' کے ساتھ تشبیہ دینے کا وہاں ہو گا وہی معنیٰ موتیٰ کو ''صُمٌّ'' کے ساتھ تشبیہ دینے کا یہاں ہو گا۔ وہاں معنی یہ ہے کہ کافر بات سن بھی لے تب بھی کوئی فائدہ نہیں ہے اس لیے کافر بہرے کی طرح ہے اور یہاں معنی یہ ہے کہ مردہ سن بھی لے تب بھی کوئی فائدہ نہیں ہے اس لیے مردہ بہرے کی طرح ہے۔

منکرین حیات کو الزامی جواب:

ہم ایک اور بات کہتے ہیں کہ اگر تشبیہ دیکھنی ہے تو پھر تو قرآن کریم سے یہ تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ سنتے نہیں ہیں لیکن ساتھ یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ مردے دوڑتے بھی ہیں کیونکہ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَ لَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِیۡنَ ﴿۸۰﴾﴾ کہ جب ایک شخص بہرا ہو اور واپس دوڑے تو وہ نہیں سنتا۔ تو کیا مردے دوڑتے ہیں؟ (نہیں۔ سامعین) تو اللہ نے مردے کو کس بہرے سے تشبیہ دی ہے؟ بہرایا دوڑنے والا بہرا؟ (دوڑنے والا بہرا) تو پھر کیا مردے دوڑتے بھی ہیں؟ اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھیں کہ ایک چیز ہوتی ہے مقید اور ایک ہوتی ہے مطلق۔ وہاں صُمٌّ، بُکۡمٌ، عُمۡیٌ مطلق ہیں مقید نہیں ہیں اور یہاں "صُمّ" مقید ہے ﴿اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِیۡنَ﴾ کی قید کے ساتھ کہ یہاں اس بہرے سے تشبیہ ہے جو دوڑتا بھی ہو، اس کا معنی کہ یہ مردہ اس بہرے کی طرح ہے جو دوڑتا تو ہے لیکن سنتا نہیں ہے۔ تو اس سے تو پھر مردے کا دوڑنا ثابت ہو گا۔ منکرین حیات کہتے ہیں کہ ہم تو نہیں مانتے! میں نے کہا اب کیوں نہیں مانتے؟! جب قرآن کہہ رہا ہے تو پھر آپ کیوں نہیں مانتے؟ آپ نے آدھی بات مان لی اور آدھی بات چھوڑ دی۔ بھائی! جب مقید کے ساتھ تشبیہ دی ہے مشبہ بہ مقید ہے تو مشبہ بھی مقید ہو گا نا! مشبہ بہ مطلق ہے تو مشبہ بھی مطلق ہو گا! تو جو وجہِ تشبیہ ہے وہ قید کے ساتھ ہے اطلاق کے ساتھ نہیں ہے، آپ نے بات ماننی ہے تو پھر پوری بات مانو۔

"آپ اندھوں کو ہدایت نہیں دے سکتے!" کا معنی:

﴿وَ مَاۤ اَنۡتَ بِهٰدِی الۡعُمۡیِ عَنۡ ضَلٰلَتِهِمۡ ؕ اِنۡ تُسۡمِعُ اِلَّا مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۱﴾﴾

آپ اندھوں کو گمراہی سے بچا کر ہدایت کا راستہ نہیں دکھا سکتے۔ اب یہاں "عُمْیٌ" کسے کہا جارہا ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ مردے کو کہا جارہا ہے۔ قرآن کریم نے زندہ کفار کو "عُمْیٌ" کہا ہے کہ جو راہِ حق نہیں دیکھنا چاہتے تو تم انہیں کیسے دکھا سکتے ہو؟ ﴿اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا﴾ آپ اس کا ترجمہ کیا کریں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایمان والوں کو سنا سکتے ہیں، آپ کافروں کو نہیں سنا سکتے؟ ﴿اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى﴾ کا معنی آپ لوگوں نے یہ کیا کہ آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے اور اس کا نتیجہ یہ نکالا کہ مردہ سنتا نہیں ہے تو پھر ﴿اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا﴾ کے بارے میں کہیں کہ آپ کافر کو نہیں سنا سکتے لہذا کافر سنتا بھی نہیں ہے! کہتے ہیں جی! کافر تو سنتا ہے۔

میں نے کہا کہ آیتیں دونوں ایک طرح کی ہیں۔ تو آپ دونوں کو الگ الگ کیوں بیان کرتے ہیں؟ اس لیے اس کا صحیح معنی یہ ہے کہ یہاں اِسماع کی نفی ہو رہی ہے سماع کی نفی نہیں ہو رہی اور یہ جو اِسماع کی نفی ہو رہی ہے تو اس سے بھی اِسماع نافع اور قبول کی نفی ہو رہی ہے کہ آپ ان کو ایسا نہیں سنا سکتے کہ وہ قبول بھی کر لیں جیسے مردہ سن بھی لے تو قبول نہیں کرتا۔ تو اس آیت کا سماع موتی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، خواہ مخواہ لوگ اس کو چھیڑ دیتے ہیں اور جب وہ بیان کریں گے تو ہم تردید بھی کریں گے۔ بعض لوگ انبیاء علیہم السلام کے سماع کا انکار کرتے ہیں اور دلیل میں سورۃ فاطر کی آیت ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾﴾ پیش کرتے ہیں، میں ان شاء اللہ سورۃ فاطر کی تشریح میں اس کا ذکر کروں گا اور صحیح تشریح آپ کے سامنے رکھوں گا۔

اب آپ میرا ایک تعجب سننا! میرا تعجب یہ ہے کہ لوگ ان آیات کی روشنی

میں سماعِ موتی کی نفی عوام میں بیان کرتے ہیں اور جب ہم ان آیات کا صحیح معنی بیان کر کے عوام میں ان کا رد کرتے ہیں تو لوگ ہمیں کہتے ہیں کہ یہ عوام والا مسئلہ نہیں ہے، یہ تو علمی مسئلہ تھا عوام میں بیان نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے کہا کہ یہ مسئلہ ہم نے عوام میں بیان کیا ہے؟ بیان انہوں نے کیا تھا ہم نے تو رد کیا ہے، جو بیان کرنے والا ہے اس کو تو آپ کچھ نہیں کہتے اور جو رد کرنے والا ہے آپ اسے کہتے ہیں کہ تم نے علمی مسائل عوام میں شروع کر دیے۔ تو میں نے کہا کہ عوام میں پھر علمی مسائل بیان نہ کیا کریں تو کیا جہالت والے مسائل بیان کیا کریں؟! یعنی مسائل کی دو قسمیں ہیں؛ بعض علمی اور بعض جاہلانہ، درس گاہ میں علمی مسائل بیان ہونے چاہییں اور عوام میں جاہلانہ باتیں ہونی چاہییں، اس کا تو پھر یہی معنی ہو گا نا؟ بھائی فتنہ جب عوام میں ہو گا تو اس کا رد بھی تو عوام میں ہو گا!

میں نے آپ سے کئی بار کہا کہ آپ لوگ ہمیں اور ان کو برابر کی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ آپ بازار میں تھے آپ کے پاس موبائل تھا، ایک شخص آپ سے موبائل چھینتا ہے اور آپ اس سے موبائل واپس لے لیتے ہیں، پولیس دونوں کو پکڑے گی؟ (نہیں۔ سامعین) بھائی! ہمارا موبائل ہے وہ چھین رہا تھا، میں تو موبائل کو واپس لے رہا ہوں۔ یہ لوگ عوام میں صحیح عقیدہ کی تردید کر رہے ہیں اور ہم ان کی نفی کرتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ تم دونوں فتنہ باز ہو! بھائی دونوں ایک جیسے کیسے ہو گئے ہیں؟

اور سماعِ موتی کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے آپ حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک رسالہ "تکمیل الحبور بسماع اھل القبور" ہے اس کا مطالعہ فرمائیں، بڑے آرام سے مسئلہ سمجھ میں آ جائے گا۔ اللہ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

علامت قیامت؛ دابۃ الارض کا نکلنا

﴿وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوْقِنُوْنَ۠ ﴿٨٢﴾﴾

اور جب ہماری بات پوری ہونے کا وقت ان لوگوں کے پاس آ پہنچے گا یعنی قیامت قریب ہو گی تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے باتیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ یہ جانور اس لیے نکالیں گے کہ لوگ اللہ کی آیتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

قیامت کی دس علامات:

حضرت حذیفہ بن اَسِید غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہو گی جب تک دس علامات ظاہر نہ ہو جائیں۔

1: ”طُلُوْعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا“ سورج مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہو گا۔

2: ”وَخُرُوْجُ الدَّابَّةِ“ دابۃ الارض کا نکلنا۔ صفا پہاڑی جو حرم کے بالکل اندر ہے اور مطاف کے بالکل ساتھ ہے وہ پہاڑی پھٹے گی اور اس کے اندر سے ایک جانور نکلے گا مٹی جھاڑتا ہوا، مقام ابراہیم پر پہنچے گا تو کچھ لوگ وہاں سے دوڑ جائیں گے اور کچھ رہ جائیں گے، یہ ان کے چہرے کو نور سے منور کر دے گا اور یہ دنیا میں ہر کافر تک پہنچے گا، اب یہ کیسے پہنچے گا اس کا حال اللہ کو معلوم ہے، روایات میں بس اتنا ہی آیا ہے اور یہ لوگوں سے باتیں کرے گا کہ تم اللہ کی نشانیوں کو نہیں مانتے تھے، اب قیامت آ گئی، بار بار یہی کہے گا کہ تم نہیں مانتے تھے، تم نہیں مانتے تھے، تم نہیں مانتے تھے۔ اس کے

آنے کے بعد اگر کوئی کافر کلمہ پڑھنا چاہے گا تو نہیں پڑھ سکے گا چونکہ اب ایسی علامت آگئی ہے کہ کلمہ پڑھنے کا وقت ختم ہو گیا ہے۔

3: ”وَخُرُوجُ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ“ یاجوج ماجوج کا نکلنا۔

4،5،6: ”وَالدَّجَّالُ وَعِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَالدُّخَانُ“ دجال کا نکلنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نازل ہونا اور دھویں کا نکلنا۔

7،8،9: ”وَثَلَاثُ خُسُوفٍ خَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ وَخَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ وَخَسْفٌ بِجَزِيرَةِ الْعَرَبِ“ تین خسوف ہوں گے یعنی لوگ زمین میں دھنسنا شروع ہو جائیں گے، ایک خسوف مغرب میں، ایک مشرق میں اور ایک جزیرۃ العرب میں۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ یہ قیامت کے بالکل قریب قریب کی علامات ہیں۔

10: ”وَآخِرُ ذٰلِكَ تَخْرُجُ نَارٌ مِنَ الْيَمَنِ مِنْ قَعْرِ عَدَنَ تَسُوقُ النَّاسَ إِلَى الْمَحْشَرِ“ اور آخری علامت یہ ہو گی کہ وسط عدن سے ملک یمن میں ایک آگ نکلے گی جو پوری انسانیت کو گھیرنا شروع کر دے گی، لوگ جہاں سونا چاہیں گے وہاں آگ رک جائے گی، جہاں کھائیں گے رک جائے گی، یہ آگ لوگوں کو میدانِ محشر سرزمین شام کی طرف لائے گی۔ اور اس کے بعد پھر قیامت شروع ہو جائے گی۔ [79]

اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

79۔ سنن ابی داؤد، رقم:4311

سورۃ القصص

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿طٰسٓمّٓ ۝ تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ ۝ نَتۡلُوۡا عَلَيۡكَ مِنۡ نَّبَاِ مُوۡسٰى وَفِرۡعَوۡنَ بِالۡحَقِّ لِقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ۝﴾

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ:

اس سورت میں تفصیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو نقل فرمایا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ قرآن کریم میں کئی ایک مقامات پر ہے، سورت طٰہٰ میں، اس سورۃ القصص میں، سورۃ الاعراف میں اور بھی کئی سورتوں میں ہے۔

حدیث الفتون:

موسیٰ علیہ السلام کا پورا واقعہ سنن النسائی کتاب التفسیر میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ یہی واقعہ آپ دیکھنا چاہیں تو ﴿وَ فَتَنّٰكَ فُتُوۡنًا﴾ سورۃ طٰہٰ کے تحت تفسیر ابن کثیر میں دیکھ لیں، وہاں موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ اول تا آخر واقعہ موجود ہے اور یہ حدیث پاک ”حدیث الفتون“ کے نام سے معروف ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس حدیث میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے قبل فرعون مصر پر حاکم تھا۔ فرعون اور اس کے درباریوں میں یہ بات معروف تھی کہ بنی اسرائیل کے لوگ اس بات پر خوش ہیں کہ ان کی قوم میں بادشاہ بھی ہوں گے، ان کی قوم میں نبی بھی ہوں گے اور یہ بشارت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی ہے۔ پہلے ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہ نبی یوسف بن یعقوب ہیں، وہ فوت ہو گئے تو پھر ان کا خیال ہوا کہ کوئی اور نبی آنا ہے جو ہماری عزت کا باعث بنے گا، ہمیں غلامی سے نکالے گا۔ تو فرعون کی جو شوریٰ تھی انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ ایسا کریں کہ ان کے بچے قتل کریں اور خدمت کے لیے ان کی بچیاں زندہ رکھیں، نہ ان میں کوئی لڑکا ہو گا اور نہ بادشاہ بنے گا۔ اس کے لیے انہوں نے ایک پولیس متعین کر دی کہ جس گھر سے اطلاع ملے کہ یہاں بچے کی پیدائش ہوئی ہے اس کو لے کر ذبح کر دو۔ کچھ عرصہ جب بچوں کی اچھی خاصی تعداد ذبح کر لی تو اب ان کے ہاں اہم مسئلہ پیدا ہوا کہ بنی اسرائیل کے لوگ ہماری خدمت کرتے ہیں، جب ان کے بچے ذبح ہو جائیں گے تو ہماری خدمت کون کرے گا؟ اب انہوں نے دوبارہ اپنی اسمبلی کا اجلاس بلوایا۔ پھر مشورہ میں یہ طے ہوا کہ ایک سال بچوں کو ذبح کریں اور ایک سال بچوں کو زندہ رکھیں کیونکہ جو تھوڑے زندہ رہیں گے ان کی تعداد اتنی کم ہو گی کہ ہمارے اوپر حکومت نہیں کر سکیں گے۔ اب انہوں نے یہ طے کر لیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے ہاں حضرت ہارون علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جس سال بچوں کو ذبح نہیں کرنا تھا اس لیے حضرت ہارون علیہ السلام کی پیدائش پر ان کی والدہ کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ آئندہ وہ سال تھا کہ جس سال بچوں کو ذبح کرنا تھا اس سال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ امید کے ساتھ تھیں تو

ان کو یہ پریشانی بہت زیادہ تھی کہ اگر اس سال میرے ہاں بچہ پیدا ہوا تو یہ لوگ اسے مار دیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ﴿وَ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا﴾ کہ یہ آزمائش ان آزمائشوں میں سے سب سے پہلی آزمائش تھی جو موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے لیے تھی اور اس مرحلے سے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ گزری ہیں۔

ام موسیٰ کی طرف پیغام اور قادیانی استدلال:

﴿وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَ لَا تَخَافِىْ وَ لَا تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝﴾

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ جب امید کے ساتھ تھیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس وحی بھیجی کہ جب تمہارا بچہ پیدا ہو جائے تو اسے دودھ پلاتی رہنا، جب کوئی خطرہ محسوس ہو تو اس بچے کو دریا میں ڈال دینا اور ڈرنا مت نہ ہی غمگین ہونا۔ ہم اس بچے کو تمہارے پاس ضرور بالضرور پہنچائیں گے اور اسے رسول بنائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تسلی دی موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو۔ یہ اشارہ تھا کہ آپ کا بچہ آپ کی گود میں پلے گا، اس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی، یہ قتل نہیں ہو گا اور یہ بڑا بھی ہو گا۔

یہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر وحی آئی اس کے لیے قرآن کریم میں یہ الفاظ ہیں ﴿وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى﴾ اس سے مرزا قادیانی اور اس کی جماعت استدلال کرتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبی نہیں تھیں پھر بھی ان پر وحی آئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وحی ختم نہیں ہوئی بلکہ وحی کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کی طرف بھی وحی فرمائی ہے ﴿وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى

﴿النَّحۡلِ﴾[80]

وحی الہام اور وحی نبوت:

یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ وحی کی دو قسمیں ہیں:

ایک ہوتی ہے وحی الہام اور ایک ہوتی ہے وحی نبوت۔ ان اقسام کو وحی تشریعی اور وحی غیر تشریعی بھی کہتے ہیں۔ وحی الہام وہ ہوتی ہے کہ جس پر وحی ہو اس کا تعلق اس کی ذات کے ساتھ ہو اور وحی نبوت وہ ہوتی ہے کہ جس پر وحی نازل ہو اس وحی کا تعلق اس کی ذات کے ساتھ نہ ہو بلکہ دوسرے افراد کے ساتھ ہو۔ پیغمبر پر جو وحی آتی ہے اس کا تعلق اس پیغمبر کی ذات سے نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق پیغمبر کی دعوت، پیغمبر کی تبلیغ اور پیغمبر کی شریعت کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ جو مکھی پر وحی آئی ہے اس کا تعلق دوسروں سے نہیں ہے بلکہ مکھی کی ذاتی زندگی سے ہے، اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر وحی آئی ہے تو اس وحی کا تعلق ان کی ذاتی زندگی سے ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بسا اوقات ہم "وحی" کے لفظ سے پریشان ہو جاتے ہیں اور ہمارا عام طور پر جواب یہ ہوتا ہے کہ ایک ہے وحی لغوی اور ایک ہے وحی اصطلاحی، اور ﴿وَ اَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ﴾ میں وحی لغوی مراد ہے۔ اس لیے اچھی طرح سمجھ لیں کہ وحی الہام اور وحی نبوت الگ الگ چیز ہیں، وحی نبوت یہ پیغمبر کے ساتھ خاص ہے اور وحی الہام یہ پیغمبر کے ساتھ خاص نہیں ہے، کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنا کوئی پیغام کسی کے دل میں ڈالتے ہیں تو یہ وحی الہام ہے۔

پھر بسا اوقات ہم وحی لغوی اور وحی اصطلاحی کے الفاظ کہتے ہیں تو یہ اصطلاحی وحی نبی کے ساتھ خاص ہے اور لغوی وحی بمعنی پیغام یہ غیر نبی کے ساتھ بھی

80۔ النحل 68:16

ہو سکتا ہے۔

امِ موسیٰ کی پریشانی:

خیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو تسلی مل گئی۔ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ انہوں نے بچے کو صندوق میں ڈال کر دریا کے حوالے کر دیا۔ جب انہوں نے بچے کو دریا میں ڈالنا تھا تو اس وقت شیطان نے وسوسہ ڈالا، اس نے کہا کہ دیکھو! بچے کو اپنے پاس رکھو، دریا کی موجوں میں جائے گا تب بھی مر جائے گا اور اگر کوئی اس کو اٹھالے گا اور ذبح ہو جائے گا تو تمہارے سامنے تو قتل ہو گا، اس کو خود کفن دو گی، دفن کرو گی، اپنے بیٹے کو دیکھ تو لو گی اور اگر ایسی جگہ چلا گیا تو تمہیں دیکھنا بھی نصیب نہیں ہو گا۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو جو اللہ کی طرف سے الہام تھا وہ اس موقع پر بھول گیا کہ خدا نے مجھے تسلی دی کہ ایسا نہیں ہو گا، اس لیے انہیں تھوڑی سی پریشانی بھی ہوئی۔ یہ عام طور پر بندے کو بات سمجھ نہیں آتی کہ جب اللہ کی طرف سے الہام تھا تو بھول کیسے گیا؟ اب دیکھو! قرآن کریم اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے نازل فرمایا اور قرآن کریم کے حافظ کو آیات یاد بھی ہوتی ہیں اور وہ ان کو سمجھتا بھی ہے لیکن جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کبھی صبر کا دامن چھوڑ بھی دیتا ہے۔ جب کوئی اسے یاد کرائے کہ قرآن میں ہے: ﴿وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ﴾ [81] کہ صبر اور نماز کے ذریعے اللہ سے مدد مانگو! اب اس حافظ کو یاد آ جاتا ہے اور پھر اس کو صبر کی توفیق مل جاتی ہے۔ تو دیکھو کہ اس کے پاس اللہ کا پیغام ہوتا ہے لیکن پھر بھی بھول جاتا ہے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے پاس پیغام موجود تھا لیکن وہ بھول گئیں۔ یہ میں نے اس لیے عرض کیا کہ بسا اوقات بندے کو الجھن ہوتی ہے کہ

81۔ البقرۃ 45:2

اللہ کا پیغام کیسے بھول گئی؟ دیکھیں! حضرت آدم علیہ السلام جنت میں تھے، اللہ نے فرمایا تھا: ﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾[82] اس درخت کے قریب نہ جانا لیکن آدم علیہ السلام بھول گئے۔ اب آدمی کو تعجب ہوتا ہے کہ جب اللہ کا حکم تھا تو بھولے کیسے؟! شیطان نے کیسے بھلا دیا؟ تو اس سوال کے جواب کی میں نے آسان سی صورت بتائی ہے کہ قرآن کے حافظ کو قرآن یاد ہوتا ہے، عالم کو کسی مسئلے پر آیات یاد ہوتی ہیں لیکن موقع پر بھول جاتا ہے اور بعد میں اس کو یاد آجاتی ہیں۔

صندوق دریا میں ڈال دیا:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے موسیٰ علیہ السلام کو ایک صندوق میں ڈالا اور دریائے نیل کے حوالے کر دیا۔ دریائے نیل کا ایک حصہ فرعون کے محل کے طرف سے ہو کر گزرتا تھا تو یہ صندوق اس طرف چلا گیا۔ آگے چٹان تھی جہاں فرعون کی کنیزیں نہاتی تھیں، کپڑے دھوتی تھیں، سارے کام کرتی تھیں تو اللہ نے اس صندوق کو ان کے قریب کر دیا۔ انہوں نے صندوق دیکھا تو کہا کہ اگر اس کو کھولیں تو ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی مال ہو اور جب سامان فرعون کی بیوی کو دیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ شک کرے کہ تم نے کچھ مال تم نے رکھ لیا ہو گا تو بہتر ہے کہ اسی کے پاس جا کر صندوق کھولیں۔ جب فرعون کی بیوی آسیہ اس نے صندوق کو کھولا، دیکھا تو پہلی نظر میں اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کی محبت اس کے دل میں ڈال دی، ﴿وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ﴾ اللہ فرماتے ہیں کہ اے موسیٰ! ہم نے خاص طور پر آپ پر اپنی محبت ڈالی ہے کہ جو آپ کو دیکھتا ہے آپ اس کے محبوب بن جاتے ہیں۔

82۔ البقرة 35:2

ولی سے محبت کی وجہ:

بعض علماء نے اس سے استدلال کیا ہے کہ جس طرح اللہ نے موسیٰ علیہ السلام پر محبت ڈال دی تھی تو جو اللہ کا ولی ہوتا ہے اللہ اس کو بھی شانِ محبوبیت عطا فرما دیتے ہیں کہ لوگ اس سے محبت کرتے ہیں۔ اس پر بھی آپ کو شبہ ہو گا کہ کتنے ولی ہیں کہ لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ محبت کیسے ڈالتے ہیں؟ یہ بات یاد رکھنا! محبوبیت کا معنیٰ ہوتا ہے کہ جو لوگ اللہ سے پیار کرتے ہیں وہ اس ولی سے بھی پیار کرتے ہیں اور جو اللہ سے پیار نہیں کرتے وہ اللہ کے اس ولی سے کیسے پیار کریں گے؟ محبت تو ولی اور اللہ سے تعلق کی وجہ سے ہے، اللہ سے محبت ہو گی تو اللہ کے ولیوں سے محبت بھی ہو گی۔ اب دیکھو! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کائنات کی محبوب ترین شخصیت ہیں اور ابو جہل جب قتل ہونے لگا تو اس نے اس وقت کہا تھا کہ محمد - صلی اللہ علیہ وسلم - کو میرا پیغام دینا کہ جتنی نفرت میں آپ سے پہلے کرتا تھا آج اس سے زیادہ کرتا ہوں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ جب اس کو اللہ سے پیار نہیں تو اللہ کے محبوب سے کیسے پیار ہو گا؟!

اس کو میں عام مثال میں یوں سمجھاتا ہوں کہ مثلاً ہمارا ادارہ مرکز اھل السنۃ والجماعۃ ہے، جو آدمی اس سے پیار کرتا ہے تو وہ یہاں پڑھنے والے طالب علم سے بھی پیار کرتا ہے اور جو مرکز سے نفرت کرتا ہے وہ طالب علم سے بھی پیار نہیں کرے گا۔

موسیٰ علیہ السلام کی محبوبیت:

خیر اس کے دل میں محبت ڈالی۔ اس نے کہا کہ اس کو سنبھال کے رکھتے ہیں۔ اس کو مارتے نہیں ہیں۔ اس کو بچہ پیارا لگا۔ جو نہی گھر میں یہ خبر پھیلی تو وہ جو فرعون نے سپاہی چھوڑے تھے بچوں کو قتل کرنے کے لیے وہ فوراً پہنچ گئے، یہ بچہ ہمیں دے دو ہم نے اس کو ذبح کرنا ہے۔ فرعون کی بیوی نے کہا کہ میں فرعون سے بات کر لیتی ہوں،

اگر اجازت مل گئی تو ٹھیک ہے ورنہ تم اس کو ذبح کر دینا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس واقعہ کو ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ ﴿وَ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا﴾ کی آزمائشوں میں سے یہ دوسری آزمائش تھی۔

وہ فرعون کے پاس گئی تو اس نے فرعون کو بچہ دکھایا اور کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ ہم اس کو پالیں، اس کو مارنا نہیں ہے، یہ ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنے گا۔ فرعون نے کہا کہ یہ تیری آنکھوں کی ٹھنڈک تو ہو سکتا ہے لیکن میری آنکھوں کی ٹھنڈک نہیں ہو سکتا۔ فرعون نے کہا کہ اس کو ذبح کر دو! بیوی نے کہا کہ ذبح مت کرو، ایک بچے کے زندہ رہنے سے کون سی حکومت آتی ہے؟! ہر سال تم ذبح کرتے ہو، اگر ایک زندہ رہ گیا تو کون سی بادشاہت ان کی وجہ سے آنی ہے؟ فرعون نے کہا کہ تیرے کہنے پر میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔

بعض روایات میں ہے کہ جب فرعون نے یہ کہا کہ یہ تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے مجھے اس کی حاجت نہیں ہے، اگر وہ یہ جملہ کہہ دیتا کہ یہ تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو گا تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک بھی ہو گا تو اللہ اس کو ایمان کی توفیق عطا فرما دیتے۔ اس کی بیوی کو ایمان کی توفیق ملی ہے کیونکہ اس نے کہا تھا کہ یہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کا اپنی ماں کا دودھ پینا:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلانے لگے تو آپ کسی کا دودھ نہیں پیتے تھے۔ دایہ تلاش کیں لیکن آپ کسی کا دودھ نہیں پیتے تھے۔ آسیہ نے موسیٰ علیہ السلام کو کنیزوں کے حوالے کیا کہ اس کو شہر میں لے جاؤ اور کوئی ایسی عورت تلاش کرو جس کا دودھ یہ پی لیں۔ کنیزیں بازار میں پھر کر دایہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ ادھر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اپنی بیٹی سے کہا کہ باہر جاؤ اور لوگوں سے پتا کرو کہ اس

تابوت اور بچے کا کیا بنا؟ موسیٰ علیہ السلام کی بہن باہر گئی تو دیکھا کہ کنیزیں بچے کو لے کر دودھ پلانے کے لیے دایہ کو تلاش کر رہی ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے ان سے کہا کہ میں تمہیں ایک عورت بتاتی ہوں وہ دودھ بھی پلائے گی اور اس کا خیال بھی رکھے گی اور اس کی خیر خواہ بھی ہو گی۔ ان کنیزوں کو شک پڑا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ عورت اس بچے کوئی خاص رشتہ دار نہ ہو جو اتنے یقین سے کہہ رہی ہے کہ اس گھر والے اس بچے کا خیال رکھیں گے۔ تو انہوں نے کہا کہ اس کا مطلب کہ تم جانتی ہو بچہ کس کا ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا﴾ کی آزمائشوں میں سے یہ تیسری آزمائش ہے۔

اس نے کہا کہ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں اس کی ماں کو جانتی ہوں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اس گھر کا دودھ اس بچے نے پی لیا تو اس عورت کو فرعون کے دربار میں ایک مقام مل جائے گا، اس کو پیسے ملیں گے تو وہ بچے کے ساتھ ضرور خیر خواہی کرے گی، میں تو یہ کہنا چاہتی ہوں۔ ان کنیزوں کو اس بات سے تھوڑی سی تسلی ہو گئی تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی بہن کو چھوڑ دیا۔ موسیٰ علیہ السلام کی بہن فوراً گھر پہنچی اور یہ سارا قصہ والدہ کو بتایا۔ دونوں اس جگہ آئیں جہاں کنیزیں کھڑی تھیں۔ کنیزوں نے بچہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے حوالے کیا، انہوں نے دودھ پلانا شروع کر دیا تو فوراً بچے نے ان کا دودھ پینا شروع کر دیا اور پیٹ بھر کر پیا۔

فرعون کی بیوی نے یہ بات سنی کہ بچے نے دودھ پینا شروع کر دیا ہے تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو اپنے پاس بلایا۔ وہ چلی گئیں۔ اس نے کہا کہ تم یہاں ٹھہرو اور بچے کو دودھ پلاؤ، تمہارا خرچہ ہمارے ذمے ہو گا۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے شانِ بے نیازی کا مظاہرہ کیا تا کہ پتا نہ چلے کہ یہ اسی بچے کی ماں ہے، کہا کہ پہلے میرے پاس ایک بچہ گھر میں ہے، میں اس کو پالتی ہوں، میں اس

کو گھر میں کیسے چھوڑوں؟! یہ حضرت ہارون تھے جو ایک سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔ اگر اس کو دودھ پلانا ہے تو میرے پاس بھیج دو، میں اپنے گھر میں اس کو دودھ پلاؤں گی اور میں تمہیں ضمانت دیتی ہوں کہ اس بچے کا خیال بھی رکھوں گی۔ فرعون کی بیوی نے کہا کہ مجھے اس سے پیار بہت ہے، میں اس سے جدا نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے کہا کہ بہر حال میں آپ کے محل میں نہیں رہ سکتی۔ تو اس نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ماں کے حوالے کر دیا۔

موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کی ڈاڑھی پکڑنا:

جب موسیٰ علیہ السلام کچھ تھوڑے سے بڑے ہوئے چلنے کے قابل ہوئے تو فرعون کی بیوی نے پیغام بھیجا کہ بچہ ہمیں دکھانے کے لیے لاؤ، میں اس کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام کو لایا گیا۔ فرعون کی بیوی نے شاہی حکم جاری کیا کہ جب وہ دایہ بچے کو لے کر آئے تو تم سب ہدایا دو۔ موسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کے ساتھ گھر سے نکلے تو ان کی والدہ کو ہدیے ملنا شروع ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ شاہی حکم تھا۔ جب دربار میں پہنچے تو بہت سارے ہدیے جمع ہو گئے، اس نے یہ سارے ہدیے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے حوالے کر دیے کہ یہ بھی تمہارا مال ہے، تم اس کو لے جاؤ۔

اس کے بعد فرعون کی بیوی نے کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ اس کو فرعون سے بھی کچھ ہدیہ مل جائے۔ تو وہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے دربار میں لے گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی گود میں تھے۔ آپ نے فرعون کی ڈاڑھی کو پکڑ کر ایسے کھینچا کہ فرعون زمین کی طرف جھک گیا۔ اسی وقت اس کی شوریٰ نے کہا کہ یہ وہی بچہ ہے جو تمہاری حکومت ختم کرے گا، اس کو ذبح کر دو ورنہ تمہارے لیے مسئلہ پیدا ہو گا۔ اسی وقت فرعون نے آرڈر جاری کیا کہ اس کو ذبح کر دو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ چوتھا موقع تھا آزمائش کا۔ یہ موسیٰ علیہ السلام پر ایک اور

امتحان تھا۔

فرعون کی بیوی کھڑی ہوئی۔ اس نے کہا: یہ ظلم نہ کرو، دیکھو! تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، اپنے وعدے کی لاج رکھو! اگر تمہیں شبہ ہے تو یہ شبہ دور کر لیتے ہیں۔ میں ایک طرف دو موتی رکھ دیتی ہوں اور ایک طرف آگ کے دو انگارے رکھ دیتی ہوں۔ اگر یہ موتی کی طرف جائے تو سمجھو کہ یہ سمجھ دار ہے اور اس نے جان بوجھ کر تمہیں جھٹکا دیا ہے اور اگر انگاروں کی طرف جائے تو سمجھو کہ بچہ ہے، بس جان بوجھ کر نہیں کیا غفلت میں کیا ہے جیسے بچے بڑوں کے ساتھ کر دیتے ہیں۔ فرعون مان گیا تو دو موتی اور دو آگ کے انگارے موسیٰ علیہ السلام کے سامنے رکھ دیے گئے۔

بعض روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جانے لگے موتی کی طرف تو جبرئیل علیہ السلام نے ہاتھ پکڑ کر دوسری طرف کیا اور بعض روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام خود گئے اور آگ کے انگارے کو لیا۔ اب ظاہر ہے کہ بچہ آگ کے انگارے کو لے تو بچہ پھینکتا نہیں ہے، وہ پریشان ہو جاتا ہے کہ میں اس کے ساتھ کیا کروں؟ یہ میں شبہ کا جواب دے رہا ہوں کہ انہوں نے آگ کا انگارہ رکھا کیسے؟ گرم تھا تو فوراً پھینک دیتے، چھوڑ دیتے، ہاتھ میں کیسے رکھ لیا؟ آپ کسی بچے کے ہاتھ میں برف دو وہ ٹھنڈی ہوتی ہے وہ بچہ روتا ہے لیکن پھینکتا نہیں ہے، اس کو سمجھ نہیں آتی کہ میں اس کے ساتھ کروں کیا! تو موسیٰ علیہ السلام نے آگ کا انگارہ اٹھایا اور پھر فرعون نے آگے بڑھ کر آگ کا انگارہ نیچے کیا۔ فرعون کی بیوی نے کہا کہ میں تمہیں کہتی تھی کہ یہ بچہ ہے، تم خواہ مخواہ پریشان ہو گئے ہو۔ اس وقت واپس لے آئی اور موسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ کے حوالے کر دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پرورش پاتے رہے، جوان ہوئے۔ ان کو دربارِ شاہی کا تقرب ملا۔ اس لیے ان کا ایک خاص مقام تھا۔ کوئی چھیڑ خانی نہیں کرتا تھا کہ یہ

فرعون کے دربار کے خاص آدمی ہیں۔ یہ اپنی قوم بنی اسرائیل کا خیال بھی رکھتے تھے، کسی کو زیادتی نہیں کرنے دیتے تھے اور کسی کو ڈانٹ بھی دیتے تو کوئی بولتا بھی نہیں تھا کہ یہ فرعون کے خاص آدمی ہیں۔

قبطی کا قتل:

اسی دوران موسیٰ علیہ السلام جب گھر سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ایک قبطی یعنی فرعون کے قبیلے کا آدمی ایک اسرائیلی یعنی موسیٰ علیہ السلام کے قبیلے والے آدمی سے جھگڑا کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو سمجھایا کہ تم کیوں ظلم کرتے ہو؟ کیوں زیادتی کرتے ہو؟ موسیٰ علیہ السلام سمجھے کہ زیادتی قبطی کی ہے تو آپ نے چھڑانے کے لیے اور تھوڑی سی تنبیہ کرنے کے لیے اس کو مکا مارا تو وہ مر گیا۔ موسیٰ علیہ السلام بھی چلے گئے اور اسرائیلی بھی چلا گیا۔ اب بات مشہور ہو گئی کہ کسی اسرائیلی نے اس کو قتل کر دیا ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ قتل تو ہو گیا لیکن قاتل کون ہے؟ قاتل تلاش کر رہے تھے اور قاتل ملتا نہیں تھا۔

موسیٰ علیہ السلام اس پر پریشان تھے کہ میرا پتا چل گیا تو فرعون مجھے قصاص میں مار دے گا۔ یہ چھپ رہے تھے کہ میرا پتا نہ چلے۔ دوسرے دن موسیٰ علیہ السلام آئے تو وہی اسرائیلی آدمی کسی اور قبطی سے جھگڑا کر رہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں تشریف لے گئے۔ آپ نے پہلے تو اس قبطی کو سمجھایا پھر اس اسرائیلی کو تنبیہ کی۔ کہا کہ تو ہی جھگڑالو ہے تیری عادت ہے جھگڑا کرنا، تو کل بھی جھگڑا کر رہا تھا اور آج بھی جھگڑا کر رہا ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام اس پر غصہ ہوئے اور تھوڑا سا آگے بڑھے تو اس کو شک پڑا کہ آج میری باری ہے، یہ اسرائیلی فوراً بول پڑا کہ کل بھی آپ نے ایک بندے کو قتل کیا تھا اور آج مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں! اتنی بات ہوئی۔ خیر جھگڑا ختم ہو گیا

اور وہ قبطی چپ چاپ وہاں سے چلا گیا اس نے جا کر دربار میں شکایت کی کہ قاتل موسیٰ علیہ السلام ہیں اور دلیل کے طور پر یہ واقعہ پیش کیا۔ فرعون نے بندے بھیجے کہ جاؤ اور موسیٰ کو قتل کر دو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ پانچواں موقع ہے آزمائش کا۔

فرعون کے آدمی موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے نکل پڑے۔ یہ لوگ شہر کی بڑی سڑک کے ذریعے موسیٰ علیہ السلام کی تلاش میں نکلے بائی روڈ جیسے سرکاری گاڑیاں چلتی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کی حمایت والا ایک شخص تھا جسے پتا چل گیا کہ سپاہی موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے نکل پڑے ہیں، وہ گلی کوچوں سے ہوتا ہوا موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا اور آ کر موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ موسیٰ! دوڑو تمہارے قتل کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام وہاں سے نکلے اور پھر مدین کی طرف چل پڑے۔

شہری افضل یا دیہاتی، ایک دلچسپ مکالمہ

﴿وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى﴾

اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ میں درجہ اولیٰ جامعہ بنوریہ کراچی میں تھا تو ہمارے ایک استاد تھے جامعہ بنوریہ میں انہوں نے درجہ ثالثہ میں بات شروع کر دی کہ شہری دیہاتی سے افضل ہوتا ہے۔ جب چھٹی ہوئی تو لڑکے ملے تو انہوں نے مجھے بھی کہا کہ آج ہمارے ہاں یہ بات چلی ہے۔ میرا چونکہ شروع سے ہی گفتگو کا مزاج تھا تو میں نے طلبہ سے کہا کہ دعا کرو استاد جی ہماری کلاس میں یہ بات شروع کریں۔ خیر انہوں نے اگلے دن ہماری کلاس میں یہ بات شروع کر دی کہ شہری دیہاتی سے افضل ہوتا ہے اور وہ تھے تو پکے تبلیغی لیکن مزاج ان کا گفتگو والا تھا۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ کوئی خارجی وجہ نہ ہو تو بالذات شہری دیہاتی سے

افضل ہوتا ہے، دیہاتی سخت دل ہوتے ہیں، بات نہیں سمجھتے، تعلیم نہیں ہوتی یہ باتیں اپنی جگہ پر ہیں لیکن چونکہ ہم نے تھوڑی سی بات کرنی تھی اس لیے میں نے کہا: استاد جی! شہری دیہاتی سے افضل ہوتا ہے یہ بات دلیل کے ساتھ ہے یا بغیر دلیل کے ہے؟ فرمانے لگے: بہت سے دلائل ہیں۔ میں نے کہا کہ ہمیں بھی کوئی دلیل دے دیں۔ استاد جی فرمانے لگے: قرآن کریم میں ہے: ﴿وَ جَآءَ رَجُلٌ مِّنۡ اَقۡصَا الۡمَدِیۡنَۃِ یَسۡعٰی﴾ کہ ایک شہری آدمی تھا جس نے موسیٰ علیہ السلام کی جان چھڑائی تھی۔ میں نے کہا: استاد جی! یہ بندہ شہری نہیں تھا دیہاتی تھا، "اَقۡصَا" اقصی مضاف ہے اور "الۡمَدِیۡنَۃِ" مضاف الیہ ہے اور مضاف مضاف الیہ میں اصل تغایر ہوتا ہے، وہ شہر سے نہیں تھا بلکہ شہر سے باہر دیہات سے آیا تھا، وہ ہمارا بندہ تھا آپ کا نہیں تھا۔ آپ کوئی اور دلیل پیش فرمائیں۔

استاد جی فرمانے لگے کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ کُفۡرًا وَّ نِفَاقًا﴾ کہ دیہاتی کفر اور نفاق میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اسی قرآن کریم میں ہے: ﴿وَ مِنۡ اَہۡلِ الۡمَدِیۡنَۃِ مَرَدُوۡا عَلَی النِّفَاقِ﴾ کہ مدینہ یعنی شہر کے لوگوں میں بھی کچھ لوگ نفاق میں ماہر ہو گئے ہیں، اور قرآن نے دیہاتیوں کی تعریف بھی کی ہے: ﴿وَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ﴾ کہ دیہاتیوں میں سے کئی لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ تنبیہ بھی فرماتے ہیں: ﴿اَلَاۤ اِنَّہَا قُرۡبَۃٌ لَّہُمۡ﴾ کہ انہی دیہاتیوں کے لیے فضیلت بھی ہے۔ استاذ جی! آپ نے ایک حصہ تو پیش کیا اور دو حصے آپ نے چھوڑ دیے، اب یہ دلیل بھی ٹوٹ گئی۔

مجھے کہتے ہیں کہ جو دیہاتی تہبند پہنتے ہیں اس سے کبھی کبھی بندے کا ستر کھل

جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ ہمارا تو کبھی کبھی کھلتا ہے اور شہریوں کا تو روزانہ کھلتا ہے۔ حدیث پاک میں علاماتِ قیامت میں ایک علامت یہ بیان کی گئی ہے کہ ایسی عورتیں ہوں گی کہ کپڑے پہنے ہوں گی لیکن پھر بھی ننگی ہوں گی تو شہری تو کپڑے پہن کر بھی ننگے ہوتے ہیں اور ہمارا تو کبھی کبھی ستر کھلتا ہے۔ میں نے کہا کہ استاذ جی! ہمارا تہبند کبھی کبھی کھلتا ہے تو آپ کو نظر آگیا ہے اور شہریوں کا ہر وقت پینٹ پہن کر بھی کھلا ہوتا ہے ہم نے تو کبھی اعتراض نہیں کیا۔

میں نے کہا کوئی اور دلیل؟ مزاح میں فرمانے لگے: تم مان لو! میں نے کہا: استاذ جی ہم تو نہیں مانتے کیونکہ میں نے تو پہلے آپ سے کہا تھا کہ دلیل کے ساتھ یا بلا دلیل؟ تو آپ نے فرمایا تھا دلیل کے ساتھ، آپ شروع میں فرماتے کہ بلا دلیل مان لو تو ہم مان لیتے، اب تو استاذ جی دلیل سے بات چلے گی۔ بس گاڑی رک گئی پھر آگے نہیں چلی۔ اگرچہ بالذات شہری، دیہاتی سے افضل ہوتا ہے لیکن میں نے محبت میں استاذ جی سے تھوڑی سی گفتگو کر لی۔

اور طالب علمی میں میری عادت تھی شاید آپ کو یقین نہ آئے، بسا اوقات درس گاہ میں ہماری تین تین دن بات چلتی رہتی تھی، سبق رک جاتے تھے، لگے رہتے تھے استاد بھی اور ہم بھی، اور الحمد للہ مجھے یاد نہیں ہے کہ کبھی بھی کسی گفتگو میں نتیجہ یہ نکلا ہو کہ ہم پیچھے ہٹ گئے ہوں! کبھی صَرف پر بحث ہو جاتی، کبھی حیات پر بات ہو جاتی، کبھی کسی اور مسئلے پر شروع ہو جاتے۔ جب کبھی درس گاہ میں استاذ جی حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مماتیت کے خلاف دلائل دیتے تو میں مماتیت کی طرف سے شروع ہو جاتا کہ استاذ جی یہ آیت بھی ہے، یہ آیت بھی ہے، استاذ جی کہتے: اچھا! کچھ دانے ایسے بھی ہیں! ان کو شک پڑتا کہ شاید یہ مماتی ہے لیکن حاشا وکلا کبھی بھی کسی استاذ کی رتی برابر بھی دل میں حقارت نہ آئی اور نہ آنی چاہیے۔ یہ درس گاہ کا ماحول ہوتا

ہے۔ خانقاہ کا ماحول الگ ہوتا ہے اور درس گاہ کا ماحول الگ ہوتا ہے۔

خانقاہ اور درس گاہ کے ماحول میں فرق:

ایک خاتون ہیں اور مجھ سے بیعت ہیں۔ انہوں نے مسئلہ پوچھا، میں نے بتایا۔ اس نے کہا: ایسا کیوں؟ میں نے کہا کہ آپ میری شاگرد نہیں ہیں، مجھ سے بیعت ہیں، جب شاگرد ہو اور درس گاہ میں ہو تو پھر کیوں کیوں کرنا اور جب بیعت ہوں تو پھر کیوں کیوں نہیں کرتے، پھر بات مانتے ہیں۔ درس گاہ کا مزاج قیل و قال والا ہے اور خانقاہ کا مزاج حال والا ہے، شیخ کے سامنے بات نہیں کرتے، بات سمجھ میں نہ آئے تب بھی خاموش ہو جائیں اور درس گاہ میں ہوں اور بات سمجھ میں نہ آئے تو کھل کر دلیل مانگتے ہیں اور دلیل سے بات کرتے ہیں۔

بیویاں بھی اور مریدنیاں بھی!

الحمدللہ میری بیویاں بھی ہیں اور مجھ سے بیعت بھی ہیں، اس لیے ہم کبھی شوہر بن کر بات کرتے ہیں اور کبھی پیر بن کر بات کرتے ہیں، جب شوہر بن کر بات کریں تو ان کو حق ہوتا ہے کہ آگے سے بات کریں۔ بیوی میں دو حیثیتیں ہوتی ہیں ایک محبوب ہوتی ہے اور دوسری محکوم ہوتی ہے، چونکہ محکوم ہے تو اس کا حق ہے کہ بات مانے اور چونکہ محبوب ہے تو اس کا حق ہے کہ کچھ بات منوائے۔ کچھ لوگ محکومیت دیکھتے ہیں تو محبوبیت نہیں دیکھتے اس لیے وہ ہر وقت حاکم بنتے ہیں اور کچھ شانِ محبوبیت دیکھتے ہیں اور شانِ محکومیت نہیں دیکھتے اس لیے وہ ہر بات مانتے ہیں۔ اس لیے ہر بات نہ مانیں کہ وہ آپ کی محکوم بھی ہے اور ہمیشہ ڈانٹ ڈپٹ نہ کریں کہ وہ آپ کی محبوب بھی ہے، یہ دو چیزیں سامنے رکھیں گے تو آپ کے مزاج میں اعتدال آئے گا۔

یہ جو میں آپ سے ہنستے ہنستے باتیں کہتا ہوں یہ زندگی کے اصول ہیں۔ اگر آپ ان کو سمجھ جائیں تو گھروں میں جھگڑے نہیں ہوں گے۔ اس لیے ہمیشہ ذہن میں

دونوں باتیں یاد رکھنا! محکوم بھی اور محبوب بھی تو پھر جھگڑا کبھی نہیں ہو گا۔ تو میں نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہماری چاروں بیویاں بھی ہیں اور مرید بھی ہیں، کبھی شوہر بن جاتے ہیں اور کبھی پیر صاحب بن جاتے ہیں۔

پیغمبر کی بیوی اور عام امتی میں فرق:

قرآن کریم میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾[83]

اے ایمان والو! تم اپنی آواز نبی کی آواز سے اونچی نہ کیا کرو! نبی کے سامنے اونچی آواز سے بولیں تو سارے عمل تباہ اور ایمان ختم ہو جائے گا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اس سے مستثنیٰ ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہن، وہ صرف امتی نہیں ہیں بلکہ پیغمبر کی بیویاں بھی ہیں، ان کو وہ حق حاصل ہے جو کسی اور کو نہیں ہے، امتی نبی سے ناراض ہو تو امتی کا ایمان ختم ہو جاتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم امی عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرماتے ہیں کہ جب تو ناراض ہوتی ہے تو مجھے پتا چل جاتا ہے۔ کب؟ فرمایا کہ جب تو خوش ہو تو کہتی ہے رب محمد کی قسم! اور جب تو کہے کہ رب ابراہیم کی قسم! تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ آج عائشہ مجھ سے خوش نہیں ہے۔[84]

یہ بیوی کی شان ہے۔ یہ ہمیشہ ذہن میں رکھیں گے تو پھر لڑائی جھگڑے اور فسادات ختم ہو جاتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کا سفر مدین:

خیر! موسیٰ علیہ السلام وہاں سے نکلے اور مَدْیَن کی طرف چل پڑے۔ مدین

83۔ الحجرات 2:49

84۔ مسند احمد: ج 17 ص 295 رقم الحدیث 24199

کے قریب تھے کہ ایک کنواں نظر آیا۔ دیکھا کہ لوگ وہاں اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے اور دو نوجوان بچیاں پیچھے ہٹ کر کھڑی ہیں، اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلا سکتیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے پردے کے ساتھ نظریں جھکا کر ان سے پوچھا کہ تمہارا کیا مسئلہ ہے، تم کیوں کھڑی ہو؟ ان عورتوں نے جواب دیا کہ کہ ہم اس وقت تک اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلاتیں جب تک یہ لوگ یہاں سے چلے نہ جائیں! موسیٰ علیہ السلام کو ان عورتوں پر ترس آیا، آپ خود کنویں پر تشریف لے گئے اور کنویں میں سے پانی کھینچا اور ان عورتوں کی بکریوں کو پلا دیا۔ وہ عورتیں وہاں سے چلی گئیں۔ بعض روایات میں ہے کہ لوگ وہاں اپنے جانوروں کو پانی پلاتے اور جب فارغ ہوتے تو کنویں پر ایک بھاری پتھر رکھ کر اس کو بند کر دیتے تاکہ اس میں کوئی گندگی نہ پڑے اور یہ عورتیں چونکہ پتھر ہٹا نہیں سکتی تھیں اس لیے لوگوں کی بکریوں کے بچے ہوئے پانی پر اکتفا کرتیں اور اپنی بکریوں کو پلاتیں۔ اور یہ پتھر ایسا بھاری تھا کہ دس بندے مل کر اس کو اٹھاتے تھے لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اکیلے اس پتھر کو اٹھایا اور کنویں سے پانی نکال کر بکریوں کو پانی پلا دیا۔

حضرت شعیب علیہ السلام سے ملاقات:

حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں سے فارغ ہوئے تو ایک درخت کے سائے کے نیچے بیٹھ گئے اور یہ دعا کی: ﴿رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ ﴿۲۴﴾﴾ اے اللہ! میں محتاج ہوں، مجھے آپ کا فضل و کرم چاہیے۔ ان دونوں لڑکیوں نے جا کر اپنے والد حضرت شعیب علیہ السلام سے سارا واقعہ بیان کیا۔ آپ نے ایک بیٹی کو بھیجا کہ جاؤ ان کو بلا کر لاؤ! وہ بلانے کے لیے آئی تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں آگے چلتا ہوں اور تم میرے پیچھے پیچھے چلو، پیچھے سے مجھے بتانا کہ دائیں جانا ہے یا بائیں جانا ہے۔ جب گھر پہنچ گئے تو موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام کو پورا واقعہ سنایا۔ جب

واقعہ سن لیا تو حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں تسلی دی اور فرمایا: ﴿لَا تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵﴾﴾ کہ یہاں پریشان نہ ہونا! یہ مصر اور فرعون کی شاہی کا علاقہ نہیں ہے نہ ہی اس کی یہاں تک دسترس ہے اور نہ اس کا حکم یہاں تک چلتا ہے، آپ اس حوالے سے مطمئن ہو جائیں!

حضرت شعیب علیہ السلام کی ایک بیٹی نے ان سے کہا کہ ابو جان! آپ ان کو ملازمت پر رکھ لیں اس لیے کہ یہ قوی بھی ہیں اور امین بھی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی سے پوچھا: تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ قوی بھی ہے اور امین بھی ہے؟ اس نے کہا کہ قوت تو ہم نے اس بات سے دیکھی ہے کہ انہوں نے خود پتھر اٹھایا اور ڈول کھینچ کر بکریوں کو پانی پلایا، اور امین کیسے؟ کہا کہ ابا جی! اس نے آنکھ بھر کر ہمیں نہیں دیکھا، اپنی آستین سے چہرہ چھپا کر ہم سے بات کرتے تھے اور ہمیں فرمایا کہ تم پیچھے چلو میں تمہارے آگے چلتا ہوں، اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ یہ امین بھی ہیں۔ چنانچہ شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ ان دو بیٹیوں میں سے ایک کے ساتھ آپ کا نکاح کر دوں لیکن ہماری شرط ہے کہ آٹھ سال آپ بکریاں چرائیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے یہ شرط منظور ہے۔ اس کے بعد شعیب علیہ السلام نے ان کو ملازم رکھا۔

ملازمت اور عہدے کے لیے چار اہم صفات:

دیکھیں! کسی شخص کو آپ نے عہدہ دینا ہو یا ملازمت دینی ہو تو دو چیزیں تو یہ ہیں اور دو ان کے علاوہ ہیں، ان چار کا خیال کرنا چاہیے:

1: وہ قوی و باصلاحیت ہو، آپ کا کام کر سکتا ہو اور قوی سے مراد طاقت ور نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جو کام آپ اس سے لینا چاہتے ہیں اس میں قوی ہو۔

2: امانت دار ہو۔

اس کے علاوہ جو دو چیزیں ہیں ان کا ذکر سورت یوسف میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے شاہِ مصر سے فرمایا تھا: ﴿اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ﴿۵۵﴾﴾[85] کہ آپ مجھے خزانوں کے انتظامات سپرد کر دیں! اس کے لیے آپ نے دو چیزیں بیان فرمائی ہیں: ایک یہ کہ مجھے حفاظت کرنے کا سلیقہ بھی آتا ہے اور دوسرا یہ کہ میرے پاس اس فن کا علم بھی ہے۔ اس لیے قوت اور امانت داری کے علاوہ دو اور چیزیں بھی ہونی چاہییں:

3: حفیظ ہو، نگرانی اس کا مزاج ہو، اشیاء کی حفاظت کرے۔

4: علیم ہو، اس کے پاس اس فن اور معاملہ کا علم بھی ہو۔

یہ چار چیزیں بالکل الگ تھلگ ہیں۔ ایک بندے کے پاس علم ہوتا ہے لیکن کمزور ہے کہ کام نہیں کر سکتا، لکھنا کیسے ہے اس کو پتا ہے لیکن اس کا ہاتھ کام نہیں کرتا یعنی خطاط نہیں ہے، اب یہ علیم تو ہو گا لیکن قوی نہیں ہو گا، اس لیے اس کو لکھنا بھی آتا ہو اور لکھ سکتا بھی ہو۔ تو جو کر سکتا ہو وہ قوی ہے اور جو جانتا ہو وہ علیم ہے۔ پھر یہ حفیظ بھی ہو۔ حفیظ کا معنی کہ ایک بندہ جانتا بھی ہے کام کر بھی سکتا ہے لیکن اپنے کیے ہوئے کام کو سنبھالتا نہیں ہے، حفاظت نہیں کرتا۔ اب اس کو آپ کیا کریں گے؟! تو بندہ قوی بھی ہو، امین بھی ہو، حفیظ بھی ہو اور علیم بھی ہو۔ یہ چار صفتیں ہوں پھر آپ بندہ رکھیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی سے نکاح:

خیر حضرت شعیب علیہ السلام سے معاملہ طے ہو گیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے جو حق مہر رکھا تھا وہ بظاہر مال نہیں تھا بلکہ ان کا کام تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ

85۔ یوسف 55:12

ہمارے اس دور میں ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

تو اس کے لیے پہلی بات تو یہ سمجھیں کہ ہمارے ہاں حق مہر میں مال ہونا شرط ہے، بکریاں چرانا یہ مال نہیں ہے۔ ہاں یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی شریعت کا معاملہ تھا اور ان کی شریعت میں جائز تھا۔ دوسری بات یہ جو حضرت شعیب علیہ السلام نے حق مہر رکھا تھا ہو سکتا ہے کہ وہ حق مہر بھی مال ہو۔ مال اس طرح ہو گا کہ آپ آٹھ سال کام کریں گے اور ہر مہینے آپ کو اتنی تنخواہ ملے گی اور وہ تنخواہ آپ کا حق مہر ہو گا۔ آج بھی اگر کوئی بندہ اپنی بیٹی کسی کو نکاح میں دیتا ہے اور حق مہر کی یہ صورت بنالے کہ آپ ہمارے پاس ایک سال کام کریں گے۔ جو ایک سال کام کریں گے اس کے جتنے پیسے ملیں گے وہ پیسے حق مہر ہوں گے، ہم مہر کے پیسے نہیں لیں گے بلکہ اتنے پیسوں کا کام لیں گے تو یہ کام پیسوں کے بدلے میں ہوا؟ اس لیے یہ مال ہی ہے اور اس کو حق مہر بنانا جائز ہے۔

بکریاں چرانے کو حق مہر بنانا کیسا ہے؟

یہاں ایک سوال یہ ہے کہ نکاح حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی کا ہو رہا ہے اور حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملازم رکھ رہے ہیں اپنا! تو حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی کو حق مہر کیا ملا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ بکریاں حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی کی ہوں اور یہی بکریاں موسیٰ علیہ السلام چراتے ہوں اور حضرت شعیب علیہ السلام نے ملازمت کی محض نسبت اپنی طرف کی ہو۔ تو جب بکریاں بیٹی کی ہیں تو ملازمت بھی انہی کی کر رہے ہیں تو جو مزدوری بیٹی نے دینی تھی اس کے پیسے نہیں دیے بلکہ پیسے کے بدلے میں کام کر لیا۔

آج بھی اگر کوئی شخص نکاح کرے اور حق مہر کے طور پر پیسے نہ رکھے بلکہ حق مہر کے طور پر کوئی کام رکھ لے تو فقہاء کہتے ہیں کہ جائز ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ

وہ کام عورت کی ذات سے تعلق نہ رکھتا ہو، گھر سے باہر تعلق رکھتا ہو کیونکہ شوہر بن کر بیوی کی خدمت کرے تو یہ شوہر کے لیے عیب ہے، اس میں شوہر کی خفت ہے، ایسی چیز حق مہر نہ رکھو مثلاً کوئی کہے کہ ہم بیٹی دیتے ہیں اور حق مہر یہ ہے کہ آپ نے اس کے سر کی مالش کرنی ہے تو یہ حق مہر صحیح نہیں۔ ہاں اگر یہ کہے کہ نکاح کر کے دیتے ہیں اس کا جو بزنس ہے وہ تم سنبھالو گے اور اس پر جو بندہ ہم نے رکھا ہے اس کی بیس ہزار تنخواہ ہے وہ آپ کو نہیں دیں گے بلکہ وہ تمہارا حق مہر ہو گا تو یہ بات ٹھیک ہے، اس کی گنجائش موجود ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کی مصر واپسی اور عطائے نبوت:

خیر! حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں ٹھہرے۔ آٹھ سال کی پیشکش اُن کی طرف سے تھی اور دو سال انہوں نے اپنی طرف سے پورے کیے کیونکہ شعیب علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ آٹھ سال شرط ہے اور دس سال پورے کرو تو تمہاری مرضی ہے۔ تو دس سال پورے کیے۔ نکاح ہوا اور بیوی کو لے کر واپس آ رہے تھے۔ رات سرد اور اندھیری تھی اور موسیٰ علیہ السلام کی بیوی امید سے تھیں۔ ان کو دردِ زہ شروع ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام کے پاس چقماق تھا کہ پتھر کو پتھر پر مارتے تو آگ نکلتی لیکن کوشش کے باوجود اس سے آگ نہ نکلی۔ آپ نے دور سے دیکھا کہ ایک جگہ آگ ہے تو بیوی کو چھوڑ کر آگ لینے کے لیے چلے گئے۔ جب وہاں پہنچے تو وہ آگ نہیں تھی بلکہ وہ تو تجلئِ الٰہی تھی، جس سے درخت چمک رہا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا:

﴿يٰمُوْسٰى ۝١١ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝١٢﴾[86]

86۔ طٰہٰ 12:20

کہ اے موسیٰ! میں تمہارا رب ہوں، آپ اپنے جوتے اتار دیں کیونکہ آپ اس وقت طوی کی مقدس وادی میں ہیں۔

جوتے اتار کر موسیٰ علیہ السلام آئے اور اللہ کا کلام سنا۔ واقعہ تو آپ کے ذہن میں ہے نا! وہاں سے موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا مانگی یا اللہ! آپ نے مجھے نبی بنایا لیکن میری زبان میں لکنت ہے اور مجھ سے ان کا بندہ قتل ہوا ہے، ان کی نظر میں میں ان کا مجرم ہوں تو آپ میرے ساتھ میرے بھائی ہارون کو وحی دے دیں۔ اللہ تعالیٰ نے دعا کو قبول فرمایا۔ حضرت ہارون علیہ السلام کو نبی بنا دیا۔ حضرت ہارون کو حکم دیا کہ موسیٰ علیہ السلام آرہے ہیں، مصر سے باہر نکل کر موسیٰ علیہ السلام کا استقبال کرو۔

مقدس مقامات میں جوتے اتارنا:

یہاں ایک مسئلہ یاد رکھنا! یہ جو موسیٰ علیہ السلام مقدس وادی میں گئے اور اپنے جوتے اتار دیے، یہ اب بھی مسئلہ ہے کہ جب بھی کسی مقدس اور ایسے مقام پر جائیں جس کا آپ کی نظروں میں احترام ہے تو وہاں جوتے اتار دینے چاہییں۔

ایک حدیث پاک میں ہے کہ حضرت بشیر بن خصاصیہ رضی اللہ عنہ کو قبروں کے درمیان جوتا پہن کر چل رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا تو فرمایا:

"اِذَا کُنْتَ فِیْ مِثْلِ ھٰذَا الْمَکَانِ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ." [87]

کہ جب ایسی جگہوں پر ہو تو اپنے جوتے اتار دیا کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اکابرین اور اولیاء اللہ کی قبور کے پاس جو جوتے

87۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ج2ص1994

اتارے جاتے ہیں وہ ناجائز نہیں ہے بلکہ یہ حدیث پاک سے ثابت ہے۔

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی دربارِ فرعون میں آمد:

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام دونوں فرعون کے دربار میں گئے کہ ہمیں اللہ نے حکم دیا ہے کہ تمہیں دعوت دیں، تم کلمہ پڑھو اور شاہی چھوڑو اور خدا کی عبادت کرو اور بنی اسرائیل کو آزاد کرو۔ اس نے کہا کہ کون ہے رب؟ کہا:

﴿رَبُّنَا الَّذِیْۤ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۝۵۰﴾[88]

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب پیدا کیا ہے اور اس کی رہنمائی بھی فرمائی، اس کو راستے بھی دکھائے۔

فرعون کے ساتھ مکالمہ:

یہ بات پیچھے گزر چکی ہے۔ خیر مکالمہ چلتا رہا۔ فرعون نے کہا کہ تمہیں یاد ہے کہ ہم نے تمہاری تربیت کی اور آج ہمیں سناتے ہو؟! موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ جو تم مجھے پالا ہے دودھ پلایا ہے کون سا احسان کیا ہے؟ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا کر رکھا، بچے تم ذبح کرتے تھے، اگر تم یہ کام نہ کرتے تو میں تمہاری تربیت میں کبھی نہ آتا، یہ جو تم نے میری پرورش کی ہے، بچپن میں پالا ہے تو یہ میرے اوپر احسان نہیں کیا۔ فرعون نے پوچھا کہ کوئی دلیل بھی ہے تمہارے پاس تو پیش کرو! موسیٰ علیہ السلام نے عصا پھینکا تو وہ اژدھا بن گیا، فرعون دوڑا اور تخت کے نیچے چھپ گیا اور موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اس سانپ کو سنبھالو! موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ رکھا تو وہ پھر عصا بن گیا۔

یہ عصا استنبول ترکی میں آج بھی موجود ہے اور میں نے خود اپنی آنکھوں

88۔ طٰہٰ 50:20

سے دیکھا ہے، بالکل سادہ سا عصا ہے۔ یوسف علیہ السلام کا عمامہ بھی استنبول میں موجود ہے اور بھی بہت سی نادر چیزیں وہاں پر موجود ہیں۔ چونکہ وہاں خلافت عثمانیہ تھی تو دور دور سے وہاں چیزیں لے کر آئے تھے۔ پانچ سو سال سے ایک سیکنڈ بھی ایسا نہیں گزرا کہ وہاں چوبیس گھنٹے قرآن کریم کی تلاوت نہ ہوتی ہو! وہاں قاری حضرات متعین ہیں اور بہت عجیب منظر ہے، انسان پر بہت عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ پھر دوسرا معجزہ آپ نے ید بیضاء دکھایا۔ فرعون اس سے بہت پریشان ہوا۔

جادوگروں سے مقابلہ:

جب موسیٰ علیہ السلام چلے گئے تو اس نے اپنے درباریوں کو جمع کیا، مشورہ ہوا تو کہا کہ یہ جادو ہے۔ جادوگر بلاؤ۔ اس کے لیے عید کا دن طے ہوا اور یہ عید کا دن دس محرم کا دن تھا اور آج بھی جب آپ سبق پڑھ رہے ہیں تو آج بھی دس محرم ہے، یہ بھی عجیب اتفاق ہے۔ تو ستر ہزار جادوگر آئے۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ پھینکیں گے لاٹھی یا ہم پھینکیں؟ فرمایا: تم پھینکو! انہوں نے لاٹھیاں پھینکیں:

﴿فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿٦٦﴾﴾ [89]

جونہی انہوں نے رسیاں پھینکیں تو ان کے جادو کے اثر سے موسیٰ علیہ السلام کو ایسے محسوس ہونے لگا جیسے سانپ دوڑ رہے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی پھینکی تو اس نے سارے سانپوں کو ہڑپ کر لیا۔ جادوگروں نے اسی وقت کلمہ پڑھا۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ جادو نہیں ہے، یہ معجزہ ہے اور وہ موسیٰ علیہ السلام کے صحابی بن گئے۔ اب حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام ایک طرف ہیں اور فرعون دوسری طرف ہے۔ دعوت چلتی رہی، فرعون نہیں مانتا تھا، عذاب آتا تو کہتا کہ دعا کرو! موسیٰ علیہ

89۔ طٰہٰ 66:20

السلام دعا کرتے اور عذاب ٹل جاتا تو فرعون پھر سرکش ہو جاتا، پھر عذاب آتا، یہ گڑگڑاتا، موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے اور عذاب ٹل جاتا۔ واقعات آپ سارے سن چکے ہیں، کبھی جوئیں، کبھی مینڈک، کبھی خون، کبھی ٹڈی کا عذاب آتا لیکن فرعون ضدی اور سرکش تھا، نہیں مانا۔

بنی اسرائیل کی آزادی:

خیر ایک وقت آیا کہ اللہ پاک نے حکم دیا موسیٰ علیہ السلام کو کہ آپ رات کے وقت نکلیں! دن کے وقت اسرائیلیوں نے فرعونیوں سے کہا کہ بھائی! ہماری اپنی عید ہے، ہم وہ منانے کے لیے مصر سے باہر جارہے ہیں اور چونکہ موقع ہماری خوشی کا ہے اس لیے ہمیں عاریۃً کچھ زیور چاہییں۔ اس بہانے سے انہوں نے کچھ زیورات مانگ لیے۔ رات کے وقت موسیٰ علیہ السلام نے خود کو، اپنے بھائی کو اور اسرائیلوں کو ساتھ لیا اور نکل گئے۔ فرعون کو اطلاع ملی تو فرعون اپنا لشکر لے کر نکلا، سات لاکھ صرف فرعون کے گھوڑ سوار تھے، باقی لشکر اس کے علاوہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام جب دریا پر پہنچے تو منظر یہ تھا کہ آگے دریا ہے اور پیچھے فرعونی۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم جب دریا پر پہنچی تو انہوں نے کہا: ﴿اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿٦١﴾﴾[90] کہ ہم تو مارے گئے، اب ہمارا کیا بنے گا، سامنے دریا ہے اور پیچھے فرعون ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿٦٢﴾﴾ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ اپنا عصا مارو! عصا مارا تو بارہ راستے بن گئے۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ ہر قبیلہ ایک ایک راستے سے گزر گیا۔

یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا۔ "اسرا" کا معنی ہے عبد اور "ئیل" کا

90۔ الشعراء 26:61

معنی ہے اللہ، اسرائیل کا معنی اللہ کا بندہ اور بنی اسرائیل کا معنی ہے اسرائیل کے بیٹے۔ ان کے بارہ بیٹے تھے، سب سے بڑا بیٹا یہودا تھا اور سب سے چھوٹا بنیامین تھا اور بارہ بیٹوں سے آگے بارہ قبیلے چلے ہیں جو "بنی اسرائیل" کہلاتے ہیں اور ان کی آبادی آگے لاکھوں کی تعداد میں تھی۔ شریعت نے آج بھی معاشرت میں قبائل کی حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ تو وہاں بھی ایک راستہ نہیں بنا بلکہ بارہ راستے بنے ہیں، ہر قبیلہ اپنے راستے سے گزرا، جب ان کو وادی تیہ میں پانی کی ضرورت پڑی تھی تو چار کونوں والا پتھر تھا اور ہر کونے سے تین چشمے نکلے یوں بارہ قبیلے اور بارہ چشمے بنے، وہاں بھی قبائل کو تسلیم کیا اور اس کا بڑا خیال رکھا ہے۔

لشکرِ فرعون کی غرقابی:

خیر بنی اسرائیل آگے تھے اور فرعون اور اس کا لشکر پیچھے تھا، موسیٰ علیہ السلام کا آخری بندہ سمندر سے گزر رہا تھا اور فرعون کا آخری بندہ سمندر میں داخل ہو رہا تھا تو حکم ہوا اور پانی آپس میں مل گیا۔ اب فرعونی غرق ہو گئے۔ جب بنی اسرائیلی دریا پار کر گئے تو چونکہ یہ غلامی میں رہے تھے اور غلام کے دل سے اپنے حاکم کا خوف کبھی نہیں جاتا۔ تو انہوں نے کہا کہ فرعون کا کیا بنا؟ فرمایا کہ وہ تباہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ زندہ ہو اور آ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے دریا کو حکم دیا کہ فرعون کو باہر نکال کر پھینک دو۔ دریا نے فرعون کی لاش کو باہر پھینک دیا۔ یہ اس لیے باہر پھینکا تھا تاکہ بنی اسرائیلی اس کو دیکھ لیں، ان کو پھر تسلی ہوئی کہ فرعون مر گیا ہے، ایک تو ان کو تسلی ہو گئی اور دوسرا بعد والوں کے لیے عبرت کا نشان بنا دیا۔ فرعون آج بھی وہاں پڑا ہے اس کو عذاب ہو رہا ہے۔

بنی اسرائیل کی عجیب فرمائش:

بنی اسرائیلی آگے ایک جگہ پر پہنچے تو انہوں نے کچھ بت دیکھے تو موسیٰ علیہ

السلام سے کہا: ﴿يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰـهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ﴾[91] کہ اے موسیٰ! جیسے ان لوگوں کے بت ہیں تو ہمیں بھی ایسے بنا کر دیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تم کیسے عجیب لوگ ہو، جاہلوں والی باتیں کرتے ہو! پھر فرمایا: ابھی تم یہیں ٹھہرو! میں کوہ طور پر جاتا ہوں، اللہ سے دعا کرتا ہوں، کوئی کتاب لاتا ہوں عمل کرنے کے لیے۔ موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر گئے تورات کو لینے کے لیے، آپ نے تیس روزے رکھے۔ تیس روزے رکھنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے مسواک کے ساتھ اچھی طرح اپنا منہ صاف کیا۔ جب کوہ طور پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: موسیٰ! آج تمہارا روزہ نہیں ہے؟ یہ سمجھانے کے لیے کہا۔ جی! روزے تو پورے ہو گئے ہیں۔ کہا کہ تمہارے منہ سے خوشبو کیوں آ رہی ہے، بو ختم ہو گئی؟! کہا: جی وہ تو میں نے مسواک کر لی ہے۔ فرمایا مسواک کیوں کی؟ عرض کیا کہ آپ کے دربار میں آ رہا تھا تو میری خواہش تھی کہ میرے منہ سے خوشبو آئے۔ فرمایا: روزے دار کے منہ کی جو بو ہے وہ مجھے مشک سے زیادہ پسند ہے، جاؤ دس روزے اور رکھو اور روزے والی خوشبو کو باقی رہنے دو۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر دس روزے رکھے۔ اب یہاں آپ کو ہو گئے چالیس دن۔ پیچھے قوم نے کہا کہ ہم سے وعدہ کیا تھا کہ تیس دن بعد آؤں گا اور تیس دن بعد نہیں آئے، کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ سامری نے کہا کہ وہ بھول گیا ہے، وہ خدا کو تلاش کر رہا ہے جبکہ خدا ہمارے پاس ہے۔

بچھڑے کی پوجا کا قصہ:

حضرت ہارون علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ وہ جو تمہارے پاس زیورات اور عاریت کا سامان ہے وہ تمہارا نہیں ہے، یہ تمہارے پاس بطور امانت کے

91۔ الاعراف 138:7

تھا، فرعونی جو اس سامان کے مالک ہیں وہ ہلاک ہو چکے ہیں اس لیے تم اس کو استعمال نہیں کر سکتے، ان کے زیور اپنے پاس رکھنا جائز نہیں ہے۔ آپ علیہ السلام نے وہ سب زیور ایک گڑھے میں پھینکوا کر آگ لگوا دی اور یہ جو سامری تھا آیا، اس کے ہاتھ میں مٹی تھی، حضرت ہارون یہ سمجھے کہ اس کے ہاتھ میں کوئی زیور ہے جو اس نے چھپایا ہوا ہے۔ کہا کہ تم نے کیا چھپایا ہوا ہے؟ تم بھی پھینکو! اس نے کہا کہ میرے پاس زیور نہیں ہیں مٹی ہے، جب حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور ہمارے لشکر کے آگے آگے تھے تو جس گھوڑے پر وہ سوار تھے جہاں ان کا گھوڑا پاؤں رکھتا وہاں سبزہ اگتا تھا تو میں سمجھا کہ اس مٹی میں حیات ہے، میں نے وہ مٹی سنبھال کر رکھی ہے۔ میں اسے ایک شرط پر اس آگ میں پھینکوں گا کہ آپ دعا کریں کہ جو میں چاہتا ہوں اللہ کرے وہ ہو جائے۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ! جو یہ چاہتا ہے وہ ہو جائے۔ سامری نے وہاں مٹی پھینکی اور دعا مانگی کہ میں چاہتا ہوں کہ مٹی پورا بچھڑا بن جائے۔ اب ہارون علیہ السلام اللہ سے دعا مانگ چکے تھے، دعا قبول ہو گئی اور جب مٹی پھینکی تو وہ ساری مٹی اکٹھی ہوئی اور وہ ایک بچھڑا بن گیا اور اس بچھڑے سے آواز نکلنا شروع ہو گئی۔ آواز نکلنے کی وجہ یہ تھی کہ بچھڑا اندر سے خالی تھا، منہ کا بھی سوراخ تھا، پیچھے بھی سوراخ تھا، جب ہوا پیچھے سے ہو کر تیزی سے منہ کے ذریعے گزرتی تو آواز آتی۔ سامری نے کہا کہ خدا تو یہ ہے اور موسیٰ علیہ السلام بھول گئے ہیں، اس لیے اس کی پوجا کرو۔

اب بنی اسرائیل کے تین قسم کے گروہ ہو گئے تھے۔ بعضوں نے پوجنا شروع کر دیا۔ بعضوں نے کہا کہ ہم اس کے قریب بھی نہیں جائیں گے، یہ تو شرک ہے۔ بعضوں نے کہا کہ چلو پوجتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام جب آئیں گے تو اگر کہا کہ چھوڑ دو تو ہم چھوڑ دیں گے۔ یہ متردد لوگ تھے۔

پاس کر یا برداشت کر!

مظفر گڑھ میں میرا ایک جگہ پر بیان تھا تقلید کے عنوان پر تو ایک آدمی نے چٹ لکھ کر دی کہ کوئی آسان سی مثال دے کر تقلید کا مسئہ سمجھا دیں! میں نے کہا: ہمارے ہاں ٹریکٹر ٹرالی چلتی ہے اور اس کے پیچھے لکھا ہوتا ہے:

1: ہارن دو راستہ لو

2: پاس کر یا برداشت کر

3: نہ چھیڑ ملنگاں نوں

پہلی قسم "ہارن دو راستہ لو"... یہ مجتہد ہے، اپنی محنت سے آگے بڑھتا ہے، دوسری قسم "پاس کر یا برداشت کر"... اس میں "پاس کر" یہ مجتہد ہے اور "برداشت کر" یہ مقلد ہے اور جو پاس بھی نہ کر سکے اور برداشت بھی نہ کرے اور اندر ہی اندر سے جلتا رہے یہ ہے غیر مقلد، بس گاڑی دوڑا رہا ہے نہ آگے جا سکتا ہے اور نہ ہی برداشت کر سکتا ہے۔ تیسری قسم "نہ چھیڑ ملنگاں نوں"... انہیں کوئی غرض نہیں دنیا میں کیا ہو رہا ہے! کبھی تیجہ، کبھی ساتواں، کبھی عرس، کبھی برسی بس خوراک پر خوراک ہے، یہ ہیں "نہ چھیڑ ملنگاں نوں"۔

موسیٰ علیہ السلام جب واپس آئے تو دیکھ کر بہت غصے ہوئے۔ آپ نے تورات کی تختیاں ڈالیں اور حضرت ہارون علیہ السلام کو پکڑا سر کے بالوں اور ڈاڑھی سے اور کھینچا کہ یہ تو نے کیا کیا؟ تم نے میرے جانے کے بعد ان کو سنبھالا نہیں ہے؟ حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا کہ جی! میں سمجھتا تھا کہ اگر میں نے ان کو مارا تو یہ دو فرقوں میں تقسیم ہو جائیں گے تو آپ کہیں گے کہ امت کو تقسیم کر دیا ہے، میں تو آپ کی وجہ سے خاموش تھا کہ آپ آئیں اور جو فیصلہ فرمائیں وہ کر لیں گے، موسیٰ علیہ السلام کا غصہ پھر ختم ہو گیا۔ اب ان کا کیا کریں کہ انہوں نے اتنا بڑا جرم کیا ہے؟!

بنی اسرائیل کی توبہ:

موسیٰ علیہ السلام نے کہا اب ہمیں توبہ کرنی چاہیے۔ توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ ان میں سے جو نیک ستر آدمی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے پاس جائیں اور اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کریں۔ ستر آدمیوں کو لے کر آپ دعا کے لیے کوہ طور پر گئے۔ اصل حکم تو یہ تھا کہ وہ لوگ جائیں جو نیک اور ولی ہیں لیکن ان میں بعض وہ لوگ بھی چلے گئے جو متردد ین تھے جنہوں نے کہا تھا کہ بچھڑے کو پوج لیتے ہیں لیکن اگر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ چھوڑ دو تو ہم چھوڑ دیں گے۔ کوہِ طور پر گئے تو ان متردد لوگوں کی وجہ سے زلزلہ آیا اور وہ ستر کے ستر ہلاک ہوگئے۔ موسیٰ علیہ اسلام نے اللہ سے عرض کیا کہ یا اللہ! ان کی حرکتوں کی وجہ سے آپ ہمیں عذاب دیں گے؟ بنی اسرائیل کہیں گے کہ تو نے ہمارے بندے مروا دیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان ستر کو زندگی عطا فرمائی اور موسیٰ علیہ السلام پر وحی آگئی کہ ان کی توبہ یہی ہے کہ ان میں سے جو لوگ اس شرک میں ملوث نہیں ہوئے تھے وہ شرک کرنے والوں کو قتل کریں، جو شخص رشتہ میں جس سے زیادہ قریب ہو وہ اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے یعنی باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو اور بھائی بھائی کو، اب یہ بہت مشکل مرحلہ تھا لیکن انہوں نے اس حکم پر عمل کیا، بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

قومِ جبارین کے خوف سے بنی اسرائیل کا پیچھے ہٹنا:

اب وہاں سے آگے نکلے، حکم تھا کہ آپ ملک شام جائیں! جب ملک شام کے ایک شہر پہنچے جس پر جبارین کا قبضہ تھا، یہ ہیبت ناک قوم تھی، شکل بھی ان کی عجیب وغریب تھی اور قد بھی ان کے لمبے لمبے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام اس شہر میں داخل ہونا چاہتے تھے لیکن قوم نے کہا:

﴿يٰمُوْسٰى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ

فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾[92]

اے موسیٰ! جب تک یہ قوم اس شہر میں موجود ہے ہم اس میں ہر گز داخل نہیں ہوں گے، آپ اور آپ کا رب جا کے لڑو، ہم تو یہیں بیٹھیں گے، ہم نہیں لڑیں گے۔

موسیٰ علیہ السلام ان کے اس رویے سے نہایت غمگین ہوئے اور ان کے لیے بد دعا کی۔ اس بد دعا کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ چالیس سال تک اس وادی تیہ میں رہے۔ صبح سے لے کر شام تک چلتے اور شام کو رک جاتے، جب صبح اٹھتے تو پھر وہی جگہ ہوتی۔ بس اتنا تھا کہ ان کو کپڑے دے دیے گئے جو میلے بھی نہیں ہوتے تھے اور کھانے کے لیے بٹیر اور ترنجبین ملے تو یہ لوگ اس سے بھی تنگ آ ئے۔ تو چالیس سال تک یہ لوگ اسی وادی میں رہے اور موسیٰ علیہ السلام کا انتقال بھی یہیں ہوا۔ اس کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام اور ان کے خلیفہ حضرت یوشع بن نون علیہ السلام شام گئے اور پھر شام کے اس شہر کو فتح کیا۔ تو یہ میں نے پورا واقعہ مختصراً آپ کو سنایا جو مختلف سورتوں میں مختلف مواقع پر تھوڑا تھوڑا بیان کیا گیا ہے۔

اب بعض آیات کے متعلق کچھ باتیں سن لیں:

نبی سے گناہ نہیں ہوتا:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶﴾﴾

اس پر ایک سوال ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کا گناہ نہیں تھا تو موسیٰ علیہ

92۔ المائدۃ 24:5

السلام نے ﴿رَبِّ اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ﴾ کیوں فرمایا؟

اس کا جواب سمجھیں کہ موسیٰ علیہ السلام سے جو قتل ہوا تھا یہ قتل عمد نہیں تھا بلکہ قتل خطا تھا جو گناہ نہیں ہے اور معصیت بھی نہیں ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام چونکہ نبی تھے اور نبی اپنی شان کے مطابق بات کرتا ہے کہ یا اللہ! مجھے خطاءً بھی نہیں مارنا چاہیے تھا، آپ مجھے معاف فرمادیں۔

حضرت ہارون علیہ السلام کی معاونت:

﴿وَ اَخِیۡ هٰرُوۡنُ هُوَ اَفۡصَحُ مِنِّیۡ لِسَانًا فَاَرۡسِلۡهُ مَعِیَ رِدۡاً یُّصَدِّقُنِیۡۤ ۫ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّکَذِّبُوۡنِ ﴿۳۴﴾﴾

موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یا اللہ! میری زبان بھی لکنت والی ہے اور مجھ سے ان کا ایک بندہ بھی قتل ہو گیا ہے تو آپ ہارون علیہ السلام کو میرے ساتھ بھیج دیں، ان کی زبان مجھ سے زیادہ صاف ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ داعی کو اسبابِ ضرور یہ اختیار کرنے چاہییں اور اسباب کا اختیار کرنا توکل کے خلاف نہیں ہوتا۔ کسی بھی علاقے میں آپ کام کرنے کے لیے جائیں تو وہاں کوشش کریں کہ آپ کے ہمنوا ہوں، اس کے لیے اللہ سے دعا بھی کریں اور محنت کے ساتھ افراد بھی پیدا کریں تو یہ دعوت کے خلاف نہیں ہے۔

اعمالِ دنیا کی آخرت میں صورتِ مثالیہ:

﴿وَ جَعَلۡنٰهُمۡ اَئِمَّةً یَّدۡعُوۡنَ اِلَی النَّارِ ۚ وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ لَا یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۱﴾﴾

ہم نے ان کو ایسے مقتدا بنایا تھا جو لوگوں کو آگ کی طرف بلاتے تھے اور جب قیامت کا دن ہو گا تو ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے مقتدا کو ”امام“ کہا ہے۔ فرعون کے درباری یہ اپنی قوم کے امام

اور مقتدا تھے اور یہ ائمہ جہنم تھے، اسی لیے کہا ﴿اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ﴾ کہ یہ لوگ ائمہ ضلالت تھے اور یہ جہنم کی طرف بلاتے ہیں۔ جس طرح ضلالت کے ائمہ ہوتے ہیں اسی طرح ہدایت کے ائمہ بھی ہوتے ہیں، ﴿وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا﴾ [93] ائمہ ہدایت لوگوں کو جنت کی طرف بلاتے ہیں۔

اب دیکھو! بظاہر شبہ ہے کہ ﴿يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ﴾ یہ لوگ آگ کی طرف بلاتے ہیں حالانکہ یہ آگ کی طرف تو نہیں بلاتے تھے، پھر یہ کیوں کہا کہ یہ آگ کی طرف بلاتے ہیں؟

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ ایسے اعمال کی دعوت دیتے تھے جو اعمال جہنم کی طرف پہنچاتے تھے تو گویا یہ جہنم کی طرف بلاتے تھے۔

دوسرا جواب... علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ دنیا میں جتنے اعمال ہیں ان اعمال کی عالَم مثال میں ایک صورت ہوتی ہے، دنیا میں جو گناہ ہے اس کی عالَم مثال میں جو صورت ہے وہ نار ہے، یہ بلاتے تو "گناہ" کی طرف ہیں لیکن اس گناہ کی مثالی صورت "نار" ہے، تو یہاں جو کہا کہ یہ "النَّارِ" کی طرف بلاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عالَم مثال میں اعمالِ سیئہ کی جو صورتِ مثالیہ ہے اس کی طرف بلا رہے ہیں۔ اس لیے اب اس پر کوئی اشکال ہی نہیں ہوتا۔

اس کو سمجھ لیا ہو تو اس کے ذریعے ایک چھوٹا سا اشکال دور کر لیں۔ ہم کہتے ہیں کہ قبر میں ثواب و عذاب جسد اصلی و عنصری کو ہوتا ہے اور مماتی کہتے ہیں کہ قبر میں ثواب و عذاب جسدِ مثالی کو ہوتا ہے اور وہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی "اشرف الجواب" آپ کے سامنے پیش کریں گے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ

93۔ الم السجدۃ 24:32

اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صوفیا کا عقیدہ یہ ہے کہ قبر میں ثواب و عذاب جسد مثالی کو ہوتا ہے، تو مماتی کہتے ہیں کہ اکابر ہمارے ساتھ ہیں، تمہارے ساتھ نہیں ہیں۔ اب یہ ایسا اشکال ہے کہ بسا اوقات اچھا خاصا بندہ اس کا جواب نہیں دے پاتا۔

اب جواب سمجھیں اور یہ جواب ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ﴾[94] کے تحت تفسیر عثمانی میں دیکھنا، علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بدن سے جو روح نکلتی ہے اس روح کی شکل وہی ہوتی ہے جو جسم کی ہوتی ہے تو روح متشکل بشکل الجسد الاصلی ہوتی ہے، یہ جو روح کی شکل جسد اصلی والی ہے تو یہ جسد عنصری کی طرح ہے یا نہیں؟ (ہے۔ سامعین) تو جسد مثالی ہوا۔ تو علامہ کشمیری فرماتے ہیں کہ صوفیاء جسد مثالی اس روح کو کہتے ہیں جو جسد عنصری کی طرح ہوتی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ ثواب و عذاب ہوتا ہے جسد عنصری کو جس کا تعلق روح کے ساتھ ہوتا ہے اور صوفیاء کہتے ہیں کہ ثواب و عذاب ہوتا ہے روح کو جو جسد مثالی ہے تو صوفیاء روح کے ثواب و عذاب کے قائل ہیں اور ہم بھی اصالۃً روح کے ثواب و عذاب کے قائل ہیں، روح کے واسطہ سے جسد کے قائل ہیں تو صوفیاء کی اور ہماری رائے ایک ہے، اسے نزاع لفظی کہتے ہیں۔ جسے ہم روح کہتے ہیں صوفیاء اسے ہی جسدِ مثالی کہتے ہیں اور مماتی کہتے ہیں کہ نہ جسد عنصری کو عذاب ہوتا ہے، نہ روح کو بلکہ ان سے الگ ایک اور جسم ہے اس جسم کی طرح تو وہ جسم مثالی ہے اس کو عذاب ہوتا ہے۔ اب آپ بتائیں! اکابر کا ذوق ہمارا ہے یا ان کا ہے؟ (ہمارا۔ سامعین)

بات اس لیے کہتا ہوں کہ تعبیرات سمجھو، اپنے اکابر کے علوم کو سمجھو گے تو الجھن نہیں ہوگی اور یہ جواب تم نے سن لیا تو کبھی ٹینشن نہیں ہوگی، جب یہ بات ذہن

94۔ الاسراء 85:17

میں نہیں ہو گی تو پھر تم بھی کہو گے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بات تو ان والی کرتے ہیں ہماری تو نہیں کرتے۔

دو مرتبہ اجر کا معنیٰ:

﴿أُولَٰٓئِكَ يُؤۡتَوۡنَ أَجۡرَهُم مَّرَّتَيۡنِ بِمَا صَبَرُواْ وَيَدۡرَءُونَ بِٱلۡحَسَنَةِ ٱلسَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقۡنَٰهُمۡ يُنفِقُونَ ۝٥٤﴾

اہل کتاب میں سے جو یہود ہیں یہ پہلے تورات پر ایمان لائے پھر قرآن کریم پر ایمان لائے، پہلے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، نصاریٰ پہلے پھر انجیل پر ایمان لائے پھر قرآن کریم پر ایمان لائے، پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، قرآن کہتا ہے کہ ان کو دوہرا اجر ملے گا۔ سوال یہ ہے کہ ان کو دوہرا اجر کیوں ملے گا؟

بعض حضرات جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ پہلے تورات پر ایمان لائے، پھر قرآن پر لائے تو دوہرا اجر ملے گا، پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تو دوہرا اجر، پہلے انجیل پر ایمان لائے پھر قرآن پر لائے تو دوہرا اجر، پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تو دوہرا اجر۔ تو دوہرا اجر ملنے کی یہ وجہ ہے۔

اسی طرح ایک حدیث پاک بھی ہے کہ ایک شخص اپنی باندی کی تعلیم و تربیت اچھی کرے اور اس کو آزاد کرنے کے بعد اس سے بھی نکاح کرے تو اللہ اس کو دوہرا اجر دیں گے۔[95] ایک اجر آزاد کرنے کا اور ایک اجر نکاح کرنے کا۔

ایک اور حدیث پاک میں ہے کہ جو غلام اپنے آقا کی خدمت بھی کرے اور

95۔ صحیح البخاری، رقم:97

اللہ کی عبادت بھی کرے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔[96]

اس لیے کہ ایک تو یہ مالک کی بات مانتا ہے اور دوسرا ایک اللہ کی مانتا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ جواب ٹھیک نہیں کہ پہلے ایمان تورات اور انجیل پر تھا اور اب قرآن پر ہے، جب عمل دو ہیں تو اجر بھی دوہرا ہے، کیوں ٹھیک نہیں اس لیے کہ دو عملوں پر دوہرا اجر تو ہر بندے کو ملتا ہے پھر ان اہلِ کتاب کی کیا خصوصیت ہے؟!

اور اس جواب کی تائید قرآن نہیں کرتا کیونکہ قرآن کریم یہ نہیں کہتا "یُؤْتَوْنَ اَجْرَیْنِ" بلکہ کہتا ہے ﴿یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ﴾ دو اجر کا ملنا الگ ہے اور "مرتین" الگ ہے، اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ ان کو دو اجر ملیں گے بلکہ فرمایا کہ ان کو دو مرتبہ اجر ملے گا، دو مرتبہ اجر اور ہوتا ہے اور دوہرا اجر اور ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی نے روزہ بھی رکھا اور نفلی نماز بھی پڑھی تو اس کو دو اجر ملیں گے، ایک آدمی نے روزہ بھی رکھا اور گرمی میں رکھا ہے اس کو دو اجر نہیں بلکہ دوہرا اجر ملے گا۔ تو دوہرا اور ہوتا ہے اور دو اور ہوتے ہیں، دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

تو اس سوال کا اصل جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی عطا ہے کہ اللہ کس عمل پر کتنا ثواب دیتے ہیں، بعض اعمال قرآن کریم اور احادیث میں ایسے آئے ہیں کہ جس میں ایک عمل پر خدا نے دوہرے اجر کا وعدہ کیا ہے، وہ اللہ کی مرضی کہ اللہ کیوں کرتے ہیں اس پر بندہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَیْنِ﴾[97] ازواج مطہرات کو ہر عمل پر دوہرا اجر ملتا ہے۔ اہلِ کتاب جو پہلے اپنے نبی پر ایمان لائے اور پھر حضور صلی اللہ علیہ

96۔ صحیح البخاری، رقم: 2546

97۔ الاحزاب 31:33

وسلم پر ایمان لائے ان کو بھی دوہرا اجر ملتا ہے یہ ان کی خصوصیت ہے۔

ہدایت دینا اللہ کے اختیار میں ہے:

﴿اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ‌ ۚ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴿۵۶﴾﴾

آپ جس کو ہدایت دینا چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے اسے ہدایت عطا فرماتا ہے اور اللہ ہدایت قبول کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔

میں اس کو بطور دلیل کے پہلے پیش کر چکا ہوں کہ بعض لوگ کہتے ہیں: ﴿اِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰى﴾ کا مطلب ہے آپ مردوں کو سنا نہیں سکتے لہذا مردے سنتے بھی نہیں ہیں۔ تو میں نے کہا کہ کوئی بندہ یہ کہہ دے کہ ﴿اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ﴾ کا مطلب ہے کہ جس کو آپ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے تو اس کا معنی یہ ہے کہ ہدایت ملتی بھی نہیں ہے، تو کیا یہ معنی درست ہو گا؟!

صحیح مطلب یہ ہے کہ ہدایت دینا آپ کے اختیار میں نہیں ہے اسی طرح مردوں کو سنانا بھی آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔

قارون کا تذکرہ:

﴿اِنَّ قَارُوۡنَ كَانَ مِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰى فَبَغٰى عَلَيۡهِمۡ‌ ۖ وَاٰتَيۡنٰهُ مِنَ الۡكُنُوۡزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوۡٓاُ بِالۡعُصۡبَةِ اُولِى الۡقُوَّةِ ۚ اِذۡ قَالَ لَهٗ قَوۡمُهٗ لَا تَفۡرَحۡ‌ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡفَرِحِيۡنَ ﴿۷۶﴾﴾

قارون بنی اسرائیل کا ایک شخص تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کے چچا کا بیٹا تھا۔ اس کے پاس مال اتنا زیادہ تھا کہ اس کے خزانے کی چابیاں اونٹ اٹھاتے تھے، یہ فرعون کا خاص آدمی تھا اور بنی اسرائیل پر فرعون کی طرف سے نگران

مقرر تھا۔ جب بنی اسرائیل فرعون کے تسلط سے نکل آئے تھے تو یہ بھی بنی اسرائیل کے ساتھ آیا تھا۔ اسے اپنے سامان اور مال و جائیداد پر بہت ناز تھا۔ یہ اونٹوں پر مال لاد کر نکلتا اور فخر و تکبر کرتا تھا۔ اس وقت جو نیک لوگ تھے وہ اس کو سمجھاتے تھے کہ ایسا کام نہ کر! یہ کہتا کہ یہ مال اللہ نے مجھے نہیں دیا بلکہ میں نے اپنے فن سے کمایا ہے، جو لوگ دنیا کے طالب تھے وہ تمنا کرتے کہ کاش ہمیں بھی ایسا مال مل جاتا۔ ایک وقت آیا کہ اللہ نے زمین میں اس کو مال کے ساتھ دھنسا دیا۔ جب یہ زمین میں دھنسایا گیا تو جن لوگوں نے قارون کے مال کی خواہش کی تھی وہ کہنے لگے کہ اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے ہمیں اِن نیک لوگوں کے ساتھ ہی رکھا، اگر ہم اِس کے ساتھ ہوتے تو ہم بھی تباہ و برباد ہو جاتے۔ قارون اپنے مال پر اتراتا تھا تو خدا نے مال سمیت اس کو دفن کر دیا۔

گناہ کا پختہ ارادہ بھی باعث پکڑ ہے:

﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٨٣﴾﴾

آخرت والا گھر تو ہم نے ان لوگوں کے لیے بنایا ہے جو زمین میں بڑائی کا ارادہ بھی نہیں کرتے اور فساد مچانے کا ارادہ بھی نہیں کرتے اور اچھا انجام تو متقین کے لیے ہے۔

یہاں یہ بات سمجھیں کہ یہاں یہ نہیں فرمایا: "نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ" کہ وہ لوگ فساد نہیں مچاتے بلکہ فرمایا: ﴿نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا﴾ کہ فساد مچانے کا ارادہ نہیں کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سرکشی اور فساد جس طرح جرم ہے اسی طرح سرکشی اور فساد کا پختہ ارادہ کرنا بھی جرم ہے۔ گناہ کا مصمم ارادہ کرنا بھی گناہ ہوتا ہے۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ارادہ گناہ؛ گناہ نہیں

ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ دل میں گناہ کا خیال آجائے اور آدمی گناہ نہ کرے تو یہ گناہ نہیں ہے اور اگر بندہ یہ ارادہ کرلے کہ میں نے یہ گناہ کرنا ہے، اس کے پورے اسباب بھی جمع کرلے لیکن پھر گناہ نہ کرسکے تو جو گناہ کرنا تھا اور نہ کرسکا اس کی تو سزا نہیں ملے گی لیکن اس نے جو پختہ ارادہ کیا ہے اس پر اس کو سزا ضرور ملے گی۔

نیکی اور برائی کا بدلہ:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾﴾

جو شخص نیک عمل کرے گا تو اللہ اس شخص کو اس نیک عمل سے بڑھ کر بہتر بدلہ عطا فرمائیں گے۔ "خیر" کا لفظ فرمایا، "خیر" اسم تفضیل کا صیغہ ہے لیکن یہاں یہ متعین نہیں ہے کہ کتنا دیں گے۔ اس کا ادنی درجہ ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ ہے کہ نیکی کا بدلہ کم از کم دس گنا ہو گا اور زیادہ کتنا ہو گا یہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔

اور جو گناہ کرے گا تو گناہ کے بدلے میں اللہ صرف ایک ہی گناہ دیں گے۔ اس میں یہ نہیں ہو گا کہ گناہ ایک کرے تو بدلے میں اللہ دس گنا عذاب دے بلکہ ایک گناہ کا بدلہ صرف ایک ہو گا۔

آپ علیہ السلام کے ساتھ مکہ واپسی کا وعدہ:

﴿اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى وَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۸۵﴾﴾

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے مدینہ ہجرت فرما کر چلے۔ جب مقام جحفہ پر پہنچے جو مدینہ کے راستے کی مشہور منزل رابغ کے قریب ہے تو اس وقت

مکہ مکرمہ کے راستہ پر نظر پڑی تو بیت اللہ اور وطن یاد آیا، اسی وقت جبرائیل امین یہ آیت لے کر نازل ہوئے ﴿إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ﴾ اللہ کے نبی! جس اللہ نے آپ پر قرآن نازل کیا ہے وہ اللہ آپ کو مکہ دوبارہ لائے گا۔

اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے اور ایک وقت آیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پھر دوبارہ مکہ مکرمہ تشریف لائے۔

مصیبت آئے تو مسئلہ نہ بدلیں:

میں اس لیے یہ بات سمجھتا ہوں کہ یہ طے شدہ ہے کہ اہلِ حق کے ساتھ اللہ تعالی کی مدد ہے، درمیان میں ابتلاء، امتحان اور کچھ آزمائشیں آتی ہیں، اس وقت دنیا میں پوری امت کا ذہن بن گیا ہے کہ مسئلہ بدل دو، مسئلہ چھوڑ دو تاکہ مشقت نہ آئے۔ کیس، پرچہ، جیل نہیں ہونی چاہیے ایسی پالیسیاں اختیار کرو!

لیکن ہمارا مؤقف یہ ہے کہ دین کا مسئلہ ٹھیک بیان کرو، حق کو صحیح بیان کرو اور پوری پالیسی ایسی رکھو کہ جیل اور یہ تکلیفیں نہ آئیں لیکن اس کے باوجود بھی اگر جیل اور تکلیف آجائے تو پھر مسائل نہ بدلنا، پھر حق کو نہ چھوڑنا، پھر بھی آتی ہیں تو آنے دو، پھر اللہ کے لیے برداشت کرو، ہمیشہ کے لیے دنیا میں نہیں رہنا، دکھ اور سکھ دنیا کا حصہ ہیں، موت کے بعد کے معاملات اصل ہوتے ہیں۔ ہمیشہ یہ فکر کرنا کہ کبھی تکلیف نہ ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ﴾ [98]

بندہ ایمان والا ہو اور اس پر آزمائش نہ آئے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟! اگر کوئی

98۔ العنکبوت 2:29

شخص ایمان والا ہو اور زندگی بھر کوئی آزمائش نہیں آئی تو اس کو اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے کہ میں کیسا مؤمن ہوں؟ اس لیے میں بسا اوقات علماء سے عرض کرتا ہوں کہ جب ہم تذکرہ کرتے ہیں کہ ہمارے اکابر وہ تھے جنہوں نے جیل کاٹی... ہمارے اکابر وہ تھے جنہوں نے مار کھائی... ہمارے اکابر وہ تھے جنہوں نے ظلم سہے لیکن دین کا ساتھ نہیں چھوڑا، تو تقریریں یوں کریں گے اور جب ماننے کی باری آئے گی تو مانیں گے ان کو جن کے پاس صرف ریل ہے، جن کے ہاں جیل کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔ بھائی! جب ان اکابر کا تذکرہ کرتے ہو کہ جن کے پاس ریل اور جیل دونوں تھے تو پھر چلو بھی ان کے ساتھ جن کے پاس ریل اور جیل دونوں ہیں، تذکرہ ان کا جن کے پاس جیل ہے اور ماننا ان کو جو جیل کا نام سن کر حق کو بدل دیں۔ یاللعجب! اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔ (آمین)

میں کہتا ہوں کہ شریعت کا خیال کریں، قانون کے دائرے میں رہ کر کام کریں، قانون کو مت توڑیں لیکن اگر کبھی ایسا مسئلہ پیش آجائے کہ دین کو چھوڑنے میں راحت ملتی ہو اور دین کو لینے میں تکلیف آتی ہو تو پھر تکلیف کو راحت پر ترجیح دیں، ایک وقت آئے گا کہ اللہ تکلیف ختم فرما کر راحت عطا فرمائیں گے۔ (آمین)

پیغمبر پاک کو نصیحت:

﴿وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٦﴾﴾

کبھی آپ نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ پر وحی آئے گی لیکن یہ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر رحمت ہے، آپ پہلے بھی کفار کے معاون نہیں تھے آپ آئندہ بھی نہ ہونا۔

بڑا سمجھائے تو فوراً صفائی پیش نہ کریں!

اس سے یہ بات سمجھ آئی کہ جب استاد شاگرد کو، شیخ اپنے مرید کو اور بڑا اپنے چھوٹے کو سمجھائے کہ بیٹا! گھر جاؤ تو نمازوں کا خیال کرنا! آگے سے یہ نہ کہیں کہ جی! میں تو خیال کرتا ہوں بلکہ خاموشی سے سنو اور کہو کہ ان شاء اللہ، استاد جی ایسا ہو گا۔

میرے پیغمبر! آپ کافروں کے معاون پہلے بھی نہیں تھے لیکن آئندہ بھی نہ ہونا! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تھوڑا کہا تھا کہ یا اللہ! میں پہلے بھی نہیں تھا تو اب کیسے ہوں گا!

اور یہ نصیحت یاد رکھ لیں کہ جب کوئی بڑا کسی چھوٹے کو نصیحت کرے تو اس وقت چھوٹا اپنی صفائی نہ دے، وہ صفائی دے گا تو بڑے کے دل میں ایسا تکدر آئے گا کہ آئندہ وہ نصیحت کرنے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔

اگر کسی بڑے کو چھوٹے کے بارے میں غلط اطلاع ہو اور اس پر وہ بڑا اس چھوٹے کو ڈانٹ لے تو اس وقت چھوٹا سنتا رہے، اس وقت صفائی نہ دے بلکہ کسی مناسب موقع کا انتظار کرے کہ میں نے ایک بات کرنی ہے، یا لکھ کر دے دے کہ آپ کو جو میرے متعلق فلاں نے اطلاع دی ہے وہ غلط دی ہے، ایسی کوئی بات نہیں ہے، اصل معاملہ اور تھا لیکن آپ کو غلط بتایا گیا تھا، اس سے اس کو زیادہ خوشی ہوتی ہے اور موقع پر بولنا یہ تکلیف کا باعث ہوتا ہے، اس وقت خاموش رہنا چاہیے، بڑے نے تھوڑا سا ڈانٹ لیا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی ہے؟!

حق پر عمل پیرا رہیں اور اسی کی دعوت دیتے رہیں!

﴿وَ لَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَ ادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۸۷﴾﴾

دیکھو! کیسے خطاب ہو رہا ہے! فرمایا: جب آپ پر اللہ کی آیات نازل ہو جائیں تو یہ لوگ آپ کو ان پر عمل کرنے سے روک نہ سکیں، آپ کو چاہیے کہ آپ اپنے رب کی طرف بلاتے رہیں اور آپ نے خود مشرکین میں سے نہیں ہونا!

﴿وَ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۟ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۸﴾﴾

اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو مت پکارو! اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ہر چیز تباہ ہو جائے گی لیکن اللہ کی ذات باقی رہ جائے گی۔ حکومت تو اللہ ہی کی ہے اور تمہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں اس آیت کے تحت لکھا ہے: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اس لیے کہ سوائے ذاتِ خداوندی کے ہر چیز اپنی ذات سے فانی اور معدوم ہے۔

حضرت نے یہاں لکھا ہے کہ "کسی شئے کا وجود ذاتی اور خود بخود نہیں، خدا کو خدا اس لیے کہتے ہیں کہ وہ خود بخود ہے اور اس کا وجود ذاتی ہے، اس کے سوا جو چیز بھی موجود کہلاتی ہے تو اس کا وجود خدائے واجب الوجود کے سہارے سے ہے۔"[99]

اللہ ہم سب کو قرآن کریم سمجھنے اور سمجھانے کی اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

99۔ معارف القرآن: ج6 ص81

سورۃ العنکبوت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿الٓـمّٓ ۚ﴿۱﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ﴿۲﴾﴾

اہلِ ایمان کے لیے آزمائش لازمی ہے:

﴿الٓـمّٓ﴾ پر کئی بار بات ہو چکی ہے کہ اس کا معنیٰ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔

﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ﴿۲﴾﴾ کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ انہیں صرف یہ کہنے پر چھوڑ دیا جائے گا کہ "ہم ایمان لائے" اور انہیں آزمایا نہ جائے!

جو شخص دین کا کام کرے اور اس پر مشقت اور مشکل پیش آئے یہ بالکل برحق ہے اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن آدمی دین کا کام کرے اور اس پر مشکل نہ آئے تو اس پر تعجب کرنا چاہیے۔ اللہ فرماتے ہیں: ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ ؕ﴿۴﴾﴾[100] کہ ہم نے بندے کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ اگر کوئی بندہ آپ سے کہے

100۔ البلد 4:90

کہ اللہ کا شکر ہے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے تو اس پر تعجب کرنا چاہیے کہ تکلیف کیوں نہیں ہے اور اگر کوئی بندہ کہے کہ مجھے تکلیف ہے تو یہ تعجب کی بات نہیں۔ حدیث پاک میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً : اَلْأَنْبِيَاءُ، ثُمَّ الصَّالِحُوْنَ، ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ.

101

دنیا میں سب سے زیادہ سختی اور آزمائش انبیاء پر آتی ہے، پھر نیک صالح لوگوں پر، پھر جو ان کے زیادہ قریب ہو اس پر آتی ہے۔

مصیبت آئے تو حق کا ساتھ نہ چھوڑیں!

ہمارے ہاں اس وقت جو سب سے بڑا مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اس کو بہت بڑی سمجھداری سمجھتے ہیں کہ دین کا کام کیا ہے اور کوئی مشکل نہیں آئی۔ اس کے لیے عقائد تبدیل کر کے بتاتے ہیں، مسائل غلط بتاتے ہیں، غلط مسائل کی تائید کرتے ہیں تاکہ جیل سے بچ جائیں، مصیبت سے بچ جائیں لیکن یہ یاد رکھیں کہ تھوڑے دنوں کے لیے تو بچ جائیں گے لیکن موت کے بعد پھر جیل ہے، کچھ دنوں کے لیے تو بچ جائیں گے لیکن موت کے بعد پھر عذاب ہے، جان تو چھوٹ نہیں سکتی، تو بجائے اس کے کہ آدمی قیامت کا بڑا عذاب لے یہ بہتر ہے کہ دنیا کی تھوڑی سی مشقت لے اور آخرت کے عذاب سے بچ جائیں۔

ہمارے ہاں جو بندہ کام کرے اور اس قسم کے مراحل سے گزرے تو لوگ اس کو چھوڑ دیتے ہیں اور اس قسم کے مراحل میں مشکلات نہ آئیں تو لوگ اس کے ساتھ چلتے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ جس امام کے ہم مقلد ہیں امام اعظم ابو حنیفہ

101۔ المعجم الکبیر للطبرانی: ج10 ص280 رقم الحدیث 20096

نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ؛ حضرت امام صاحب نے زندگی کے آخری چار سال جیل میں گزارے ہیں، ایک دو دن نہیں زندگی کے آخری چار سال! جب امام صاحب نے کام شروع کیا تھا تو اس وقت جیل میں جاتے تو بندہ کہہ سکتا تھا کہ سفارش کوئی نہیں تھی، پیسہ کوئی نہیں تھا، چھڑانے والا کوئی نہیں تھا، تعلقات نہیں تھے لیکن حضرت امام صاحب کی زندگی کے آخری چار سال جیل میں ہیں، کتنا بڑا شخص ہے! کتنے بڑے تعلقات ہیں! اللہ نے وسائل کتنے دیے تھے! لیکن پھر بھی قید میں رہے۔

اموی خاندان کے آخری خلیفہ نے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو یہ بات کی کہ آپ قاضی القضاۃ؛ چیف جسٹس بنیں، امام صاحب نے انکار فرمایا۔ انکار کی دلیل جو بھی دی لیکن انکار کی بنیاد یہ تھی کہ میں ان کی غلط باتوں کی تائید نہیں کروں گا۔ اگر تائید نہیں کروں گا تو پھر جھگڑا ہو گا اور اگر تائید کروں گا تو نتیجہ جہنم ہو گا اور یہ جہنم میں نہیں لے سکتا۔ حضرت امام صاحب نے انکار کر دیا۔ اس وقت کوفہ کا گورنر تھا یزید بن ہبیرہ اس کے ذریعے امام صاحب کو روزانہ دس کوڑے لگوائے جاتے، ایک سو بیس کوڑے امام صاحب کو لگے ہیں۔

اموی خاندان کے بعد خلیفہ ابو جعفر منصور نے بھی پیش کش کی تو امام صاحب نے قبول نہیں فرمائی۔ پھر اس نے بھی تیس کوڑے لگوائے تو حضرت امام صاحب نے ایک سو پچاس کوڑے کھائے ہیں۔ اب چونکہ امام صاحب کو جیل تو پہلے آچکی تھی، اب اگر آپ کو جیل سے رہا کرتے تو امام صاحب کے کئی متوسلین تھے، شاگرد تھے، دنیا میں ایک حلقہ تھا، اگر امام صاحب کوئی جملہ فرمادیں تو حکومت کے لیے مسئلہ نہ پیدا ہو تو خلیفہ نے یہی مناسب سمجھا کہ امام صاحب زندہ جیل سے باہر نہ نکلیں، جنازہ جیل سے نکلے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو بالآخر زہر دینے کا فیصلہ ہوا۔

جیل کا ایک ملازم جو چھوٹے درجے کا تھا اس نے امام صاحب سے عرض کیا

کہ میں چھوٹا آدمی ہوں، میں کچھ کر نہیں سکتا لیکن آپ کو اطلاع دے رہا ہوں کہ آپ کو زہر پلا دیا جائے گا، آپ جو کر سکتے ہیں کر لیں۔ امام صاحب کے پاس جیل والے دودھ کا پیالہ لائے اور پیش کیا۔ امام صاحب نے پینے سے انکار کیا، فرمایا "إِنِّیْ لَأَعْلَمُ مَا فِيْهِ" میں جانتا ہوں اس میں کیا ہے؟ بتا دیا تھا کہ زہر ہے تو نہیں پیا۔ امام صاحب نے کہا کہ میں اس کو پیوں گا تو خودکشی ہوگی اور خودکشی کرنا جائز نہیں، اپنی مرضی سے میں نہیں پی سکتا۔ پھر امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو زمین پر لٹایا گیا اور ان کے منہ میں پیالہ انڈیلا گیا، کچھ منہ میں چلا گیا اور کچھ ڈاڑھی پر لگ گیا۔

امام صاحب اٹھے اور دو رکعات نماز کی نیت باندھ لی۔ جب سجدے میں گئے تو روح پرواز کر گئی، لیکن امام صاحب نے غلط مسئلہ بیان نہیں کیا۔ میں اس لیے گزارش کرتا ہوں اور میں بار بار عرض کرتا ہوں کہ غلط مسئلہ کبھی نہ بتانا، آپ جیل یا مشقت کے ڈر سے صحیح مسئلہ نہیں بتا سکتے تو خاموش ہو جائیں لیکن غلط مسئلہ کبھی نہیں بتانا۔ اصل تو آدمی کے لیے عزیمت ہے کہ مسئلہ بیان کرنا چاہیے، زندگی میں کچھ احوال آتے ہیں تو انہیں برداشت کرنا چاہیے۔

مشقت آنا قابلِ تعجب نہیں:

﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝۲﴾

لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان بھی لائیں، جنت بھی ملے اور پھر امتحان بھی نہ ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ امتحانات تو زندگی کا حصہ ہیں۔ اس سے بندے کو متاثر نہیں ہونا چاہیے اور بندے کو بزدلی کا شکار بھی نہیں ہونا چاہیے بلکہ تسلسل سے اپنے کام میں لگے رہنا چاہیے۔ میں اکثر یہ بات آپ کی خدمت میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ہمارا ہر اٹھنے والا قدم قبر کی طرف جا رہا ہے، ہر قدم موت کی طرف ہے، آج مر جائیں کل مر جائیں جانا تو ہے ہی، مشقت میں ہوں یا راحت میں ہوں دنیا تو چھوڑ کر جانی ہے، اس لیے

مسائل میں کبھی انسان غلطی نہ کرے۔

خیر میں یہ بات سمجھا رہا تھا کہ دین کے کام پر مشقت آنا یہ تعجب کی بات نہیں ہے اور مشقت نہ آنا یہ تعجب کی بات ہے! ہمارے ہاں بگاڑ کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کچھ بھی ہو جائے جیل نہیں جانا، اس کے لیے خود کو بدلنا پڑے، نظریات بدلنے پڑیں، پالیسیاں بدلنی پڑیں، کچھ بھی ہو جائے بس جیل نہیں جانا! یہ جو خوف ہے اس کو اتارنا بہت ضروری ہے! بھائی جیل چلے بھی گئے تو کیا ہو گا؟ جیل بھری پڑی ہے ڈاکوؤں، چوروں، زانیوں اور شرابیوں سے، اگر دو اہل علم چلے جائیں گے تو کون سی قیامت آن پڑے گی؟ اس سے کیا ہوتا ہے! کچھ بھی نہیں ہوتا!

اور میں پرسوں یہاں اساتذہ سے کہہ رہا تھا کہ ہمیں ایجنسی والے اٹھائیں اور سڑک پر لٹائیں تو کہتے ہیں کہ ہماری تذلیل ہو گئی، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو لٹا کر زہر کا پیالہ دیا جا رہا ہے لیکن انہوں نے تو نہیں کہا کہ میری تذلیل ہو گئی، وہ تو اس کو اپنی عزت سمجھتے تھے، اس لیے دین کے معاملے میں کوئی مشقت آ جائے تو اللہ کے لیے برداشت کریں اور ڈریں اور دوڑیں مت!

"اللہ جاننا چاہتے ہیں" پر شبہ کا جواب:

﴿وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝۳﴾

اللہ رب العزت نے تسلی دی ہے کہ یہ معاملہ صرف تمہارے ساتھ نہیں بلکہ تم سے پہلے لوگوں کے ساتھ بھی تھا، ہم نے ہر کسی کا امتحان لیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ سچے کون ہیں اور کاذب کون ہیں۔ بظاہر شبہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت امتحان لیتے ہیں تو بندے کا پتا چلتا ہے اور نہیں لیتے تو پتا نہیں چلتا، ﴿فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ

صَدَقُوْا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ﴾ اللہ جاننا چاہتا ہے کہ سچا کون ہے اور اللہ جاننا چاہتا ہے کہ جھوٹا کون ہے۔ حالانکہ اللہ کو تو پہلے سے پتا ہے، پھر اللہ امتحان کے ذریعے کیوں معلوم کر رہے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کے علم میں سب چیزیں ہیں لیکن لوگوں کو نہیں پتا کہ ان میں صادق کون ہیں اور کاذب کون ہیں؟ تو اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ ہم ایسا امتحان لیتے ہیں کہ جس سے سب کو پتا چل جائے کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون ہے؟ یعنی ہم ظاہری طور پر سچے اور جھوٹے کو الگ الگ کرتے ہیں تاکہ تمہارے علم کے اندر بھی یہ بات آجائے۔ اس لیے تفسیر جلالین والے ایسے موقع پر ایسے لفظ کہہ دیتے ہیں "فَلَيَعْلَمَنَّ أَيْ عِلْمَ ظُهُوْرٍ" یعنی ایسی بات کہ جو سب کے سامنے آجائے۔

اصطلاحاتِ شرع میں تبدیلی نہ کرو!

﴿وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ؕ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾

ہم نے انسان کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے، اگر والدین تمہیں اس بات پر مجبور کریں کہ میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ جس کے متعلق تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو اس معاملے میں والدین کی بات مت مانو!

مزاجِ انسانی:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَ لَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ﴾

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب ان کو

اللہ کے راستے میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو لوگوں کی طرف سے ملنے والی تکلیف کو ایسے سمجھنے لگتے ہیں جیسے ان پر اللہ کا عذاب آچکا ہو! اور اگر ان مسلمانوں کو اللہ کی طرف سے کوئی مدد ملے تو یہ منافق قسم کے لوگ کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔

اللہ رب العزت بعض منافق مزاج کے لوگوں کی عادت کو بیان فرمارہے ہیں کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ زبان سے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، ہم مومن ہیں لیکن جب ان پر کوئی تکلیف آئے تو یوں چِلاتے ہیں جیسے ان پر خدا کا عذاب آگیا ہو اور جب اہل ایمان کو راحت ملے تو پھر کہتے ہیں ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ منافقین کا کام ہے کہ راحت میں ساتھ دینا اور مشکل میں دوڑ جانا، اس کو اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں کئی ایک مقامات پر سمجھایا ہے۔

ایک مقام پر ہے: ﴿يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ﴾[102] کہ منافق لوگ جب مومنین کو راحت میں دیکھیں گے تو پکاریں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟! لہذا اپنی کامیابی اور راحت میں ہمیں بھی شریک کرلو اور اپنے نور سے ہمیں بھی مستفید ہونے دو!

قرآن کریم میں ہے: ﴿قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا تَّبَعْنٰكُمْ﴾[103]

منافقین نے کہا کہ اگر ہم غزوہ احد کو جہاد سمجھتے تو ہم آپ کا ساتھ ضرور دیتے، یہ کون سا جہاد ہے؟ یہ تو خودکشی ہے! اور کبھی کہتے: ﴿لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا﴾ کہ یہ صحابہ اگر ہماری بات مان لیتے تو جہاد میں شہید نہ ہوتے بلکہ بچ جاتے۔

102۔ الحدید 14:27

103۔ آل عمران 167:3

اللہ فرماتے ہیں: ﴿فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾[104] کہ اے پیغمبر آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم سچے ہو تو تم اپنی ذات سے موت ہٹا کر دکھاؤ! موت سے کوئی بندہ بچ نہیں سکتا تو پھر یہ تاویلیں کرنے کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔

گناہ کا بوجھ کون اٹھائے گا؟(ایک تعارض کا حل)

﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَ لْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۲﴾﴾

جب پیغمبر علیہ السلام دعوت دیتے اور لوگ ان کی دعوت کو قبول کرتے تو کفار ان کو نبی کی دعوت سے روکتے تھے۔ لوگ کہتے کہ اگر ہم پیغمبر کی دعوت قبول نہیں کریں گے تو نبی تو فرما رہے ہیں کہ عذاب ہو گا، جہنم میں جائیں گے تو ہمارا کیا بنے گا؟ کفار کہتے کہ تم فکر نہ کرو! تمہارے بوجھ ہم اٹھائیں گے، جہنم کا عذاب ہمارے ذمہ ہے، بس تم انکار کرو۔

یہاں دو آیتوں میں بظاہر تعارض اور ٹکراؤ ہے۔ اس طرح کہ یہاں آیت سے جو بات سمجھ میں آ رہی ہے وہ یہ ہے ﴿وَ مَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ کہ کافر لوگ مومنین کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائیں گے لیکن اگلی آیت میں ہے: ﴿وَ لَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ﴾ کہ یہ لوگ اپنے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے گناہوں کے بوجھ کے ساتھ اور لوگوں کے گناہوں کے بوجھ کو بھی اٹھائیں گے۔ تو بظاہر ان دو آیتوں میں تعارض ہے، لیکن حقیقت میں تعارض نہیں ہے اس لیے کہ پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ کافر لوگ مومنین سے کہتے

104۔ آل عمران 168:3

تھے کہ تم ہماری بات مانو اور ہم تمہارا بوجھ اس طرح اٹھائیں گے کہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی، سب مشقت ہمارے ذمے ہے اور دوسری آیت کا معنی یہ ہے کہ جو آدمی گناہ کرتا ہے اپنے گناہ کو وہ بھی اٹھائے گا اور جس کی وجہ سے وہ گناہ کرتا ہے وہ شخص بھی اس کے گناہ کا بوجھ اٹھائے گا۔ اب دونوں میں تعارض ختم ہو گیا۔

حدیث پاک میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کوئی نیک کام ایسا شروع کرتا ہے کہ جس پر لوگ عمل کرتے ہیں تو اس نیک عمل کا اجر بھی اس کو ملے گا اور جو لوگ نیک عمل کریں گے ان سب کا اجر بھی اس کو ملے گا اور اگر کوئی شخص گناہ کا ایسا کام کرتا ہے کہ جس کی وجہ سے لوگ گناہ کرتے ہیں تو ان کے گناہوں کا وبال قیامت کے دن اس کو بھی ہو گا۔ [105]

حقوق العباد کی پامالی سے بچیں!

میں طلبہ سے اکثر یہ بات عرض کرتا ہوں کہ گناہ سے تو ہمیشہ بچنا چاہیے لیکن کچھ گناہ ایسے ہیں کہ وہ تو کبھی نہ کریں! ایک تو حقوق العباد کی پامالی... یہ کبھی نہ کریں اور یہ بات ذہن میں رکھ لیں کہ کسی کا جوتا چوری کرنا یہ حق العبد ہے اور بعض ایسے گناہ جن کو شاید ہم گناہ نہیں سمجھتے۔ مثلاً پانی کی ٹینکی ہے اس پر گلاس رکھے ہوئے ہیں، میں نے پانی پی لیا اور گلاس اٹھا کر لے گیا تو یہ جو میں نے گلاس اٹھایا ہے یہ حق العبد پر ڈاکہ مارا ہے، اس میں سب طلبہ کا حق تھا اور میں نے لیا ہے، قیامت کے دن مجھے ان سب کو اس گلاس کا جواب دینا پڑے گا۔ اب بتاؤ! میں قیامت کے دن کہاں سے دوں گا؟ ہم سمجھتے نہیں ہیں کہ ہم نے کتنا بڑا جرم کیا ہے؟

میں یہ اس لیے عرض کرتا ہوں کہ ہم طلبہ اگر اس چیز کا خیال نہیں کریں

105۔ صحیح مسلم، رقم:1017

گے تو لوگ کیسے خیال کریں گے؟ ایک تو ایسا حق کبھی نہ کھائیں جس کے ساتھ حق العبد کا تعلق ہو۔ دوسرا ایسا گناہ کبھی نہ کریں جو گناہ متعدی ہو! ایک گناہ لازمی ہے جو انسان کی ذات تک ہے، اس کا کسی اور سے تعلق نہیں مثلاً خدا نہ کرے کوئی بندہ حرام کھالیتا ہے تو اس کا تعلق اس کی ذات کے ساتھ ہے، کسی نے زنا کیا اس کا تعلق اس کی ذات کے ساتھ ہے لیکن ایک گناہ ایسا ہے جو دوسرے گناہ کا عادی بناتا ہے، مثلاً خود فلم دیکھتا تھا تو یہ بھی جرم تھا، اب اس نے دوستی لگائی اور ایک دوست کو فلم پر لگا دیا۔ اب یہ تو توبہ کرلے گا لیکن جس کو فلم پر لگایا ہے اس کی فلمیں کس کے کھاتے میں جائیں گی؟! یہ متعدی گناہ کبھی نہ کریں۔ ہم بھی اگر نہیں بدلیں گے تو بتاؤ دنیا میں کون سی جگہ ہے جہاں تبدیلی آئے؟ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ (آمین)

افضل ہونے کی بنیاد علم ہے:

﴿وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖ فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَہُمُ الطُّوۡفَانُ وَ ہُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۱۴﴾﴾

قرآن کریم کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال اپنی قوم کو دعوت دی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے بعد تئیس سال اپنی قوم کو دعوت دی ہے۔ اب دیکھو! ساڑھے نو سو سال کا زمانہ بہت بڑا ہے اور نوح علیہ السلام کی دعوت میں مشکلات ہی مشکلات ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی مشکلات سے بھری پڑی ہے لیکن مدنی زندگی میں غزوات کی مشکلات بھی ہیں اور ریاست، مرکز، صحابہ کرام اور اپنے متعلقین اور معتقدین کی وجہ سے راحت بھی ہے لیکن نوح علیہ السلام کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔

اس صورتحال کے پیش نظر ایک اشکال ہے کہ نوح علیہ السلام کی ساڑھے نو سو سال کی محنت اور مشقت کا تقاضا یہ ہے کہ نوح علیہ السلام مقام اور مرتبہ میں افضل

ہونے چاہییں کیونکہ مشقت بہت ہے۔ قرآن کریم اور شریعت کی رو سے ہمارے ہاں افضل اور ادنیٰ کا مدار تو دین کی مشقت اور دین کی محنت ہے اور جو شخص دین کا کام زیادہ کرتا ہے اس کا اجر بھی زیادہ ہے اور جو کم کرتا ہے اس کا اجر بھی کم ہے اور جس کا اجر زیادہ ہے تو اللہ کے ہاں افضل بھی وہی ہو گا۔ تو بظاہر حضرت نوح علیہ السلام کو افضل ہونا چاہیے!

لیکن یہ بات ذہن نشین فرمالیں کہ یہ اشکال اس وقت ہے کہ

نمبر1: جب انسان یہ نہیں سمجھتا کہ نبوت کا اصل منصب کیا ہے۔

نمبر2: جب یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ نبوت کی خاصیت کیا ہے اور نبوت کے حوالے سے اس بات کو جب تک آدمی نہیں سمجھتا کہ نبوت کا کمال کیا ہے۔

کمالِ علمی اصل کمال ہے:

یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ جو کسی چیز کا کمال ہوتا ہے وہ کمال تب ہوتا ہے جب وہ دوسرے میں نہ ہو۔ اگر وہ بات دوسرے میں بھی ہو تو اس بندے کا کمال نہیں رہتا۔ تو کمالِ نبوت؛ عمل نہیں ہے بلکہ کمال نبوت؛ علم ہے۔ لہٰذا جس پیغمبر کا علم جتنا زیادہ ہو گا اسی قدر یہ پیغمبر دوسرے پیغمبروں سے اعلیٰ اور افضل ہو گا۔ تو چونکہ کمالاتِ نبوت میں سے کمال اصلی؛ علم ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو علم ہے یہ تمام انبیاء علیہم السلام سے اعلیٰ ہے۔ ایک تو قرآن کریم میں ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾[106]

جب اللہ نے اپنے پیغمبروں سے یہ عہد لیا تھا کہ اگر میں تمہیں کتاب اور

106۔ آل عمران 81:3

حکمت دوں، پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو تمہارے پاس موجود کتاب کی تصدیق کرے تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤگے اور اس کی تصدیق بھی کروگے!

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تصدیق فرمائیں گے ان علوم کی جو انبیاء علیہم السلام کے پاس ہیں اور آدمی تصدیق تب ہی کرتا ہے جب اس کا علم ہو، اگر علم نہ ہو تو تصدیق کیسے کرے گا؟! تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر تورات کے مصدق ہیں تو اس کا معنی یہ ہے کہ تورات کے عالم بھی ہیں، اگر آپ انجیل کی تصدیق فرماتے ہیں تو اس کا معنی کہ آپ کے پاس انجیل کا علم بھی ہے، زبور کی تصدیق فرماتے ہیں تو زبور کا علم بھی ہے۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس تورات کا علم ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس انجیل کا علم ہے، حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس زبور کا علم ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان تینوں کا علم ہے اور ساتھ قرآن کریم کا علم بھی ہے۔ تو چونکہ آپ کا علم سب سے اعلیٰ ہے اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام بھی سب سے اعلی ہے۔ یہ بات سمجھ میں آئی؟(جی ہاں۔ سامعین)

اسی طرح یہ بات بھی دیکھ لیں کہ امت میں ایک ہے علم اور ایک ہے عمل، علم ایسا جس پر عمل ہو لیکن عمل فرائض کی حد تک ہو، واجبات کی حد تک ہو۔ امت میں اگر کوئی شخص صاحبِ علم ہو اور فرائض، واجبات اور سنن مؤکدہ کو بجالاتا ہو اور حرام اور مکروہات سے بچتا ہو اور نوافل اس کے نامہ اعمال میں نہ ہوں اور اس کے مد مقابل ایک امتی ہو جس کے نامۂ اعمال میں فرائض، واجبات، سنن مؤکدہ، غیر مؤکدہ اور نوافل اتنے زیادہ ہوں کہ جس کا عالم کے نامۂ اعمال میں تصور بھی نہ ہو سکتا ہو تو پھر بھی وہ عالم اس عابد سے اعلیٰ اور افضل ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک فیکٹری میں کام کرنے والے ہزار مزدور ہوتے ہیں اور اس فیکٹری میں کام کرنے والا ایک انجنیئر ہوتا ہے، مزدور آٹھ گھنٹے دھوپ میں مشقت اٹھاتا ہے اور اس کی تنخواہ پندرہ ہزار

روپے ہو گی اور یہ انجنیئر ائیر کنڈیشن میں بیٹھتا ہے اور روزانہ ایک گھنٹا دیتا ہے لیکن اس کی تنخواہ پندرہ لاکھ روپے ہو گی۔ ایک شخص کہتا ہے کہ یہ اے سی میں بیٹھتا ہے، ایک گھنٹا دیتا ہے، صرف کاغذ دیکھتا ہے اور چلا جاتا ہے لیکن اس کی تنخواہ پندرہ لاکھ روپے ہے اور ایک مزدور صبح سے لے کر شام تک مشقت اور گرمی میں اینٹیں اٹھاتا ہے اور اس کی تنخواہ صرف پندرہ ہزار روپے ہے! ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ یہ جو مزدور ہے یہ عامل ہے اور یہ انجینئر جو ہے یہ عالم ہے۔

جو نسبت عامل اور عالم کے درمیان ہوتی ہے یہی نسبت شریعت میں بھی ملحوظ ہوتی ہے عالم اور عابد میں۔ انبیاء علیہم السلام کا جو اصل کمال ہے وہ ہے علم، جس نبی میں علم زیادہ ہو گا وہ نبی دوسرے سے اعلیٰ ہو گا۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا علم تمام انبیاء علیہم السلام سے اعلیٰ ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام بھی سب سے اعلیٰ ہے۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو اولین و آخرین سب کا علم دیا گیا ہے[107]۔ اس کی مثال ایسے سمجھو جیسے ایک دماغ ہے اور ایک آنکھ ہے۔ آنکھ تب دیکھتی ہے جب دماغ کام کرتا ہو، دماغ کام نہ کرے تو آنکھ کام نہیں کرتی، کان تب سنتا ہے جب دماغ کام کرے، دماغ کام نہ کرے تو کان کام نہیں کرتا۔ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال ایک دماغ کی ہے اور باقی انبیاء علیہم السلام کی مثال کان، ناک کی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال مجموعۂ نبوت میں دماغ کی طرح ہے، اب جو دماغ اور آنکھ کا فرق ہے وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ اب دیکھو! آنکھ آٹھ گھنٹے دیکھ رہی ہے، کان دس گھنٹے سن رہا ہے لیکن کسی سے پوچھو کہ مقام دماغ کا زیادہ ہے یا کان اور آنکھ کا؟ ہر بندہ کہے گا کہ دماغ کا! تو اگر کسی نبی کی عملی

107۔ المہند علی المفند ص78

محنت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بھی ہو تب بھی اس کا مقام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم والا نہیں ہو سکتا۔

یہ جو گفتگو میں کر رہا ہوں یہ ساری گفتگو قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ حضرت نانوتوی کے عجیب علوم تھے۔ اللہ پاک ہم سب کو ان کے علوم پڑھنے اور سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

سجدہ نبوی؛ سجود امت سے افضل ہے:

اور اسی سے یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین فرمالیں کہ ہمارا جو یہ عقیدہ ہے کہ پیغمبر کا ایک سجدہ ہو تو امت کے اربوں سجدوں سے اعلیٰ ہے، نبی کا ایک مرتبہ سبحان اللہ کہنا یہ امت کے اربوں سبحان اللہ کہنے سے اعلیٰ ہے، پیغمبر بظاہر عمل کم ہونے کے باوجود امت سے آگے نکل جاتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اللہ کے ہاں جو عبادت کا وزن اور اجر ہوتا ہے وہ عبادت کی کمیت کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ عبادت کی کیفیت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اگر اخلاص کم ہو اور سو بار پہلا کلمہ پڑھیں اور اخلاص زیادہ ہو اور ایک بار پڑھیں تو ایک بار اخلاص کے ساتھ پڑھا جانے والا کلمہ سو بار بغیر اخلاص کے ساتھ پڑھے جانے والے کلمے سے آگے نکل جاتا ہے، اگر اخلاص ہو اور تعداد کم ہو پھر بھی آگے نکل جائے گا۔

کسی عمل میں اخلاص کا زیادہ ہونا، کسی عمل میں خشوع کا زیادہ ہونا اس کی بنیاد ہوتی ہے تواضع پر۔ جو بندہ جس قدر زیادہ متواضع ہوتا ہے اسی قدر اس کی عبادات میں خشوع بھی زیادہ ہوتا ہے، اور تواضع کی بنیاد ہمیشہ معرفت پر ہوتی ہے، جس قدر بندہ کسی کو پہچانتا ہے تو اسی قدر بندہ تواضع اختیار کرتا ہے اور معرفت کی بنیاد ہوتی ہے علم، جس قدر جس بندے کی معلومات ہوتی ہیں اسی قدر اس بندے کو معرفت ہوتی ہے۔ اب دیکھو! اعمال کے وزن کی بنیاد کیفیت اور کیفیت کی بنیاد تواضع اور تواضع کی بنیاد

معرفت اور معرفت کی بنیاد علم ہے۔

آپ نے کئی بار دیکھا ہو گا کہ ہم کرسی پر بیٹھے ہوتے ہیں، بیان ختم ہو گیا، مصافحہ کرنا ہے، اب بعض آتے ہیں مصافحہ بھی کرتے ہیں اور ہاتھ بھی چوم رہے ہوتے ہیں، بعض آتے ہیں مصافحہ کرتے ہیں اور ہاتھ نہیں چومتے اور بعض بچے ایسے آتے ہیں کہ مصافحہ کریں گے اور مجھے نہیں بلکہ مجمع کو دیکھتے ہوئے کرتے ہیں، کیونکہ وہ روٹین وائز مصافحہ کر رہے ہیں، ان کے دل میں عظمت نہیں ہے، جب عظمت نہیں ہو گی تو تواضع بھی نہیں ہو گی۔

تو کیفیت کی بنیاد ہوتی ہے عظمت اور عظمت کی بنیاد تواضع اور تواضع کی بنیاد معرفت ہے۔ آپ کسی بندے کے سامنے متواضع تب ہوں گے جب اس کو پہچانتے تو ہوں نا کہ بندہ کون ہے؟ آپ سڑک سے گزریں، ایک سفید ریش بزرگ کھڑے ہیں، آپ سلام کر کے گزر جاتے ہیں، ایک اور بندہ آتا ہے، وہ ان بزرگ سے پوچھتا ہے کہ استاد جی! آپ نے کہیں جانا ہے؟ وہ سمجھتا ہے کہ ہماری مسجد کے امام صاحب ہیں، وہ ان کی عزت تھوڑی سی زیادہ کرتا ہے، ایک تیسرا بندہ آتا ہے اور کہتا ہے میری گاڑی میں بیٹھیں میں آپ کو شہر چھوڑ کر آتا ہوں، تو یہ تیسرا آنے والا ان کا شاگرد ہے جس نے ان کے پاس پڑھا تھا تو تینوں میں فرق ہو گیا۔ اس لیے کہ جتنی معرفت ہو گی اتنی تواضع ہو گی اور معرفت کی بنیاد علم اور معلومات ہیں۔

اب بات سمجھنا! رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا اللہ کی ذات اور صفات کے بارے میں اتنا علم ہے کہ سارے انسانوں کا علم بھی جمع کریں تو حضور کے علم سے کم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اللہ کی جتنی عظمت ہے ساری کائنات کی عظمت کو جمع کریں تو وہ اس سے کم بنتی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اللہ کی عظمت ہے۔ وجہ؟ علم کی وجہ سے معرفت ہے،

معرفت کی وجہ سے عظمت ہو رہی ہے اور جب عظمت دل میں ہو گی تو اس مطلب یہ ہو گا کہ جس قدر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اللہ کی تواضع، عظمت، خشیت اور خشوع ہے تو سارے انسانوں کا خشوع جمع کر لیں تو آپ کا خشوع زیادہ ہے، کیوں؟ اس لیے کہ خشوع کی بنیاد عظمت ہے، اس کی بنیاد معرفت ہے، اس کی بنیاد علم ہے تو جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خشوع پوری کائنات کے انسانوں سے زیادہ ہے اور عمل کی کیفیت کی بنیاد خشوع ہوتا ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی جو کیفیت ہے یہ پوری کائنات کے انسانوں کی کیفیات سے زیادہ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سجدہ کریں تو اس کی کیفیت اتنی بڑی ہوتی ہے کہ اگر قیامت تک آنے والے سارے انسانوں کی سجدوں کی کیفیات ملا بھی لیں تب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سجدے کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تو پھر پیغمبر کا ایک سجدہ پورے انسانوں کے سجدے سے اعلیٰ ہو گا۔ (سبحان اللہ۔ سامعین) بات سمجھ آگئی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین)

حضرت نانوتوی کے علوم:

مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تحذیر الناس میں یہی بات فرماتے ہیں کہ بظاہر امتی اعمال میں نبی سے بڑھ جاتا ہے حقیقت میں نہیں بڑھتا۔ یہ "بظاہر" کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک تریسٹھ سال ہے، امتی کی عمر ساٹھ سال ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کام چالیس سال کے بعد شروع کیا ہے اور امتی پندرہ سال کے بعد بالغ ہوتے ہی نمازیں شروع کر دے گا۔ تو بظاہر تو نمازیں اس کی زیادہ ہیں لیکن اللہ کے ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازوں کا جو وزن ہے وہ اس امتی کی نمازوں کا نہیں ہے۔ تو بظاہر امتی نبی سے بڑھتا ہے لیکن حقیقت میں نہیں بڑھ سکتا۔ حضرت نانوتوی کی اسی عبارت پر بریلوی حضرات اعتراض کرتے ہیں۔

قومِ لوط کے جرائم:

﴿اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَ تَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ﴾

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے بنیادی طور پر تین جرم تھے جو قرآن کریم نے بیان کیے ہیں؛ پہلا جرم یہ تھا کہ وہ لڑکوں سے بدفعلی کرتے تھے۔

اور دوسرا جرم اس قوم کا یہ تھا کہ وہ ڈاکے ڈالتے تھے اور تیسرا جرم یہ تھا کہ بے حیائی کا کام مجلس میں کرتے تھے۔ بعض نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ یہ بدفعلی بھی کرتے اور مجلس میں ہی کرتے تو یہ ان کا دوہرا جرم تھا، یا اس کا مطلب یہ ہے کہ بدفعلی تو مجلس میں نہیں کرتے تھے لیکن بعض دیگر نامناسب کام مجلس میں کرتے ہوئے شرماتے نہیں تھے، اور یہ بات معاشرے میں دیکھ لیں کہ بہت سارے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے مزاج میں بے حیائی ہوتی ہے اور وہ سمجھتے نہیں کہ مجلس میں یہ بات کرنی چاہیے، یہ کام اس مجلس کے مناسب ہے یا نہیں! وہ یہ کام کریں گے اور اس کے اس کام پر دس بندے ہنسیں گے تو اسے فخر ہو گا کہ میرے اس کام پر دس بندے ہنس پڑے ہیں۔

چار قسم کا عذاب:

﴿فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا﴾

اللہ تعالیٰ نے یہاں چار قسم کے عذاب کا تذکرہ فرمایا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم، حضرت لوط علیہ السلام کی قوم اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی قوموں کا

تذکرہ فرمایا کہ ان میں سے نافرمان لوگوں کو ہم نے ان کو یہ عذاب دیے:

﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا﴾ بعضوں پر سخت تیز ہوا بھیجی جس میں پتھر تھے، ﴿وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ﴾ اور بعضوں کو چیخ نے ہلاک کردیا، ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ﴾ اور بعضوں کو زمین میں دھنسادیا، ﴿وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا﴾ اور بعضوں کو پانی میں غرق کردیا۔ ان چار عذابوں کا معنی یہ نہیں ہے کہ عذاب ان چار میں منحصر ہے بلکہ عذاب اس کے علاوہ بھی ہیں، ان چار کا ذکر اس لیے کیا کہ خاص خاص لوگوں پر یہ خاص چار عذاب آئے تھے۔۔

داعی کے لیے دو چیزوں کا اہتمام:

﴿اُتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾﴾

یہاں اللہ رب العزت نے دین کی دعوت دینے والے داعی اور واعظ کو نصیحت کی ہے کہ اس کو دو چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے:

نمبر 1: ﴿اُتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ قرآن کریم کی تلاوت کرنا

نمبر 2: ﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ﴾ نماز کی پابندی اور اہتمام کرنا

داعی اور واعظ کو یہ دو چیزیں اختیار کرنی چاہییں، یہ داعی کے لیے بنیادی چیزیں ہیں، نماز پڑھنا کافی نہیں ہے بلکہ نماز کا اہتمام ضروری ہے، ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ﴾ کیونکہ نماز انسان کو فحشاء اور منکر سے روک دیتی ہے۔ فحشاء اور منکر کا معنی کیا ہے؟

"منکر" ایسے گناہ کو کہتے ہیں جس کے حرام ہونے پر دلیل شرعی ہو، اور

"فحشاء" اس گناہ کو کہتے ہیں جس کو ہر عقل مند شخص برا اور نامناسب سمجھے چاہے وہ مؤمن ہو یا کافر ہو، مثلاً زنا ہے... دنیا میں جو کفار ہیں وہ بھی زنا کو اچھا نہیں سمجھتے، ڈاکہ... دنیا میں کوئی کافر بھی اس کو اچھا نہیں سمجھتا، کسی کا حق مارنا... کوئی کافر بھی اس کو اچھا نہیں سمجھتا۔ تو فرمایا کہ تم نماز کی پابندی کرو اس لیے کہ نماز فحشاء اور منکر ہر قسم کے گناہوں سے روک دیتی ہے۔

نماز گناہ سے روکتی ہے تو نمازی گناہگار کیوں؟

اس پر سوال یہ ہے کہ بسا اوقات بندہ نماز پڑھتا ہے اور پھر بھی گناہ نہیں چھوڑتا! اس کے دو جواب ہیں؛

ایک یہ کہ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ نماز بندے سے اس کے گناہ چھڑوا دیتی ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ نماز گناہوں سے روکتی ہے، روکنا اور ہے اور چھڑوانا اور ہے۔ قرآن کریم زنا سے روکتا ہے لیکن لوگ پھر بھی کرتے ہیں، قرآن شراب سے روکتا ہے لیکن لوگ پھر بھی پیتے ہیں، اس لیے نماز گناہوں سے روکتی ہے کا معنی یہ نہیں ہے کہ نمازی گناہ نہیں کرے گا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جب نماز پورے آداب کے ساتھ ہو تو پھر گناہوں سے روکتی ہے اور آدمی کو توفیق مل جاتی ہے کہ گناہوں سے بچ جاتا ہے لیکن اگر کسی کو یہ توفیق نہ ملے تو اسے غور کرنا چاہیے کہ اس کی نماز بغیر آداب کی رعایت کے ہے، اس لیے بندے کو پورے آداب کے ساتھ نماز کا اہتمام کرنا چاہیے، اور ایک حدیث پاک میں ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ لَمْ تَنْهَهُ صَلَاتُهُ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ فَلَا صَلَاةَ لَهُ." [108]

108۔ تفسیر ابن ابی حاتم: ج7 ص294

کہ وہ نماز جو انسان کو گناہوں سے نہ روکے تو وہ تو نماز کہلانے کے لائق ہی نہیں۔

لیکن اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ اگر نماز پڑھیں اور گناہ نہ چھوٹیں تو بندہ نماز ہی چھوڑ دے بلکہ نماز پڑھتا رہے، ایک وقت آئے گا کہ اللہ اس کو توبہ کی توفیق عطا فرمائیں گے۔

اور قرآن کریم کی تلاوت انسان کو راہ راست پر لاتی ہے اور نیک اعمال کی توفیق ملتی ہے، بندہ گناہوں سے بچتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بندہ قرآن کا مخاطب خود کو سمجھے، ایسا نہ ہو کہ درسِ قرآن مسجد میں دیں اور قرآن کا مخاطب مقتدی کو سمجھیں اور خود کو نہ سمجھیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہ کئی بار فرماتے کہ میں اپنے اندر جو عیب دیکھتا ہوں اسی پر میں بیان کرتا ہوں اور خود کو مخاطب کرتا ہوں۔ یہ بہت اہم چیز ہے کہ قرآن کریم کے مخاطب خود کو سمجھیں گے تو توبہ کی توفیق ملے گی اور اگر درسِ قرآن دیں گے اور عوام کے لیے دیں گے تو پھر خود کو توبہ کی توفیق نہیں ملتی۔

ہجرت کا حکم:

﴿يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾﴾

یہاں پر ان حضرات کو بات سمجھائی ہے کہ جو لوگ دین پر عمل نہیں کر سکتے یا دین کا کام نہیں کرتے اور ان کا عذر ان کا معاشرہ ہوتا ہے کہ اس ماحول میں ہم کام نہیں کر سکتے تو اللہ رب العزت نے فرمایا کہ میری زمین بہت وسیع ہے، اگر ایک زمین میں رہتے ہوئے دین کا کام نہیں کر سکتے تو اس علاقے سے ہجرت کر کے کسی اور جگہ چلے جاؤ۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا

كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا﴾[109]

کہ جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا اور اسی حالت میں فرشتے جب ان کی جان نکالنے آئے تو فرشتوں نے پوچھا کہ تم کس حالت میں تھے؟ تو ان ظالم لوگوں نے کہا کہ ہم مجبور تھے، فرشتوں نے کہا: ﴿اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا﴾ کہ خدا کی زمین تو بڑی وسیع اور کشادہ ہے، تم ہجرت کر جاتے! اپنا علاقہ چھوڑ کر کسی اور علاقے میں چلے جاتے۔

رابطہ رکھ کر کام کریں!

میں طلبہ سے یہ درخواست کیا کرتا ہوں کہ جب آپ ہمارے ہاں تخصص کر لیں تو کام کے لیے اپنے علاقے کو ترجیح دیں۔ باقی یہ بات کہ اپنے علاقے میں کیسے کام کرنا ہے تو اس کے لیے ہم سے رابطہ رکھیں، وہاں کے حالات بتائیں، پھر یہاں سے ہدایات لیں، کچھ وقت لگے گا، پھر علاقے میں کام شروع ہو جائے گا ان شاء اللہ۔

ہمارے ہاں طلبہ اپنے علاقے میں جاتے ہیں، کام شروع کرتے ہیں، احوال نامناسب ہوتے ہیں، یہ سہہ نہیں سکتے تو ہمیں بتائے بغیر علاقہ چھوڑ دیتے ہیں۔ جب کبھی ملاقات ہوتی ہے اور میں حالات اور کام کا پوچھتا ہوں تو کہتے ہیں کہ استاد جی! میں فلاں علاقے کا ہوں۔ وہ علاقہ کیوں چھوڑا؟ جی! حالات ٹھیک نہیں تھے۔ تو میں کہتا ہوں کہ ہمیں تو بتاتے کہ حالات ٹھیک نہیں تھے، مشورہ تو کر لیتے، اس کے بعد آپ آگے چلتے۔ جی استاذ جی! میں نے بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ اس سے آپ کو تکلیف

109۔ النساء 97:4

ہو گی۔ میں نے کہا کہ آپ جو علاقہ چھوڑ کر چلے گئے ہیں تو کیا اس سے مجھے خوشی ہو گی؟

بعض لوگوں کا دماغ بہت عجیب ہوتا ہے۔ ایک طالب علم پڑھتا ہے۔ دو چار مسئلے بنیں گے تو چھوڑ کر چلا جائے گا۔ عین جانے کے وقت آتا ہے اور کہتا ہے: استاد جی! میں جانے لگا ہوں! کیوں جا رہے ہو؟ مجھے فلاں استاد نے ڈانٹا ہے! مجھے فلاں نے مارا ہے! فلاں نے میری بے عزتی کی ہے! میں نے کہا کہ مجھے بتایا کیوں نہیں؟ جی! میں نے سوچا کہ استاذ جی آپ کو تکلیف ہو گی۔ میں نے کہا کہ ابھی جو تم جا رہے ہو تو کیا میں مٹھائی تقسیم کروں گا؟ ابھی خوشی ہو گی؟ بھائی یہ تم پہلے دن بتاتے تو اس کا حل نکل آتا، اب چھوڑ کر جا رہے ہو تو اب اس کا کیا حل نکل سکتا ہے؟! تو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔

امیر اور پیر ایک ہونا چاہیے:

اگر تم ایک علاقے میں کام نہیں کر سکتے تو علاقہ بدل لو لیکن اپنی رائے سے نہ بدلو بلکہ کسی بندے سے مشورہ کر کے بدلو، اور میں ایک بات کہتا ہوں وہ شاید آپ کو ابھی سمجھ میں نہ آئے، جب آپ میری سیٹ پر ہوں گے تو پھر آپ کو سمجھ میں آئے گی۔ میں کہتا ہوں کہ اپنا امیر اور اپنا پیر ایک رکھو۔ ہمارے ہاں پیر الگ ہوتا ہے اور امیر الگ ہوتا ہے، امیر کی فکر الگ ہے اور پیر کی الگ ہے، جب پیر اور امیر کی رائے الگ الگ ہو تو مرید اور کارکن پریشان ہوتا ہے کہ میں کدھر جاؤں؟! اور اگر پیر اور امیر ایک ہو تو پھر کبھی الجھن نہیں ہو گی۔ میری گزارش سمجھ آئی؟ (جی ہاں۔ سامعین) اس کا ہمیشہ خیال فرمائیں۔

میں یہ بات سمجھاتا ہوں کہ ہمیشہ استخارہ اور استشارہ کرنے کے بعد بات طے کرو کہ میں نے کرنا کیا ہے؟ استخارہ کہ اللہ سے خیر طلب کرو دو رکعات پڑھ کر اور استشارہ کہ اپنے با اعتماد دوستوں سے مشورہ کرو اور جو تم سے محبت کرتے ہیں ان سے

کرو۔ پھر یہ طے کر لو کہ نے زندگی میں کیا کرنا ہے؟ ہدف طے کرو! جب یہ ہو گیا تو اب اس ہدف تک پہنچنے کے لیے کون سا شخص مناسب ہے؟ استخارہ اور استشارہ سے اس بندے کا انتخاب کرو! جب یہ دو چیزیں طے ہو گئیں تو اب دائیں بائیں نہیں دیکھنا، بس اب چلتے رہو! اللہ تمہیں نتائج عطا فرمائیں گے۔ الجھن تب ہوتی ہے کہ جب ہم ہدف طے نہیں کرتے کہ ہم نے کرنا کیا ہے۔ کبھی ادھر کبھی ادھر، کبھی یہ کبھی وہ اور جب ہدف طے ہو جاتا ہے تو اس ہدف تک پہنچنا کیسے ہے۔ اس کا طریقہ متعین نہیں ہو پاتا تو پھر آدمی الجھن کا شکار رہتا ہے۔

ہجرت کرنے والوں کو تسلی:

تو فرمایا: ﴿یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ اَرۡضِیۡ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾﴾ کہ اے میرے مومن بندو! میری زمین بہت کشادہ اور وسیع ہے، لہذا خالص میری ہی عبادت کرو! یہاں بات سمجھیں کہ جب آدمی اپنا علاقہ چھوڑ کر دوسرے علاقے میں مستقل چلا جاتا ہے تو بندے کو دو پریشانیاں ہوتی ہیں؛ پہلی پریشانی کہ خوف ہوتا ہے کہ میری جان کا کیا بنے گا، کہیں میں مر نہ جاؤں۔ تو اللہ نے فرمایا "کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَۃُ الۡمَوۡتِ" کہ موت تو آنی ہے ادھر بھی آنی ہے ادھر بھی آنی ہے، اس خدشے چھوڑو اور اپنا کام شروع کرو، اور دوسری پریشانی یہ ہوتی ہے کہ اپنے علاقے میں رشتہ دار ہیں، گھر بار ہے، ہجرت کر کے دوسرے علاقے میں جاؤں گا تو معاش کا کیا بنے گا؟ تو فرمایا:

﴿وَ کَاَیِّنۡ مِّنۡ دَآبَّۃٍ لَّا تَحۡمِلُ رِزۡقَہَا ٭ۖ اَللّٰہُ یَرۡزُقُہَا وَ اِیَّاکُمۡ ۫ۖ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۶۰﴾﴾

کہ کتنے جانور ایسے ہیں جو اپنا رزق روزی اٹھا کر نہیں پھرتے، اللہ انہیں بھی

رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی رزق دیتا ہے، اللہ تمہاری باتیں سنتا بھی ہے اور تمہاری نیتوں کو جانتا بھی ہے اس لیے رزق کی فکر نہ کرو۔ یہ دو کام ہم حل کریں گے بس تم اپنا سفر شروع کرو۔

مشرکین کا مصیبت کے وقت اللہ کو پکارنا:

﴿فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ﴿٦٥﴾﴾

مشرکین کی عادت تھی کہ جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے اور پھنس جاتے تو اس وقت اللہ کو پکارتے اور اخلاص کے ساتھ پکارتے۔ مشرک بھی سمجھتے تھے کہ اس مشکل سے اللہ کے علاوہ کوئی بھی نہیں نکال سکتا تو چونکہ دعا اخلاص سے ہوتی تھی تو اللہ ان کے اخلاص کو قبول فرمالیتے تھے۔ یہ ہے اخلاص کا معنی! اخلاص کا معنی یہ نہیں تھا کہ وہ مؤمن ہو جاتے تھے، وہ نیک ہو جاتے تھے بلکہ اس گھڑی میں ان کا عقیدہ یہ ہوتا تھا کہ اس مشکل سے خدا کے علاوہ ہمیں کوئی نہیں نکال سکتا، تو اللہ بچا دیتے اور یہ پھر شرک شروع کر دیتے۔

اب دیکھو! اس آیت اور دیگر اس قسم کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کی دعائیں اللہ قبول فرماتے ہیں اور قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ﴿١٤﴾﴾[110]

کہ کافر کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ تو بظاہر دونوں آیتوں میں تعارض ہے۔

جواب یہ ہے کہ ان میں تعارض نہیں ہے اس لیے کہ مقام بدل گیا ہے۔ یہ جو ہے کہ ان کی دعا قبول ہو گئی تھی اس کا تعلق دنیا کے ساتھ ہے اور یہ جو کہا گیا کہ ان

110۔ الرعد 14:13

کی دعا قبول نہیں ہوگی اس کا تعلق آخرت کے ساتھ ہے، اب تعارض و تناقض نہیں رہتا۔ آپ تو منطقی لوگ ہیں۔ علم منطق میں پڑھتے رہتے ہیں کہ:

در تناقض ہشت وحدت شرط داں
وحدتِ موضوع و محمول و مکاں
وحدتِ شرط و اضافت جزء و کل
قوت و فعل است در آخر زماں

تین کام چار طریقے:

﴿وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۶۹﴾

کہ جو شخص ہمارے دین کے راستے میں مشقت برداشت کرے اور محنت کرے تو ہم اس کے لیے اپنے راستے کھول دیتے ہیں، یقیناً اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ آ رہی ہے کہ ”سبل“ یہ ”سبیل“ کی جمع ہے، اللہ تک پہنچنے کا ایک راستہ نہیں ہے، اللہ تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں۔ تو دین کو ایک خاص ہیئت میں محدود کرنا یہ بہت بڑا ظلم ہوگا۔ اس لیے میں یہ بات اکثر سمجھایا کرتا ہوں کہ مجموعۂ نبوت نے تین کام کیے ہیں:

نمبر 1: اشاعت دین — نمبر 2: دفاع دین — نمبر 3: نفاذ دین

اور اس کام کے لیے چار طریقے اختیار کیے ہیں:

1: تقریر — 2: تحریر — 3: مناظرہ — 4: جہاد

اب یہ جو تین کام اور چار طریقے ہیں کوئی بندہ کہے کہ میں نے ایک ہی کام کرنا ہے، نفاذ اسلام تو جرم ہے۔ میں نے ایک ہی کرنا ہے، دفاع اسلام تو جرم ہے۔ میں

ایک ہی کروں گا، اشاعت اسلام تو جرم ہے۔

اشاعتِ دین فضائل سے ہوتی ہے، ترغیب سے ہوتی ہے۔ دفاعِ دین دلائل سے ہوتا ہے اور نفاذ دین طاقت سے ہوتا ہے۔ اس لیے یہ تینوں کام ہمارے ہیں، فضائل والا بھی، دلائل والا بھی اور طاقت والا بھی۔ اگر فضائل والا دلائل نہیں دے سکتا تو دلائل والوں کی مخالفت نہ کرے اور دلائل والا اگر طاقت نہیں رکھتا تو طاقت والوں کی مخالفت نہ کرے۔ ہمارے اس دور میں تبلیغ والے یہ فضائل والے ہیں اور تبلیغ سے مراد خاص تبلیغی جماعت نہیں بلکہ علماء، خطباء اور واعظین بھی اس کا حصہ ہیں، اور دلائل یہ ہمارا کام ہے اور ہماری طرح جو لوگ دنیا میں کام کرتے ہیں کہ شریعت پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دلائل سے دیتے ہیں، یہ دفاع دین ہے، اور نفاذِ دین یہ طاقت سے ہوتا ہے جو کہ مجاہدین کا کام ہے۔

یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے کہ ہم فضائل والا کام نہیں کرتے، ہم طاقت والا کام نہیں کرتے لیکن ہم ان دونوں کو برا بھی نہیں کہتے، ایک کام ہم نہیں کرسکتے تو وہ کام دوسرے کریں گے۔ میں نے کئی بار کہا ہے کہ مجھے بہت سارے تعجبات ہوتے ہیں، ایک تعجب مجھے اس بات پر ہوتا ہے کہ ہم فضائل اور طاقت والوں کو برا نہیں کہتے، تنقید بھی نہیں کرتے، اعتراض بھی نہیں کرتے اور ہمارے اوپر ہر دوسرا بندہ اعتراض کرتا ہے تم یہ کیوں کرتے ہو؟ یہ کیوں کرتے ہو؟ میں نے کہا کہ کبھی ہم نے بھی اعتراض کیا ہے؟! تم لوگ ہم پر اعتراض بھی کرتے ہو اور معتدل بھی ہو اور ہم اعتراض سنتے ہیں اور اس کا جواب بھی نہیں دیتے تو ہم متشدد ٹھہرے اور میڈیا پر آکر تم ہمارے خلاف باتیں بھی کرتے ہو اس کے باوجود تم معتدل ہو اور ہم جو خاموش رہتے ہیں ہم متشدد ہیں۔ اس پر مجھے بہت تعجب ہوتا ہے۔

تین کام ہیں: اشاعتِ دین، دفاعِ دین اور نفاذِ دین۔ اس کے لیے چار طریقے

ہیں: پہلا تقریر، دوسرا تحریر، تیسرا مناظرہ اور چوتھا جہاد۔ میں ان شاء اللہ اس عنوان کو اپنے اجتماع "دورہ تربیۃ العلماء" میں پیش کروں گا، پھر تفصیل سے بات کریں گے تاکہ آپ اس کو سمجھیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی موضوعات ہم نے طے کیے ہیں۔

تو یہاں اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَ الَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا﴾ یہاں "سبل" فرمایا، "سبیل" نہیں فرمایا۔ "سبل" کہہ کر ہم جیسے فقیروں کے لیے بھی راستے کھولے ہیں۔ ہمیں بھی کچھ تسلی ہوتی ہے کہ ہمارا کام دین کا کام ہے۔ اللہ ہم سب کو دین کا کام اخلاص کے ساتھ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَا أَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ.

سورۃ الروم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿الٓـمّٓ ۚ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ۙ﴿۲﴾ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَ ہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِہِمۡ سَیَغۡلِبُوۡنَ ۙ﴿۳﴾﴾

روم وفارس کی جنگ اور نزولِ سورت کا قصہ:

مکہ مکرمہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اعلانِ نبوت فرمایا تو اس وقت عرب سے باہر دو بہت بڑی طاقتیں تھیں؛ ایک روم اور دوسری ایران۔ روم میں عیسائیوں کی حکومت تھی اور ایران میں آتش پرستوں، مجوسیوں اور آگ کے پجاریوں کی حکومت تھی۔ مسلمان چونکہ اسلامی تعلیم اور آسمانی کتاب کو مانتے تھے اور عیسائی آسمانی کتاب؛ انجیل کو مانتے تھے اس لیے مسلمانوں کی کسی قدر نزدیکی اور قرب عیسائیوں سے تھا۔

عیسائی بھی اللہ کو مانتے ہیں مسلمان بھی مانتے ہیں، عیسائی قیامت کو مانتے ہیں مسلمان بھی مانتے ہیں، عیسائی رسالت کو مانتے ہیں مسلمان بھی مانتے ہیں اور مشرکین؛ اللہ کے ساتھ بتوں کو بھی معبود مانتے تھے جس کو عیسائی نہیں مانتے تھے، مشرکین قیامت کا انکار کرتے تھے عیسائی اقرار کرتے تھے، مشرکین رسالت کو نہیں مانتے تھے اور عیسائی مانتے تھے، اس لیے مسلمانوں کی ذہنی ہم آہنگی اہلِ روم کے ساتھ تھی۔ اگر

ان میں جنگ ہو اور رومی غالب ہوں تو مسلمانوں کو خوشی ہوتی تھی اور اگر ایرانی غالب ہوں تو مشرکین کو خوشی ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ جنگ ہوئی جس میں ایرانی غالب آ گئے تو مشرکین خوش ہوئے۔

اس کے بعد قرآن کریم کی یہ آیتیں نازل ہوئیں: ﴿غُلِبَتِ الرُّوْمُ﴾ روم مغلوب ہو گیا، ﴿فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ﴾ قریب کی زمین میں۔ اس سے مراد ملک شام کے علاقے اذرعات اور بصریٰ ہیں جو رومی سلطنت کا حصہ تھے اور بنسبت ایران مکہ سے قریب تھے۔ یعنی رومیوں کی زمین میں جنگ ہوئی اور ایرانی غالب آئے۔ ﴿وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ﴾ ایک وقت آئے گا کہ پھر روم والے عیسائی ایرانیوں پر غالب آئیں گے۔ کب؟ ﴿فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ﴾ چند سالوں میں۔ "بِضْعٌ" عربی میں کہتے ہیں تین سے لے کر نو تک نو، یعنی تین سے زائد اور نو سے کم ہوں، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو کو بضع کہتے ہیں۔

﴿لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ﴾ جب رومی مغلوب تھے تب بھی اللہ کا حکم چلتا تھا اور جب یہ غالب ہوں گے بھی اللہ کا حکم چلے گا۔ ﴿وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ﴾ اور جب رومی غالب آئیں گے تو مؤمنین خوش ہوں گے اللہ کی مدد کی وجہ سے۔ اللہ کی مدد کا معنی کہ رومی بھی کافر ہیں اور ایرانی بھی کافر ہیں۔ اب کسی ایک کے ساتھ اللہ کی مدد یہ اسلام اور کفر والی نہیں ہے بلکہ اللہ کی مدد کا معنی یہ ہے کہ روم کو اللہ غالب کر کے مسلمانوں کو خوشی دیں گے اور یہ مسلمانوں کی خوشی اللہ کی مدد کی وجہ سے ہے۔

صدیق اکبر کا شرط لگانا:

جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ابی بن خلف سے یہ

شرط لگائی کہ تین سال میں رومی غالب آئیں گے میں یہ قسم کھاتا ہوں۔ اس نے کہا کہ نہیں آئیں گے۔ شرط لگ گئی دس دس اونٹوں کی کہ اگر روم غالب آ گیا تو ابی بن خلف دس اونٹ دے گا اور اگر ایران غالب آ گیا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ دس اونٹ دیں گے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آ کر خبر دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کریم میں تو ﴿بِضۡعِ سِنِيۡنَ﴾ کہا ہے اور "بِضۡع" تو تین سے لے کر نو تک کو کہتے ہیں۔ لہذا جا کر شرط تبدیل کرو۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آئے تو ابی بن خلف سے کہا کہ تین نہیں نو سال میں اندر غالب ہوں گے اور شرط ہم دس اونٹ کے بجائے سو اونٹ کی لگا لیتے ہیں۔ ہم مدت بھی بڑھا دیتے ہیں اور شرط میں اونٹ بھی بڑھا دیتے ہیں۔ ابی بن خلف نے کہا کہ مجھے منظور ہے۔ اس کو یہ اندیشہ ہوا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کہیں مکہ چھوڑ کر ہجرت نہ کر جائیں تو اس نے کہا کہ اپنا کوئی ضامن دو۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا ضامن اپنے بیٹے عبد الرحمٰن بن ابی بکر کو بنایا کہ میرا یہ ضامن ہے۔

ایک وقت آیا کہ جنگ بدر ہوئی اس میں ابی بن خلف مارا گیا۔ اس کے ایک سال بعد روم والے غالب آ گئے۔ اب ابی بن خلف تو موجود نہیں تھا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس کے ورثاء سے مطالبہ کیا شرط کا تو اس کے بیٹے نے سو اونٹ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دیے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ سو اونٹ لے کر مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "هٰذَا السُّحۡتُ تَصَدَّقۡ بِهٖ" کہ یہ تو ناپسندیدہ مال ہے، ہم اس کو نہیں لے سکتے اس لیے تم اس کو صدقہ کر دو۔

"سُحت" کے کئی معانی آتے ہیں، معروف معنی اس کا "گناہ" ہوتا ہے، اس کے علاوہ ناپسندیدہ چیز کو بھی "سُحت" کہتے ہیں۔ یہ مال حرام نہیں تھا کیونکہ جس وقت

انہوں نے ان کے ساتھ شرط لگائی تھی تو شرط حرام نہیں تھی تو پھر مال حرام کیسے ہوا؟ اس لیے میں اس کا جواب عرض کر رہا ہوں کہ "سُحت" کا متعارف معنیٰ اگرچہ حرام ہے لیکن عام معنوں میں "سُحت" ہر اس مال کو بھی کہتے ہیں جو ناپسندیدہ ہو اگرچہ حلال ہو۔ تو مال حلال ہونے کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا بلکہ اس سارے مال کو آپ نے صدقہ فرما دیا۔ یاد رکھیں کہ اب دو طرفہ شرط حرام ہے۔

پانچ نمازوں کا اشارہ:

﴿فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ حِيۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَ حِيۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ﴿۱۷﴾ وَ لَهُ الۡحَمۡدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ عَشِيًّا وَّ حِيۡنَ تُظۡهِرُوۡنَ ﴿۱۸﴾﴾

اللہ رب العزت کی پاکی بیان کیا کرو جب تم شام کرو اور جب تم صبح کرو، آسمانوں اور زمین میں اللہ ہی کی حمد بیان ہوتی ہے، اور پچھلے پہر بھی اللہ کی پاکی بیان کیا کرو اور ظہر کے وقت بھی۔

"عَشِيًّا" کا ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کرتے ہیں "آخری وقت" اور شاہ رفیع الدین فرماتے ہیں "سہ پہر"۔ شاہ عبد القادر فرماتے ہیں کہ پچھلے پہر سے مراد عصر کی نماز ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا معنیٰ "بعد زوال" فرمایا۔ "عَشِيًّا" زوال کے بعد ہی ہوتا ہے خواہ کتنی ہی دیر بعد ہو۔ تو یہاں فرمایا شام، صبح، عصر اور ظہر۔ یہ آیت چونکہ مکی ہے تو بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے مراد خاص چار اوقات ہیں:

شام کا وقت　　صبح کا وقت　　عصر کا وقت　　ظہر کا وقت

آیت مکی ہے اور مراد عام تسبیحات ہیں اس سے مراد نمازیں نہیں ہیں۔

بعض حضرات نے اس سے مراد نمازیں لی ہیں کہ اس آیت میں پانچ نمازوں

کا اشارہ نکلتا ہے۔ ﴿حِيْنَ تُمْسُوْنَ﴾ میں مغرب اور عشاء دونوں شامل ہیں، ﴿حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ﴾ میں فجر کی نماز ہے، ﴿عَشِيًّا﴾ میں عصر کی نماز ہے اور ﴿حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ﴾ میں ظہر کی نماز ہے۔

اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿حِيْنَ تُمْسُوْنَ﴾ میں مغرب ہے، ﴿حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ﴾ میں صبح ہے، ﴿عَشِيًّا﴾ میں عصر ہے اور ﴿حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ﴾ میں ظہر ہے۔ باقی نماز عشاء رہ جاتی ہے تو اس کے لیے قرآن کریم میں ایک مقام پر ہے ﴿ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ﴾ کہ تین مقامات ایسے ہیں جس میں تمہیں بطور خاص پردے کا خیال رکھنا چاہیے، ان میں ایک وقت ﴿مِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ﴾[111] ہے، اس میں عشاء کی نماز کا صراحتاً تذکرہ موجود ہے۔ اس لیے چار نمازوں کا تذکرہ یہاں پر ہے اور پانچویں نماز کا ذکر وہاں پر ہے۔ اس طرح یہ پانچ نمازیں بنتی ہیں۔

ایک عجیب نکتہ:

ہاں ایک بات یہ سمجھیں کہ ﴿تُمْسُوْنَ﴾ کو ﴿تُصْبِحُوْنَ﴾ پر مقدم کیا ہے یعنی شام کا ذکر پہلے کیا ہے اور صبح کا ذکر بعد میں کیا ہے حالانکہ عام طور پر صبح پہلے ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کا آغاز شام سے ہوتا ہے صبح سے نہیں ہوتا، اسلامی تاریخ کی یکم غروبِ شمس کے بعد ہوتی ہے طلوعِ صبح کے بعد نہیں ہوتی، اس لیے شام پہلے ہے اور صبح بعد میں۔ اسی طرح ﴿وَ عَشِيًّا وَّ حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ﴾ میں

111۔ النور 58:24

یہاں عصر کا وقت پہلے ذکر کیا اور ظہر کا بعد میں، اس کی وجہ یہ ہے کہ عصر کا وقت تجارت کے لیے بنسبت ظہر کے زیادہ مشغولیت و مصروفیت کا ہوتا ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کا ذکر پہلے کیا ہے۔

قدرتِ حق کی نشانیاں:

﴿وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّ رَحْمَۃً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی پانچ نشانیاں بیان فرمائی ہیں۔ ان میں دوسری نشانی یہ بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے تمہاری بیویاں پیدا فرمائی ہیں۔ ”تم میں سے“ سے مراد یہ ہے کہ تمہاری جنس انسان ہی سے پیدا فرمائی ہیں۔ اللہ کی کمال قدرت ہے کہ خوراک ایک ہے، مٹی ایک ہے، مادہ ایک ہے لیکن پیدا ہونے والے بچوں میں یہ دونوں قسمیں پیدا فرمادی ہیں۔ پھر اللہ رب العزت نے دونوں کے جسم اور اعضاء الگ الگ پیدا فرمادیے ہیں، دونوں کے تقاضے الگ بنا دیے ہیں۔ یہ اللہ کی قدرت کی نشانی ہے۔ ایک ہی پانی سے مرد پیدا ہو رہا ہے اور اسی سے عورت پیدا ہو رہی ہے۔ مرد کے جسم کے تقاضے بالکل الگ رکھے ہیں اور عورت کے جسم کے تقاضے بالکل الگ رکھے ہیں، اور عورت کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ ﴿لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا﴾ تاکہ مرد کو اس سے راحت ملے۔ ﴿وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّ رَحْمَۃً﴾ اور اللہ رب العزت نے تم دونوں کے درمیان مودت یعنی پیار کو رکھا ہے، اور رحمت یعنی شفقت کو رکھا ہے۔

محبت اور مودت:

﴿وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّ رَحْمَۃً﴾

اب دیکھیں کہ دو بندے ایک کمرے میں رہتے ہوں، ان دونوں کے درمیان قلبی محبت نہ ہو، وہ ایک دوسرے کا کام بھی کریں گے لیکن سکون پھر بھی نہیں ہو گا۔ اب ان دونوں میں سکون کیسے ہو گا؟ تو فرمایا کہ ہم نے خاوند اور بیوی میں باہمی سکون پیدا کرنے کے لیے ان میں محبت پیدا فرمائی ہے۔ اور ﴿مَّوَدَّةً﴾ کو پہلے ذکر کیا اور ﴿رَحْمَةً﴾ کو بعد میں ذکر کیا۔ مودت کہتے ہیں محبت کو اور رحمت کہتے ہیں ہمدردی اور شفقت کو۔ اس لیے کہ مودت کا تعلق جوانی کے ساتھ ہے اور رحمت کا تعلق بڑھاپے کے ساتھ ہے، جب انسان عالمِ شباب میں ہو تو اس کے مزاج میں محبت اور پیار غالب ہوتا ہے اور جب انسان عالم شباب سے بڑھاپے کی طرف جائے تو پھر محبت کے جذبات کم ہو جاتے ہیں پھر شفقت اور ہمدری کے جذبات زیادہ ہو جاتے ہیں، اس لیے جوانی میں ایک دوسرے سے پیار کریں گے اور بڑھاپے میں ایک دوسرے کا بطور ہمدری اور شفقت کے خیال رکھیں گے۔ اللہ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

فطرت سے کیا مراد ہے؟

﴿فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡهَا ؕ لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ﴾

یہاں "اِتَّبِعۡ" فعل محذوف ہے یعنی "اِتَّبِعۡ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡهَا" کہ اللہ تعالیٰ نے جس فطرت پر انسان کو پیدا فرمایا ہے اس کی اتباع کرو اور اللہ نے جو فیصلہ فرمایا جو فطرت پیدا کی ہے اس کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ یہاں "فطرت" سے کیا مراد ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ فطرت سے مراد فطرتِ اسلام ہے۔ یہ معنی لیں تو اس پر کئی اعتراضات ہیں۔ ایک اعتراض یہ ہے کہ اگر فطرت سے مراد فطرتِ اسلام ہے تو یہ تو بدلتی ہے کہ بندہ کبھی کافر بھی ہو جاتا ہے حالانکہ ﴿لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ﴾ اللہ جس فطرت پر پیدا فرمائیں تو اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

اس پر اور بھی بہت سارے سوالات ہوتے ہیں لیکن میں نے پہلے آپ سے گزارش کی ہے کہ میں دروس القرآن میں لمبی باتیں کرنے کے بجائے فیصلہ کن بات کرتا ہوں، کئی اقوال نقل کرنے کے بجائے قولِ راجح پیش کرتا ہوں اور لمبی بحثوں کے بجائے صرف وہ بات کرتا ہوں جس کا تعلق قرآن کریم کی تفسیر سے ہو۔

اس لیے راجح قول یہ معلوم ہوتا ہے کہ فطرت سے مراد ہے کہ اللہ نے ہر بندے میں حق قبول کرنے کی استعداد اور صلاحیت رکھی ہے اور اس کو دنیا کا کوئی شخص تبدیل نہیں کر سکتا۔ یہ تو ہے کہ بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہو "فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ"[112] اور اس کے والدین اس کو یہودی بنا دیں یا عیسائی بنا دیں لیکن حق کو قبول کرنے کی استعداد پھر بھی ختم نہیں ہوتی وہ تو موت تک رہتی ہے۔ تو اللہ رب العزت نے انسان کی طبیعت میں یہ استعداد پیدا فرمائی ہے۔ اگر موانع اور رکاوٹیں اسلام لانے کے راستے میں نہ ہوں تو ہر بندہ مؤمن بن جائے گا، ماحول انسان کو اسلام لانے سے روک دیتا ہے، والدین روک دیتے ہیں، بسا اوقات ذاتی اغراض روک دیتی ہیں لیکن اللہ رب العزت نے انسان کی طبیعت میں جو قبول اسلام کی استعداد رکھی ہے وہ استعداد کبھی بھی ختم نہیں ہوتی۔

انسانی اعمال کا اثر:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۱﴾﴾

انسانوں نے جو اعمال کیے جو اپنے ہاتھوں کمایا اس کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے کیے ہوئے کاموں کا کچھ مزا چکھائے،

112۔ صحیح البخاری، رقم:1358

شاید یہ لوگ باز آجائیں اور خدا کی طرف رجوع کریں۔

نیکوکار لوگوں پر تکلیف کی وجہ:

بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ دنیا میں جو بھی تکلیف جو بھی مصیبت اور جو بھی طوفان آتا ہے اگر اس کی وجہ انسانی اعمال ہیں تو پیغمبر پر تکلیف آتی ہے، ولی پر تکلیف آتی ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی آفتیں پہنچتی ہیں تو کیا۔العیاذ باللہ۔ان کو بھی تکلیفیں ان کے اعمال کی وجہ سے پہنچتی ہیں؟ تو بظاہر اس آیت پر یہ اشکال ہوتا ہے۔

اب اس کا جواب سمجھیں۔ ایک ہے فساد کی علتِ تامہ اور ایک ہے فساد کا سبب۔ علتِ تامہ کا مطلب یہ ہے کہ صرف اور صرف یہی وجہ ہے اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں اسے علت تامہ کہتے ہیں۔ تو اس دنیا میں مصائب کی علتِ تامہ یہ انسان کے اعمال نہیں ہیں کہ دنیا میں جو بھی مصیبت آتی ہے انسان کے عمل کی وجہ سے آتی ہے، جو بھی خوشی ہوتی ہے تو نیک عمل کی وجہ سے ہوتی ہے، چنانچہ "بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ" میں "ب" علت کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ "ب" سببیت کے لیے ہے یعنی دنیا میں انسان پر جو مصیبت اور تکلیف آتی ہے اس کا ایک سبب انسان کا عمل ہوتا ہے۔ تو یہ ہو سکتا ہے کہ تکلیف آئے اور اس کا سبب انسان کا اپنا عمل نہ ہو بلکہ اس کا سبب کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ انسان برا عمل کرے اور اس کے بدلے میں اس پر تکلیف نہ آئے۔ تو دونوں چیزیں ممکن ہیں۔

اب دنیا میں جو آفات آتی ہیں ان کا ایک ہوتا ہے سببِ ظاہری اور ایک ہوتا ہے سببِ باطنی۔ ظاہری اسباب کو اسبابِ طبعیہ اور اسبابِ مادیہ بھی کہتے ہیں۔ مثلاً آگ ہے اس کی طبیعت میں ہے کہ یہ جلاتی ہے، پانی ہے اس کی طبیعت میں ہے کہ یہ غرق کرتا ہے، ہوا ہے اس کی طبیعت میں ہے کہ یہ دھکیلتی ہے، یہ سب طبعی اور مادی اسباب ہیں، اور بعض اسباب باطنی ہوتے ہیں یعنی اس کا تعلق انسان کے عقائد اور اعمال سے

ہوتا ہے۔ کبھی دونوں سبب جمع ہوتے ہیں تو نتیجہ اس کے مطابق نکلتا ہے، کبھی ایک سبب ہوتا ہے اور دوسرا نہیں ہوتا تو نتیجہ کبھی سببِ طبعی کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی سببِ باطنی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

مثال سمجھیں کہ ایک شخص بس پر جا رہا ہے اور آگے دوسری بس آئی اور ایکسیڈنٹ ہو گیا اور یہ جانے والا شخص کافر ہے یا علانیہ فاسق ہے۔ جب بس بس سے ٹکرائے گی تو تباہی ہو گی تو یہ طبعیت ہے اور یہ شخص ہے بھی مجرم۔ اب یہاں پر سببِ طبعی و مادی بھی موجود ہے اور سببِ باطنی بھی موجود ہے تو تباہی ہو گئی ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک سبب ہوتا ہے اور دوسرا نہیں ہوتا یا دونوں نہیں ہوتے۔ مثلاً ایک شخص بس پر لاہور سے سرگودھا آرہا ہے۔ بس بس سے ٹکرائی بھی نہیں اور یہ بندہ بھی نیک ہے۔ تو جب نہ ٹکرائے تو تباہ بھی نہیں ہونا چاہیے اور نیکی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مصیبت نہ آئے۔ اب یہاں دونوں سبب اچھے موجود ہیں تو نتیجہ اچھا ہے اور وہاں دونوں سبب برے تھے تو نتیجہ بھی برا تھا۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ گاڑی گاڑی سے ٹکراتی ہے اور بندہ نیک ہوتا ہے۔ اب یہاں پر سببِ طبعی موجود ہے تباہی کا لیکن سببِ باطنی یعنی بد عملی موجود نہیں ہے، اب اگر گاڑی تباہ ہو جاتی ہے تو یہ سببِ طبعی کی وجہ سے ہوئی ہے، سببِ باطنی موجود نہیں ہے اور کبھی گاڑی گاڑی سے ٹکراتی ہے گاڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور بندہ پھر بھی ٹھیک ہوتا ہے، اب اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی نیک تھا، نیکی کی وجہ سے خدا نے اس کو بچا لیا ہے، اب اس کا سببِ باطنی کام آ گیا ہے۔ اس طرح اسباب میں تفاوت بھی ہوتا ہے اور کبھی سبب جمع بھی ہوتا ہے کہ دونوں چیزیں اکٹھی ہوتی ہیں۔

تو میں عرض یہ کر رہا ہوں کہ کبھی کوئی پریشانی اور مصیبت آتی ہے تو اس کی وجہ صرف اعمالِ بد نہیں ہوتے بلکہ کبھی اعمالِ بد سبب بنتے ہیں اور کبھی نہیں بنتے۔

﴿بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ میں یہ جو کسبِ اعمال ہے یہ سبب ہے، یہ علتِ تامہ نہیں ہے۔ اس لیے جب بھی کسی شخص پر کوئی مصیبت دیکھیں تو یہ فتویٰ نہ لگایا کریں کہ اس نے کوئی گناہ کیا ہو گا! آپ کسی مدرسے کے شیخ الحدیث کو دیکھیں۔ اس کی موت کا وقت ہے اور شدید تکلیف میں ہے تو آپ کبھی فتویٰ نہ لگائیں کہ یہ حرام مال کھاتا ہو گا! موت میں کسی کا ایکسیڈنٹ ہو جائے تو کبھی نہ کہنا کہ یہ طلبہ پر ظلم کرتا ہو گا تبھی تو اس کے ساتھ ایسا ہوا ہے!

جب یہ ساری بات سامنے ہو گی تو آپ کبھی بھی کسی بندے پر فتویٰ نہیں لگائیں گے۔ میری گزارش سمجھ آ رہی ہے نا؟ (جی ہاں۔ سامعین) میں بار بار ایک بات کہتا ہوں کہ دین کو سمجھیں! دین کو سمجھیں! حدیث پاک میں ہے:

مَنْ يُرِدِ اللهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ.[113]

کہ اللہ پاک جب کسی کے ساتھ بھلائی کا فیصلہ فرمائیں تو اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں۔ تو اگر دنیا میں آفت کی علتِ تامہ؛ اعمالِ بد ہوتے تو پھر یہ بات ٹھیک تھی جبکہ دنیا میں آفت کی علتِ تامہ یہ انسان کے اعمال نہیں ہیں بلکہ یہ سبب ہیں، کبھی تکلیف برے عمل کی وجہ سے ہوتی ہے اور کبھی تکلیف اور آفت تو ہوتی ہے لیکن اس کی وجہ برا عمل نہیں ہوتا۔

مصائب آفت ہیں یا آزمائش؟ پرکھنے کا طریقہ:

اب یہ جو دنیا میں آفت اور تکلیف آتی ہے اس کی علامت کیا ہے کہ یہ اعمالِ بد کی وجہ سے ہے یا اعمالِ بد کی وجہ سے نہیں ہے؟ اس کی علامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لکھی ہے کہ اگر بندے کے ظاہر پر آفت اور تکلیف

113۔ صحیح البخاری، رقم:71

آجائے اور اس کا دل مطمئن ہو کہ میرے اللہ کی طرف سے ہے، میرا اللہ اسی پر راضی ہے، اللہ اس سے میرے گناہ معاف کر دے گا تو سمجھو کہ یہ بد اعمالی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ بندے کا امتحان ہے، اللہ اس کے درجات بلند فرمانا چاہتے ہیں، اس کو اپنا قرب دینا چاہتے ہیں اور اگر کسی بندے پر تکلیف اور آفت آئے اور بندہ ایسے پریشان ہو جیسے عذاب آگیا تو سمجھ لو کہ یہ اس کے اعمالِ بد کی وجہ سے ہے، یہ امتحان اور ابتلاء نہیں ہے۔ آپ نیکی کا کام کریں ہو سکتا ہے کہ پرچہ کٹ جائے، آپ دین کا کام کریں ہو سکتا ہے کہ جیل آجائے۔ اگر آپ اس پر رو رہے ہیں، چیخ رہے ہیں جیسے عذاب آگیا ہے تو سمجھ لیں کہ عملِ بد کی وجہ سے پرچہ کٹا ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ایک علامت بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر بندے پر آفت اور تکلیف آئے اور اس کی وجہ سے رجوع الی اللہ نصیب ہو جائے تو سمجھو یہ امتحان ہے اور اگر آفت اور تکلیف آئے اور رجوع الی اللہ نصیب نہ ہو اور بندہ مزید گناہ کرے تو سمجھو کہ یہ اعمالِ بد کی وجہ سے دنیا میں عذاب آگیا ہے، اور آج کے دور میں اس کو پرکھنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ اللہ نہ کرے ایک بندہ ہے اس کو دنیا میں تکلیف آتی ہے، ہسپتال میں داخل ہوتا ہے لیکن وہاں نرسوں کو تاڑتا ہے، ہسپتال میں داخل ہوا ہے اور موبائل پر فلمیں دیکھ رہا ہے اپنی بیماری کا وقت گزارنے کے لیے تو اب اس کا معنی یہ ہے کہ یہ بندہ خدا کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اب میں بھی سمجھ سکتا ہوں اور آپ بھی سمجھ سکتے ہیں مثلاً ہم میں سے کسی کو بخار ہو جائے، میں پڑھاتا ہوں تو میں چھٹی کر لوں، آپ پڑھتے ہیں تو آپ چھٹی کر لیں لیکن جب موقع ملے تو فلمیں دیکھیں، ڈرامے دیکھیں، گانے سنیں تو مجھے بھی سمجھ لینا چاہیے کہ مجھ پر خدا کا عذاب ہے اور آپ کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ آپ پر خدا کا عذاب ہے، یہ کوئی امتحان نہیں ہے۔ اگر سننا ہی تھا تو تلاوت لگا دیتے، نعت لگا دیتے، کوئی بیان سن لیتے!

اللہ ہم سب کو یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

﴿فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۲﴾﴾

اس کی تفسیر اور مضامین سورت النمل میں تفصیل کے ساتھ گزر چکے ہیں، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

روزِ قیامت مجرموں کا جھوٹ بولنا:

﴿وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾﴾

جب قیامت کا دن ہو گا تو مجرم لوگ قسمیں کھا کر کہیں گے ہم تو دنیا میں بہت تھوڑی دیر ٹھہرے تھے یا یہ کہیں گے کہ ہم لوگ قبر میں بہت تھوڑا سا ٹھہر کر آئے ہیں۔

اب بظاہر معلوم ہو رہا ہے کہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں اور قیامت کے دن تو کوئی شخص جھوٹ نہیں بول سکے گا تو پھر یہ جھوٹ کیسے بول رہے ہیں؟ بات سمجھیں کہ یہ لوگ جو جھوٹ بولیں گے تو یہ شروع شروع میں ہو گا۔ اللہ کی عدالت قائم ہو گی تو ہر ایک کو آزادی ہو گی کہ جو چاہے بیان کرے کیونکہ اللہ کو تو حقیقتِ حال معلوم ہو گی نا! اب مشرک لوگ یہ کہیں گے: ﴿مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾﴾[114] کہ ہم تو شرک کرتے ہی نہیں تھے۔ ابتداءً ہر بندے کو اختیار ہو گا کہ جو چاہے بولے۔ اللہ تعالی کے علم میں سب کچھ ہے، اللہ تعالی کو کسی گواہ کی ضرورت نہیں ہے۔ جب یہ لوگ زبان سے جھوٹ بولیں گے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

114۔ الانعام 23:6

﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ﴾[115]

کہ آج کے دن ہم ان کی زبان پر مہر لگا دیں گے، ان کی زبان چپ ہو جائے گی اور ان کے بدن کے دیگر اعضاء ہاتھ، پاؤں وغیرہ بول پڑیں گے۔ تو بندہ شرمندہ ہو گا اور اس کا جھوٹ کھل کر سامنے آجائے گا۔ تو یہ جو ہے کہ قیامت کے دن کوئی شخص جھوٹ نہیں بول سکے گا اس کا تعلق ابتدا سے نہیں بلکہ اس کا تعلق انتہا کے ساتھ ہے، ان کے خلاف گواہی ان کے اعضاء دیں گے تو پھر یہ جھوٹ کیسے بولیں گے؟ لہٰذا ان میں تناقض نہیں ہے۔ تناقض کے لیے آٹھ شرطیں ہوتی ہیں اور یہاں زمانہ بدل گیا ہے اس لیے تناقض نہیں رہے گا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

115۔ یٰسین 65:36

سورۃ لقمٰن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿الٓـمّٓ ۚ﴿۱﴾ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡحَکِیۡمِ ۙ﴿۲﴾ ھُدًی وَّ رَحۡمَۃً لِّلۡمُحۡسِنِیۡنَ ۙ﴿۳﴾﴾

ابتدائی آیات کا شانِ نزول:

﴿الٓـمّٓ﴾ یہ حروف مقطعات میں سے ہے، اس پر بات پہلے ہو چکی ہے۔

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡتَرِیۡ لَھۡوَ الۡحَدِیۡثِ لِیُضِلَّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ٭ۖ وَّ یَتَّخِذَھَا ھُزُوًا ؕ اُولٰٓئِکَ لَھُمۡ عَذَابٌ مُّھِیۡنٌ ﴿۶﴾﴾

نضر بن حارث یہ مشرک تھا اور تجارت کے لیے مختلف ملکوں کا سفر کیا کرتا تھا۔ ایک بار یہ ایران گیا کسریٰ کے ہاں تو وہاں سے پرانے بادشاہ جو ایران کے گزرے ہیں ان کے قصوں اور کہانیوں پر مشتمل کتابیں خرید کر لایا۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ وہاں سے ایک گانا گانے والی کنیز بھی خرید کر لایا۔ اس نے مکہ مکرمہ میں آکر اہلِ مکہ کو جمع کیا اور کہا کہ محمد –صلی اللہ علیہ وسلم– تمہیں پرانے وقت کی کہانیاں سناتا ہے، عاد اور ثمود کے قصے سناتا ہے تو میں تمہیں اس سے بھی زیادہ مزیدار کہانیاں سناتا ہوں، تم ان کی نہ باتیں سنو بلکہ میری سنو اور کہتا کہ محمد –صلی اللہ علیہ وسلم– تمہیں قرآن سناتے ہیں اور نماز پڑھنے کا کہتے ہیں، روزے رکھنے کا کہتے ہیں، مشقت کی بات کرتے ہیں، ادھر آؤ اور اس کنیز کا گانا سنو! قرآن سننے میں تمہیں تکلیف ہی تکلیف ہو گی اور

گانا سنو گے تو مزے ہی مزے ہیں، اس لیے تمہیں قرآن سننے کی کیا ضرورت ہے؟! تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا﴾ کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو خدا سے غافل کرنے والی باتوں کو خرید لیتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے لوگوں کو خدا کے راستے سے بھٹکا دیں اور اس کا مذاق اڑائیں، ﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ جو لوگ بھی یہ کھیل تماشے کی چیزیں خریدتے ہیں امت کو گمراہ کرنے کے لیے تو ان کے لیے درد ناک عذاب ہے۔

جائز اور ناجائز کھیل:

ہمارے ہاں جو کھیل کود ہوتے ہیں یہاں ان کے بارے میں ایک بات سمجھ لیں کہ ایسا کھیل جس میں دین کا نفع ہو یا ایسا کھیل جس میں دنیا کا نفع ہو مثلاً بدن کو مضبوط کرنا ہو، چاک وچوبند رہنا ہو، اپنی طاقت کو برقرار رکھنا ہو، صحت کو ٹھیک رکھنا ہو تو ایسے کھیل کو شریعت جائز کہتی ہے۔ لیکن ایسا کھیل جس میں دین کا نفع بھی نہ ہو اور دنیا کا نفع بھی نہ ہو تو اس کو شریعت بسا اوقات مکروہ کہتی ہے، بسا اوقات ناجائز کہتی ہے اور بسا اوقات حرام بھی کہتی ہے۔ اس لیے ہر کھیل جائز بھی نہیں ہے اور ہر کھیل ناجائز بھی نہیں ہے۔ بعض کھیل ایسے ہیں جیسے شطرنج تو اس کے بارے میں حدیث میں صراحتاً ممانعت آگئی ہے تو اب یہ دنیا کے لیے ہو یا کسی اور کام کے لیے ہو اسے ناجائز ہی کہنا ہے، اس کے جائز ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

جائز کھیلوں کا احادیث سے ثبوت:

احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ترغیب دی ہے کہ بندے کو کھیلنا چاہیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تھے اور حبشی لوگ مسجد

نبوی کے صحن میں نیزہ بازی کر رہے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ ام المؤمنین امی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پیچھے تھیں تو آپ رضی اللہ عنہا نے اپنا سر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھے مبارک پر رکھا اور کھیل دیکھتی رہیں۔[116]

ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اِلْهُوْا وَالْعَبُوْا" کہ کھیل کود کرتے رہو!،

"فَإِنِّيْ أَكْرَهُ أَنْ يُرَىٰ فِيْ دِيْنِكُمْ غِلْظَةٌ."[117]

کہ مجھے تمہارے دین میں شدت اور خشکی پسند نہیں ہے، اتنی سختی پیدا نہ کرو کہ بندہ کھیلنا بھی چھوڑ دے بلکہ اپنے کھیل کود کو جاری رکھو!

اور ایک حدیث پاک میں ہے:

"رَوِّحُوا الْقُلُوْبَ سَاعَةً بِسَاعَةٍ."[118]

کہ اپنے دل کو کبھی کبھی خوش کر لیا کرو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں احادیث میں ہے کہ بسا اوقات قرآن کریم اور احادیث مبارکہ کے مشاغل اور ان میں مسلسل غور و فکر کرنے سے جب تھک جاتے تو اپنی تھکاوٹ کو دور کرنے کے لیے زمانۂ جاہلیت کے شعر سنا کرتے تھے۔ تو یہ شعر و شاعری گناہ نہیں ہے، یہ غلط نہیں ہے، مقصد اس کا ٹھیک ہو تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ شرط یہ ہے کہ آواز عورت کی نہ ہو، موسیقی اور ساز نہ ہو، اور ایسا بے ریش لڑکا بھی نہ ہو کہ جس کو دیکھ کر بندے کو عورت کی طرح کے خیالات

116۔ صحیح مسلم، رقم:892

117۔ شعب الایمان: ج5 ص247 رقم الحدیث 6542

118۔ مسند الشهاب: ج1 ص393 رقم الحدیث 672

پیدا ہوں اور مضمون بھی گندا نہ ہو جو بندے میں شہوت پیدا کرے۔ تو ان شرائط کے ساتھ آپ شاعری سننا چاہیں تو سننے پر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن ایسا کچھ نہ سنیں کہ جس سے دین کا نقصان ہو اور تباہی ہو۔

خیر میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہر کھیل کو شریعت نہ منع کرتی ہے اور نہ ہی ہر کھیل کی اجازت دیتی ہے۔ ایک حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَيْسَ مِنَ اللَّهْوِ ثَلَاثٌ.

یہ روایت اکثر کتبِ احادیث میں کتاب الجہاد کے تحت موجود ہے کہ لہو ولعب کے کھیلوں سے یہ تین کھیل مستثنیٰ ہیں، ان تین کھیلوں کی اجازت ہے:

نمبر 1: "تَأْدِيبُ الرَّجُلِ فَرَسَهُ" آدمی اپنے گھوڑے کو سدھائے۔ اس میں فائدہ یہ ہے کہ جہاد کے لیے یہ گھوڑا تیار ہو جائے گا۔

نمبر 2: "وَمُلَاعَبَتُهُ أَهْلَهُ" آدمی اپنی بیوی سے کھیلے۔ اس میں مقصد توالد و تناسل کی تکمیل ہے۔

نمبر 3: "وَرَمْيُهُ بِقَوْسِهِ وَنَبْلِهِ" آدمی تیر اندازی کرے۔ یہ بھی جہاد کی تیاری میں داخل ہے۔[119]

تو ہر کھیل کو ناجائز بھی نہیں کہہ سکتے اور ہر کھیل کو جائز بھی نہیں کہہ سکتے۔

آسمانوں کے ستونوں کی تحقیق:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ﴾

119۔ نصب الرایۃ للزیلعی: ج4 ص273 رقم الحدیث: 2513

نحوی لحاظ سے اس آیت کی دو ترکیبیں ہو سکتی ہیں:

ایک تو یہ کہ "تَرَوْنَهَا" یہ "عَمَدٍ" کی صفت ہے اور "ھا" ضمیر کا مرجع "عَمَدٍ" ہے۔ اب اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ نے آسمانوں کو پیدا فرمایا ہے ایسے ستونوں کے بغیر جو تمہیں نظر آ سکیں۔ یعنی اگر ستون ہوتے تو تمہیں نظر آ جاتے جب تمہیں نظر نہیں آتے تو معلوم ہوا کہ ستون نہیں ہیں اور یہ آسمان بغیر ستون کے محض اللہ کی قدرت کے سہارے قائم ہیں۔

دوسری ترکیب یہ ہے کہ "تَرَوْنَهَا" کی ضمیر کا مرجع "السَّمٰوٰتِ" ہیں۔ اب اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے پیدا فرمایا ہے جیسا کہ تم انہیں دیکھ رہے ہو، مطلب یہ کہ آسمان بغیر ستون کے بنایا گیا ہے۔ بعض حضرات نے پہلی ترکیب کے مطابق کہ "تَرَوْنَهَا" کو "عَمَدٍ" کی صفت بنایا جائے اس کا ایک معنی یہ بھی کیا ہے کہ اللہ نے آسمانوں کو پیدا فرمایا ہے ایسے ستونوں کے بغیر جن کو تم دیکھتے ہو یعنی آسمانوں کے ستون تو ہیں لیکن تمہیں نظر نہیں آتے۔

بہر حال یہ دونوں معانی درست ہیں کہ آسمان کے ستون ہیں یا یہ کہ آسمان بغیر ستون کے بنا ہوا ہے۔

حضرت لقمان نبی تھے یا ولی؟ راجح قول:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَ مَنْ یَّشْكُرْ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ﴿۱۲﴾﴾

حضرت لقمان علیہ السلام نبی تھے یا ولی تھے؟ راجح قول یہ ہے کہ حضرت لقمان ولی تھے نبی نہیں تھے اور بعض روایات میں ہے کہ لقمان علیہ السلام کو اللہ پاک نے اختیار دیا تھا کہ تم چاہو تو نبوت لے لو اور چاہو تو حکمت لے لو۔ انہوں نے کہا کہ

اے اللہ! نبوت بڑی ذمہ داری ہے، آپ مجھے حکمت دے دیں۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نے حکمت کو نبوت پر ترجیح کیوں دی؟ عجیب جواب دیا، فرمایا کہ اگر اللہ مجھ سے پوچھے بغیر مجھے نبوت دے دیتے تو یہ انتخابِ خدا ہوتا تو اللہ خود حفاظت فرماتے اور جب اللہ نے مجھے اختیار دیا ہے، اب نبوت ملتی تو اللہ کا انتخاب نہ ہوتا بلکہ خود میرا ہوتا تو میرے لیے سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا، اس لیے میں نے حکمت کو نبوت پر ترجیح دی۔

اکابر کے کلام سے توافق:

میں نے آپ سے کہا تھا کہ میری عادت ہے کہ میں بہت ساری باتیں اصول کے درجے میں کہتا ہوں اور وہ اصول میں نے کہیں پڑھا نہیں ہوتا ہے لیکن جو مجھے سمجھ آتا ہے کہہ دیتا ہوں۔ پھر جب مجھے اپنے اکابر کی کتابوں سے اس کے حوالے ملنا شروع ہو جاتے ہیں تو خلوت میں میری خوشی کو میں ہی جانتا ہوں اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔

عصمت نبوت پر میں نے کئی بار یہ بات کی -آپ کو یاد ہے- کہ نبی معصوم ہے، اللہ نبی کو گناہ سے بچاتا ہے، یعنی اللہ نبی کو نبوت عطا فرماتا ہے اور گناہوں سے بچاتا ہے، وجہ کہ یہ نبوت انتخابِ نبی نہیں ہوتا بلکہ انتخاب خدا ہوتا ہے، اس لیے پیغمبر پر اعتراض ہو تو پیغمبر دفاع نہیں کرتے بلکہ اللہ خود دفاع کرتے ہیں، جیسے امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی میں نے مثال دی تھی۔ اب اس بات سے مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ حضرت لقمان حکیم نے یہی بات فرمائی جب سوال ہوا کہ آپ نے حکمت کو نبوت پر ترجیح کیوں دی ہے؟ فرمایا کہ اگر اللہ مجھے بغیر میرے اختیار کے خود نبوت دے دیتے تو انتخاب اللہ کا ہوتا اور اللہ خود حفاظت فرماتے چونکہ مجھے انتخاب دیا کہ نبوت لوں یا حکمت لوں تو اگر میں کہتا کہ میں نبوت لیتا ہوں تو اس کا مطلب کہ نبوت انتخاب میرا ہے تو مجھے خود اپنی حفاظت کرنی پڑتی اور یہ بہت مشکل تھا، اس لیے میں نے حکمت کو نبوت پر ترجیح

دی ہے۔ جب ایسے تائیدی جملے ملتے ہیں تو بندے کو بے حد خوشی ہوتی ہے۔

حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحتیں:

لقمان علیہ السلام اللہ کے ولی تھے۔ آپ نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں فرمائی ہیں وہ سن لیں:

نمبر 1: ﴿یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ﴾ کہ بیٹا! شرک نہیں کرنا شرک بہت بڑا گناہ ہے۔ اس نصیحت کا تعلق عقیدے سے ہے۔

نمبر 2: ﴿یٰبُنَیَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ﴾

اے میری بیٹے! اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر بھی ہو، کسی چٹان میں چھپی ہو، آسمانوں میں ہو یا زمین میں کسی جگہ ہو تو اللہ کی ذات ایسی ہے کہ اسے حاضر کر دے گی۔ اس لیے اللہ کے علم کا قائل ہو جانا کہ کوئی چیز بھی اللہ کے علم سے مخفی نہیں ہے۔ اس نصیحت کا تعلق بھی عقیدے سے ہے۔

نمبر 3: ﴿یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ﴾ بیٹا! نماز کی پابندی کرنا۔ اس کا تعلق اصلاحِ عمل سے ہے۔

نمبر 4: ﴿وَ اْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ انْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ بیٹے! نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔ اس کا تعلق اصلاحِ خلق سے ہے۔

نمبر 5: ﴿وَ لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ﴾ سے آخر تک جو نصیحتیں ہیں ان کا تعلق آدابِ معاشرت سے ہے۔ اور یہ کل چار نصیحتیں ہیں:

پہلی:... ﴿وَ لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ﴾ لوگوں کے ساتھ ترش روئی کے ساتھ پیش نہ آنا!

دوسری:...﴿وَلَا تَمۡشِ فِی الۡاَرۡضِ مَرَحًا﴾ زمین میں اکڑ کر نہ چلنا۔

تیسری:...﴿وَاقۡصِدۡ فِیۡ مَشۡیِكَ﴾ میانہ روی کے ساتھ چلنا۔

چوتھی:...﴿وَاغۡضُضۡ مِنۡ صَوۡتِكَ﴾ اپنی آواز کو پست رکھنا۔ پست کا معنی کہ اتنی آہستہ آواز بھی نہ ہو کہ لوگ سن نہ سکیں اور بہت اونچی بھی نہ ہو بلکہ درمیانی آواز ہو۔ بلند آواز اس لیے نہ ہو کہ ﴿اِنَّ اَنۡكَرَ الۡاَصۡوَاتِ لَصَوۡتُ الۡحَمِیۡرِ﴾ سب سے ناپسندیدہ آواز گدھے کی آواز ہے۔ اس لیے چیخ چلا کر بولنا یہ مناسب نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کلمات لامتناہی ہیں:

﴿وَلَوۡ اَنَّ مَا فِی الۡاَرۡضِ مِنۡ شَجَرَةٍ اَقۡلَامٌ وَّ الۡبَحۡرُ یَمُدُّهٗ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ سَبۡعَةُ اَبۡحُرٍ مَّا نَفِدَتۡ كَلِمٰتُ اللّٰهِ﴾

زمین میں جتنے درخت ہیں ان کی قلمیں بن جائیں اور جو سمندر ہے اس کے ساتھ سات سمندر اور بھی مل جائیں اور اللہ کے کلمات لکھنا شروع کر دیں تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوں گے۔

زمین میں جتنے درخت ہیں ان کی قلمیں بنادی جائیں کا معنی یہ نہیں ہے کہ ایک درخت کی ایک قلم ہو بلکہ معنی یہ ہے کہ اس کی شاخوں کی قلمیں بنائی جائیں اور سات سمندروں کو سیاہی بنایا جائے اور پھر کوئی بندہ اللہ کی صفات لکھنا چاہے تو بھی اس کے اختیار اور بس میں نہیں ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے علماء کے ایک سوال کے جواب میں نازل ہوئی۔ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَمَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا

قَلِيۡلًا﴿۸۵﴾[120] کہ تمہیں بہت تھوڑا علم ملا ہے۔ علمائے یہود نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اس آیت کا مصداق آپ کی قوم ہے یا ہم بھی ہیں؟ فرمایا کہ سب اس کا مصداق ہیں۔ یہودی علماء نے کہا کہ ہم اس کا مصداق نہیں ہو سکتے، کیونکہ "أَنَّا أُوتِينَا التَّوْرَاةَ، وَفِيهَا تِبْيَانُ كُلِّ شَيْءٍ" ہمارے پاس تورات ہے اور تورات میں ہر چیز ہے، تو ہمارے پاس بہت زیادہ علم ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پہلی بات یہ ہے کہ خود تورات تھوڑا سا علم ہے سارا نہیں ہے اور پھر تورات کا بھی تمہارے پاس سارا علم نہیں بلکہ بہت تھوڑا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَ لَوۡ اَنَّ مَا فِی الۡاَرۡضِ مِنۡ شَجَرَۃٍ اَقۡلَامٌ وَّ الۡبَحۡرُ یَمُدُّہٗ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ سَبۡعَۃُ اَبۡحُرٍ مَّا نَفِدَتۡ کَلِمٰتُ اللّٰہِ﴾ کہ اللہ کی صفات کوئی شخص لکھنا چاہے تو سات سمندر بھی نہیں لکھ سکتے تو تمہارے پاس اس کے مقابلے میں کیا علم ہے؟! بہت تھوڑا سا علم ہے! اس لیے اس پر تمہیں اکڑنا نہیں چاہیے۔[121]

والد اپنی اولاد کے کام آئے گا یا نہیں؟ (تعارض کا حل)

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ وَ اخۡشَوۡا یَوۡمًا لَّا یَجۡزِیۡ وَالِدٌ عَنۡ وَّلَدِہٖ ۫ وَ لَا مَوۡلُوۡدٌ هُوَ جَازٍ عَنۡ وَّالِدِہٖ شَیۡـًٔا﴾

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرتے رہو اور اس دن سے ڈرو جس دن باپ اپنی اولاد کے کام نہیں آئے گا اور نہ اولاد اپنے باپ کے کام آئے گی۔ مراد اس سے قیامت کا دن ہے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے یہ ہو کر رہے گا۔

120۔ الاسراء 85:17

121۔ تفسیر ابن کثیر: ج4 ص178

یہاں بظاہر اشتباہ یہ پیدا ہو رہا ہے کہ سورۃ الطور میں ہے:

﴿وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ اتَّبَعَتۡهُمۡ ذُرِّیَّتُهُمۡ بِاِیۡمَانٍ اَلۡحَقۡنَا بِهِمۡ ذُرِّیَّتَهُمۡ وَ مَاۤ اَلَتۡنٰهُمۡ مِّنۡ عَمَلِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ﴾[122]

کہ جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد ان کے نقش قدم پر چلی ایمان کے ساتھ یعنی اولاد بھی مؤمن ہوئی تو ہم ان کی اولاد کو ان کی وجہ سے ان کے مقامات کے ساتھ ملا دیں گے اور ہم والدین کے اعمال میں کمی بھی نہیں کریں گے۔

تو سورۃ الطور سے معلوم ہوتا ہے کہ والد بھی مؤمن ہو اور اولاد بھی مؤمن ہو تو اللہ اولاد کو والدین کے اونچے مقام تک پہنچا دیں گے۔ تو والد تو کام آئے گا۔

اسی طرح سورۃ الرعد میں ہے:

﴿جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَهَا وَ مَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَ اَزۡوَاجِهِمۡ وَ ذُرِّیّٰتِهِمۡ﴾[123]

ہمیشہ رہنے والے باغات میں یہ لوگ خود بھی داخل ہوں گے اور جو ان کے نیک آباءواجداد ہیں وہ بھی ان میں آئیں گے اور جو بیویاں نیک ہیں وہ بھی آجائیں گی اور جو نیک اولادیں ہیں وہ بھی آئیں گی۔ نیکی کی وجہ سے ان کو بھی یہ محل ملیں گے۔ تو اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن یہ رشتے کام آئیں گے۔

جبکہ یہاں سورۃ لقمٰن کی اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ والد کام نہیں آئے گا۔

اب یہاں جواب سمجھیں! قرآن کریم میں یہاں جو ہے کہ باپ بیٹے کے کام

122۔ الطور 21:26

123۔ الرعد 23:13

نہیں آئے گا اس سے مراد کافر ہے کہ اگر بیٹا کافر ہو تو باپ اس کے کام نہیں آئے گا، باپ کافر ہو تو بیٹا اس کے کام نہیں آئے گا اور اگر کافر نہ ہو بلکہ مؤمن ہو تو پھر ایک دوسرے کے کام آئیں گے۔ لہٰذا ان ساری آیتوں میں تعارض نہیں ہے۔

ادنیٰ کی نفی سے اعلیٰ کی نفی:

یہاں ﴿وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا﴾ پر دوسری بات سمجھیں کہ "ولد" اور "مولود" میں کیا فرق ہے؟ مولود کہتے ہیں براہ راست بیٹے کو اور ولد بیٹے کو بھی کہتے ہیں اور بیٹے کے بیٹے یعنی پوتے کو بھی کہتے ہیں، اسی طرح اس کے بیٹے یعنی پڑپوتے کو بھی کہتے ہیں۔ تو یہاں اللہ نے ﴿وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ﴾ فرمایا ہے، "وَلَا وَلَدٌ هُوَ جَازٍ" نہیں فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی بیٹا جس کو باپ سے گہرا تعلق ہے جب یہ باپ کے کام نہیں آئے گا تو پوتا اور پڑپوتا جن کا باپ سے تعلق کم ہوتا ہے وہ تو بدرجہ اولیٰ اس کے کام نہیں آئیں گے۔ تو ﴿وَلَا مَوْلُوْدٌ﴾ کہہ کر "ولد" کی نفی کر دی ہے۔ اگر ولد کی نفی کرتے تو مولود کی نفی سمجھ میں نہیں آنی تھی کیونکہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ پوتا قیامت کے دن دادا کے کام نہیں آئے گا ہو سکتا ہے کہ بیٹا کام آجائے، اسی طرح پڑپوتا کام نہ آئے تو ممکن ہے کہ بیٹا کام آجائے۔ تو بیٹے کی نفی کرنے سے پوتے اور پڑپوتے کی نفی خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے۔

میں نے کہا تھا کہ میں ایک اصول پر چلتا ہوں اور میں یہ اصول اکثر بیان کرتا ہوں اور آج جب میں نے اس آیت کی تفسیر دیکھی تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے کئی بار کہا تھا اعلیٰ کی نفی سے ادنیٰ کی نفی نہیں ہوتی اور ادنیٰ کی نفی سے اعلیٰ کی نفی ہو جاتی ہے۔ ایک حکم ادنیٰ کے لیے ثابت ہو تو وہ اعلیٰ کے لیے بطریق اولیٰ ثابت ہوگا اور اگر اعلیٰ کے لیے حکم ثابت ہو تو وہ ادنیٰ کے لیے ثابت نہیں ہوگا۔

قرآن کریم نے پیغمبر کی حیات کی بات صراحتاً نہیں فرمائی بلکہ شہید کی حیات کی بات کی ہے، کیونکہ اگر نبی کی حیات بتاتے تو شہید کی حیات سمجھ میں نہیں آنی تھی، شہید کی حیات بتائی ہے تو پیغمبر کی حیات سمجھ میں آئی ہے۔

پانچ چیزوں کا علم:

﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ ۚ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ﴿۳۴﴾﴾

یہ جو پانچ چیزیں ہیں ان پانچ چیزوں کے علم کو "مفاتح الغیب" کہتے ہیں۔ یہ غیب کی پانچ کنجیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہی پانچ کو ذکر کیوں کیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگ ان پانچ چیزوں کے بارے میں ہی بات کرتے ہیں، نجومیوں سے انہی کے بارے میں پوچھتے ہیں، اندازے انہی کے بارے میں لگاتے ہیں تو اس لیے اللہ نے انہی پانچ کو ذکر فرمایا۔ وہ پانچ چیزیں کون سی ہیں؟

1: قیامت کا علم اللہ کے پاس ہے۔

2: بارش کب ہو گی؟ اس کا علم بھی اللہ کے پاس ہے۔

3: ماداؤں کے پیٹ میں کیا ہے؟ اس کا علم بھی اللہ کے پاس ہے۔

4: انسان کیا کمائے گا؟ اس کا علم بھی اللہ کے پاس ہے۔

5: انسان کہاں مرے گا؟ اس کا علم بھی اللہ کے پاس ہے۔

تبدیلی اسلوب سے معانی پر اثر:

اب ذرا دیکھیں کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ ۚ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ﴾ ان تینوں کو الگ الگ انداز میں بیان کیا ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ

﴿عِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ﴾ یہ جملہ اسمیہ لائے ہیں، ﴿وَ يُنَزِّلُ الۡغَيۡثَ﴾ یہ جملہ فعلیہ لائے ہیں اور ﴿وَ يَعۡلَمُ مَا فِي الۡاَرۡحَامِ﴾ یہ بھی جملہ فعلیہ ہے۔ تو پہلا جملہ اسمیہ اور باقی دو جملے فعلیہ ہیں۔ جملہ اسمیہ کیوں لائے! اس لیے کہ قیامت کا دن متعین ہے، قیامت بار بار نہیں آنی، اس میں تجدد نہیں ہے اور بارش بار بار ہونی ہے اور ماں کے پیٹ میں اولاد نے بار بار پیدا ہونا ہے، بارش میں اور ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بچے میں تجدد ہے اس لیے یہاں جملہ فعلیہ لائے اور جملہ فعلیہ میں تجدد ہوتا ہے۔

اچھا پھر دیکھیں کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ﴾ میں علم کی بات کی ہے، ﴿وَ يُنَزِّلُ الۡغَيۡثَ﴾ میں علم کی بات نہیں کی بلکہ فرمایا کہ اللہ بارش برساتے ہیں۔ اس پر سوال یہ ہے کہ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ اللہ بارش برساتا ہے بلکہ وہ تو سب جانتے ہیں اللہ برساتا ہے، مسئلہ یہ تھا کہ بارش کب ہوگی اس کا علم کسی کے پاس ہے یا نہیں؟ تو جو مسئلہ زیرِ بحث تھا وہ ذکر نہیں کیا اور جو زیر بحث نہیں تھا وہ ذکر کر دیا۔ جواب یہ ہے کہ اللہ نے یہ طرز اختیار کیا یہ بات سمجھانے کے لیے کہ ایک ہے بارش کا برسانا اور ایک ہے بارش کا علم، تو جس نے برسانا ہے علم اسی کے پاس ہوگا جس نے برسانا نہیں ہے اس کے پاس علم کہاں سے ہوگا؟! آگے فرمایا: ﴿وَ يَعۡلَمُ مَا فِي الۡاَرۡحَامِ﴾ یہاں پر پھر علم کی بات کی ہے کہ اللہ پاک جانتے ہیں جو کچھ رحم میں ہے۔ اب بظاہر اس پر آج کے دور میں اشکال ہوتا ہے کہ عورت کے پیٹ میں بچہ ہوتا ہے تو الٹرا ساؤنڈ کے ذریعہ پتا چل جاتا ہے کہ بیٹا ہے یا بیٹی؟ ہم کہتے ہیں کہ اس کا تعلق صرف بچے کے جسم بننے کے ساتھ نہیں ہے بلکہ جب بچہ ماں کے پیٹ میں بطور نطفہ آیا تھا اس کو بھی ﴿مَا فِي الۡاَرۡحَامِ﴾ کہتے ہیں اور وہ کیا ہوگا؟ یہ اللہ ہی جانتا ہے اس کو کوئی الٹرا ساؤنڈ مشین نہیں بتا سکتی۔

﴿وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾ دیکھیں! پہلے تین جملوں میں اللہ کے علم کا دعویٰ کیا ہے بقیہ کے علم کی نفی نہیں کی اور آخری دو میں بقیہ کے علم کی نفی بھی کر دی ہے، ﴿وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾ یہ کل کیا کمائے گا اس کو کچھ پتا نہیں ہے، ﴿وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ کہاں مرے گا اس کو کچھ پتا نہیں۔ تو پہلے تین میں بقیہ کے علم کی نفی نہیں کی اور آخری دو میں بقیہ کے علم کی نفی کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کل کیا کمانا ہے اس کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے، انسان نے کہاں مرنا ہے اس کا تعلق انسان کی اپنی ذات کے ساتھ ہے اور پہلی تین چیزیں کہ قیامت کب آنی ہے؟ اس کا تعلق کسی ذات کے ساتھ نہیں ہے، بارش کب برسنی ہے؟ اس کا تعلق انسان کی ذات کے ساتھ نہیں ہے، کسی عورت کے پیٹ میں کیا ہے؟ اس کا تعلق انسان کی ذات سے نہیں۔ اللہ پاک بات سمجھا رہے ہیں کہ وہ دو چیزیں جس کا تعلق انسان کی ذات سے ہے جب انسان ان کو نہیں جانتا تو جن چیزوں کا تعلق اس کی ذات سے نہ ہو ان کو کیسے جانتا ہو گا؟

میں نے عرض کیا نا کہ وہ جو میں اصول بیان کرتا ہوں مجھے آج دو مثالیں تفسیر میں اور ملی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان دو کی نفی کرنے سے پہلی تین کی نفی خود ہی ہو گئی کیونکہ یہ ادنیٰ ہیں اور پہلی تین اعلیٰ ہیں۔ ادنیٰ کی نفی سے اعلیٰ کی نفی خود بخود ہو جاتی ہے۔ جب انسان اپنی ذات کے متعلق بات نہیں جانتا تو قیامت کو کیسے جانے گا؟ اپنی ذات کے متعلق نہیں جانتا کہ کل کیا کمائے گا تو بارش کو کیسے جانے گا؟ اپنی ذات کے متعلق یہ نہیں جانتا کہ کس جگہ پر مرنا ہے تو کسی اور کے بارے میں کیا جانے گا؟

اچھا یہاں ایک بات اور سمجھیں! ایک ہے مکانِ موت اور ایک ہے زمانِ موت۔ یہاں مکانِ موت کی نفی کی ہے زمانِ موت کی نفی نہیں کی۔ انسان کہاں

مرے گا اس کو نہیں پتا یہ مکانِ موت کی نفی ہے اور کس وقت مرے گا اس کا یہاں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکانِ موت کا آدمی کو کچھ نہ کچھ اندازہ ہوتا ہے لیکن زمانِ موت کا آدمی کو اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک آدمی نے مکان بنایا ہے کہ اب بوڑھا ہو گیا ہوں، بچے اپنے اپنے کام میں لگ گئے ہیں، بس اچھا سا مکان بنالیا ہے تاکہ راحت کے ساتھ زندگی گزاریں۔ اب اس آدمی نے کیا سوچنا ہے کہ میں نے کہاں مرنا ہے؟ نہیں کیونکہ اس کو کچھ اندازہ ہے کہ اسی مکان میں مروں گا تو مکانِ موت کا بندے کو کچھ نہ کچھ اندازہ ہوتا ہے لیکن کب مرنا ہے! اس کا ذرا بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ جب انسان کو مکانِ موت کا پتا نہیں تو زمانِ موت کا کیسے پتا چلے گا؟ زمانِ موت کی نفی کر دیتے تو مکانِ موت کی نفی نہیں ہونی تھی اور مکانِ موت کے علم کی نفی سے زمانِ موت کے علم کی نفی خود بخود ہو جاتی ہے۔

علمِ غیب کی تعریف اور اشکالات کے جوابات:

یہاں ایک اشکال اور اس کا جواب سمجھیں۔ اشکال یہ ہے کہ یہاں فرمایا کہ ان پانچ چیزوں کا علم اللہ کے پاس ہے، اس سے تو معلوم ہوا کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کے پاس ان کا علم نہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر معجزۃً بتا دیتے ہیں تو ان میں سے بعض چیزوں کا علم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی ہوتا ہے، کبھی ان کا علم بذریعہ الہام ولی کے پاس بھی ہوتا ہے اور بسا اوقات ایک بات نجومی کہتا ہے اور کبھی اس کی بات ٹھیک ہوتی ہے اور کبھی وہ غلط ہوتی ہے اور بارش کے بارے میں ماہرین موسمیات بتا دیتے ہیں کہ فلاں دن بارش ہو گی اور وہ اسی وقت ہوتی بھی ہے۔ اس سے تو پتا چلا کہ اللہ کے علاوہ ان کے پاس بھی بعض چیزوں کا علم ہوتا ہے۔

یہ اشکالات تب ہوتے ہیں کہ جب بندے کو علمِ غیب کی تعریف اور مفہوم کا پتا نہ ہو، جب علم غیب کا معنی سمجھ میں آجائے تو پھر کبھی بھی اشکالات نہیں ہوں

گے۔ علم الغیب کی تعریف کیا ہے:

فَإِنَّ الْغَيْبَ الْمُطْلَقَ فِي الْإِطْلَاقَاتِ الشَّرْعِيَّةِ مَا لَمْ يَقُمْ عَلَيْهِ دَلِيْلٌ وَّلَا إِلٰى دَرْكِهٖ وَسِيْلَةٌ وَّسَبِيْلٌ .[124]

اصطلاحِ شریعت میں غیب اسے کہتے ہیں کہ جس پر کوئی دلیل بھی نہ ہو اور جس تک پہنچنے کا کوئی واسطہ اور وسیلہ بھی نہ ہو۔ جس تک آپ پہنچے ہیں وہ غیب رہا ہی نہیں، اس لیے علم الغیب الگ ہوتا ہے اور انباء الغیب الگ ہوتا ہے۔ علم الغیب اللہ کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہوتا، عالم الغیب صرف اللہ کی ذات ہے اور انباء الغیب؛ اللہ نبیوں کو بذریعہ وحی دیتے ہیں اور ولیوں کو بذریعہ الہام دیتے ہیں اور بسا اوقات کل ہونے والی چیز کو بذریعہ اوزار وآلات کے ماہرین موسمیات معلوم کر لیتے ہیں تو اسے علم الغیب نہیں کہتے ہیں، علم نام ہے یقینیات کا اور آلات کے ذریعہ جو معلوم ہو وہ ظنیات ہیں اور ظنی چیز کو علم کبھی نہیں کہتے۔ اس لیے یہ چیزیں ایک تو علم نہیں ہیں اور اگر علم ہوں بھی تو علم الغیب نہیں ہے کیونکہ غیب وہ ہے جس پر کوئی دلیل اور پہنچنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔ بلاواسطہ علم ہی علم الغیب ہوتا ہے اور نبی کے پاس علم بلاواسطہ نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے بتانے سے ہوتا ہے، اظہار غیب الگ ہے اور اطلاع علی الغیب الگ ہے اور انباء الغیب الگ ہے اور علم الغیب الگ ہے۔ پورے قرآن کریم اور تمام احادیث میں اللہ کی ذات کے علاوہ عالم الغیب اور علم الغیب کا لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا! یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں۔

احکام غیبیہ اور اکوان غیبیہ میں فرق:

اور دوسری بات یہ سمجھ لیں جو غیب سے متعلقہ چیزیں ہیں وہ دو قسم کی ہیں:

124۔ المہند علی المفند: ص88

نمبر1: احکام غیبیہ

نمبر2: اَکوان غیبیہ

احکام غیبیہ سے مراد وہ علوم ہیں جن کا تعلق احکامِ شریعت کے ساتھ ہو جس میں عقائد، مسائل، اخلاق سب شامل ہیں اور اَکوان غیبیہ سے مراد آنے والے حالات کی خبریں ہیں احوال، اخبار وغیرہ۔ جہاں تک تعلق ہے احکام غیبیہ کا وہ تو اللہ اپنے پیغمبر کو دیتے ہیں چونکہ پیغمبر کا منصب ہے کہ اس نے شریعت بتانی ہے اور اکوان غیبیہ کا تعلق نبی اور ولی کے ساتھ نہیں ہے، یہ خاصۂ خداوندی ہے، اللہ جس قدر جتنے حالات بتانا چاہیں بتا دیتے ہیں اور نہ بتانا چاہیں تو نہیں بتاتے۔ اس لیے کلی طور پر اگر احکام غیبیہ یہ کسی نبی کو مل جائیں تو ممکن ہے لیکن اکوان غیبیہ اللہ نہ کسی نبی کو دیتے ہیں اور نہ کسی ولی کو دیتے ہیں۔ اگر ﴿وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ﴾[125] کا معنیٰ کوئی یہ کرے کہ نبی کو سارے احکام غیبیہ ملے ہیں تب بھی نبی عالم الغیب نہیں ہوتا کیونکہ اکوان غیبیہ تو اب بھی اللہ کے پاس ہیں تو آپ نبی کو عالم الغیب کیسے کہیں گے؟ اس لیے کوئی نبی عالم الغیب نہیں ہوتا بلکہ عالم الغیب اللہ کی ذات ہے جس کے پاس احکام غیبیہ بھی ہیں اور اکوان غیبیہ بھی ہیں۔ اللہ ہم سب کو صحیح عقائد و نظریات پر کاربند فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

125۔ النساء 113:3

سورة السجدة

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿الٓـمّٓ ۚ﴿۱﴾ تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ مِنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ؕ﴿۲﴾ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ ۚ بَلۡ هُوَ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اَتٰىهُمۡ مِّنۡ نَّذِيۡرٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ لَعَلَّهُمۡ يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۳﴾﴾

نماز کی تلاوت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پانچ وقت جماعت کا خود اہتمام فرماتے اور یہ سنت ہے۔ کسی ادارے کا سربراہ ہو، کسی جماعت کا سربراہ ہو تو اس کو نماز کی امامت خود کرنی چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک اور سنت طریقہ یہی ہے۔ پھر کون سی نماز میں کون سی تلاوت کرے یہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ عام طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک یہ تھا کہ آپ فجر اور ظہر کی نماز میں سورۃ الحجرات سے لے کر سورۃ البروج تک کی سورتوں میں سے کوئی دو سورتیں، عصر اور عشاء کی نماز میں سورۃ الطارق سے لے کر سورۃ البینہ تک کی سورتوں میں سے کوئی دو اور مغرب میں سورۃ الزلزال سے لے کر سورۃ الناس تک کوئی دو سورتیں تلاوت فرماتے تھے۔ سورۃ الحجرات سے لے کر سورۃ البروج تک کی سورتوں کو طِوال مفصَّل کہتے ہیں اور سورۃ الطارق سے سورۃ البینہ تک اوساط مفصَّل اور سورۃ الزلزال سے

سورۃ الناس تک کی سورتوں کو قِصار مفصَّل کہتے ہیں۔ کئی مرتبہ اس کے علاوہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے مثلاً مغرب کی نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورت المرسلات پڑھی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز پڑھائی تو دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورت ﴿اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا﴾ پڑھی۔ تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اپنے مقتدیوں میں بعض کی رعایت فرماتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز مختصر فرمادیتے جس طرح فجر کی نماز آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھا رہے تھے تو بچے کے رونے کی آواز آئی۔ بعض صحابیات نماز میں شریک تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں تلاوت مختصر فرمادی۔ پہلی رکعت میں ﴿قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ﴾ اور دوسری میں ﴿قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ کی تلاوت فرمادی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چونکہ بچہ رو رہا تھا اور عورت کی توجہ اس طرف تھی اس لیے میں نے نماز کو مختصر کردیا۔

جمعہ کے دن فجر کی نماز کی پہلی رکعت میں سورۃ السجدۃ اور دوسری رکعت میں سورۃ الدھر کا پڑھنا سنت ہے۔ اس کا آپ لوگ بھی اہتمام فرمائیں! مدرسے میں ماحول ہوتا ہے لیکن عام مساجد میں اس کا ماحول نہیں ہوتا۔ اس لیے عام مساجد میں پھر ترغیب دو کہ جمعہ کے دن فجر میں یہ دونوں سورتیں پڑھنا سنت ہے، پھر ایک دو بار اس کی تلاوت کرلیں تو لوگوں کو بات سمجھ آجائے گی۔

استاذ یا شیخ آئے تو امامت اس سے کروائیں!

آپ کبھی کسی علاقے میں امام مقرر ہوں اور آپ کی مسجد میں کوئی استاذ یا کوئی بڑا آجائے تو کوشش کریں کہ جماعت وہ کرائے اور اپنے مقتدیوں کو مسئلہ سمجھائیں کہ جب امام مسافر ہو اور مقتدی مقیم ہوں تو امام دو رکعات کے بعد سلام پھیر دے گا اور مقتدی اپنی بقیہ نماز کھڑے ہو کر پوری کریں گے اور ان دو رکعات میں نہ تو

سورۃ فاتحہ پڑھنی ہے اور نہ ہی کوئی دوسری سورۃ، یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے امام کے پیچھے ہی کھڑے ہیں، اس کو "لاحق" کہتے ہیں۔ مقتدی کی تین قسمیں ہوتی ہیں؛ مُدرِک، مسبوق اور لاحق۔ اس طرح مسئلہ سمجھائیں گے تو کبھی کوئی الجھن نہیں ہو گی، اگر مسئلہ سمجھائے بغیر کسی کو مصلے پر کھڑا کریں گے تو لوگ اعتراض کریں گے اور پھر اپنے مقتدیوں کو یہ سمجھائیں کہ بھائی! ہماری خوش قسمتی ہے، ہماری نیک بختی ہے کہ آج ہماری مسجد میں ہمارے بڑے تشریف لائے ہیں اس لیے آج نماز وہ پڑھائیں گے۔ پھر جب آپ کے وہ استاذ یا شیخ چلے جائیں تو جانے کے بعد اگلے دن یہ بات پھر سمجھائیں، اس کا ماحول بنائیں کہ کل ہمارے استاد ہمارے پاس آئے تھے، ان کا احسان ہے کہ ہمارے پاس آئے ہیں، بڑا اکرم فرمایا، بڑی شفقت فرمائی، ہمیں چاہیے تھا کہ ہم ان کے پاس جاتے ہم نہیں جا سکے تو وہ خود آ گئے۔ آپ ایسی باتیں کریں گے تو آپ کے مقتدیوں کے ذہن بن جائیں گے اور آئندہ آپ کی مسجد میں کوئی بڑا آدمی آئے گا اور آپ اس کو مصلے پر کھڑا کریں گے تو کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ ہمارے ہاں چونکہ ماحول نہیں بنا ہوتا اس لیے ہم چاہتے بھی ہوں کہ اپنے بڑے کو مصلے پر کھڑا کریں لیکن پھر بھی کھڑا نہیں کر سکتے۔

متکلم اسلام کا واقعہ امامتِ سفر:

یہ کافی پرانی بات ہے، اس وقت سرگودھا شہر میں بھی میری کوئی زیادہ شہرت نہیں تھی۔ میں ایک بار گھر والوں کے ساتھ میانوالی گیا، واپس سرگودھا شہر میں ایک جگہ رکا کسی کو ملنے کے لیے، نماز ظہر کا وقت تھا تو نماز پڑھنے کے لیے محلہ کی مسجد میں چلا گیا۔ مجھے خیال نہ رہا کہ میں مسافر ہوں، چونکہ شہر میں تھا اس لیے میں نے سمجھا کہ مقیم ہوں۔ اس مسجد کے امام صاحب میرے جاننے والے تھے اور انہوں نے بھی یہی سمجھا کہ یہ یہیں 87 جنوبی ہی سے آئے ہیں یہ کون سا مسافر ہیں! انہوں نے مجھے

مصلے پر کھڑا کر دیا۔

جب میں نے نماز پڑھانی شروع کر دی تو پھر مجھے خیال آیا کہ میں تو مسافر ہوں۔ اب جب دو رکعات پوری کیں تو میں نے سوچا کہ یا تو میں چار رکعات پوری کروں تا کہ ان کی گالیوں سے بچ جاؤں اور قیامت کے دن عذاب بھگتوں اور یا دو رکعات کے بعد سلام پھیر دوں اور قیامت کو اجر ملے اور ابھی آفت اپنے سر لے لوں، تو میں نے اسی کو ترجیح دی کہ دنیا میں ان مقتدیوں کی طرف سے اذیت برداشت کروں اور آخرت کی ذلت سے بچوں۔ ظہر کے دو رکعات کے بعد میں نے سلام پھیرا اور جوں ہی میں نے سلام پھیرا تو لوگوں نے بھی سلام پھیر دیا اور لوگ لعن طعن کرنا شروع ہو گئے۔

اب مسئلہ بہت سے لوگوں کو معلوم نہیں تھا، دو چار مقتدیوں کو پتا تھا تو انہوں نے کھڑے ہو کر باقی نماز پوری کی اور باقی سب نے سلام پھیر دیا اور شروع ہو گئے، امام صاحب پر بھی برسے اور مجھ پر بھی برسے، وہ بولتے رہے اور میں خاموش چپ چاپ سنتا رہا، جتنی ان کے پاس باتیں تھیں جب وہ ختم ہو گئیں تو پھر میں نے بولنا شروع کیا۔ ایسے موقع پر بولنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے صبر سے کام لو، ان کو اندر کا ابال باہر نکالنے دو۔ جب وہ لوگ خاموش ہو گئے تو میں نے کہا کہ اب میری بات سنیں! میرا گاؤں 87 چک ہے، میں وہاں سے میانوالی گیا تھا اور میانوالی سے واپسی پر یہاں رکا ہوں تو میں مسافر ہوں، آپ کے امام صاحب کا خیال یہ تھا کہ مولانا صاحب 87 چک سے آئے ہیں چونکہ میں تو ان سے ملنے کے لیے نہیں آیا تھا میں تو اس محلے کے فلاں بندے کو ملنے کے لیے آیا ہوں، نماز کے لیے آیا تو انہوں نے مصلے پر کھڑا کر دیا ان کو تو پتا نہیں ہے کہ میں مسافر ہوں یا نہیں ہوں اور آپ ان کو ڈانٹ رہے ہیں۔

اور میں چونکہ سرگودھا شہر میں ہوں اور عام طور پر شہر میں کسی کے ذہن

میں نہیں ہوتا کہ میں مسافر ہوں تو میرے خیال میں بھی نہیں تھا کہ میں مسافر ہوں۔ تو میں بھی اپنے آپ کو مقیم سمجھ کر کھڑا ہو گیا، میں بھول گیا، بھولنے پر تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے لیکن آپ لوگ معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اور دوسری بات میں نے یہ کہی کہ یہ مسئلہ ہے کہ جب امام مقیم ہو تو چار رکعات پڑھائے اور امام مسافر ہو تو چار رکعات والی نماز میں دو کے بعد سلام پھیر دے اور مقتدی اپنی باقی دو رکعات ایسے پڑھیں! مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ آپ جھگڑتے کیوں ہیں، پریشان کیوں ہیں؟ امام مقیم ہو نماز آپ کی پھر بھی ہوتی ہے، امام مسافر ہو نماز آپ کی پھر بھی ہوتی ہے، مجھے افسوس اس وجہ سے ہے کہ تم اتنے جاہل لوگ ہو تمہاری ڈاڑھیاں سفید ہو گئیں اور تمہیں مسئلے کا پتا نہیں ہے اور تم کوستے ہو مولانا صاحب کو! جرم تمہارا ہے اور ڈانٹتے ہمیں ہو۔

پھر میں نے بھرپور طریقے سے ان کی کلاس لی تو کہنے لگے کہ جی غلطی ہو گئی ہے، معذرت معذرت! میں اس لیے کہتا ہوں کہ ایسے کبھی ہوتا ہے لیکن بولنے میں جلدی نہ کرو، پہلے ان کو اپنا ابال نکالنے دو پھر اس کے بعد مسئلہ بیان کرو! جب ان کو احساس ہو کہ ہم غلطی پر ہیں پھر ان کو ڈانٹ پلاؤ! اس کے بعد ان کو احساس ہوتا ہے کہ ہم نے جرم کیا ہے۔

نمازوں میں مسنون قرأت کا اہتمام کیا کریں لیکن اگلی بات میں بارہا کہتا ہوں کہ آپ نے مسئلہ پڑھ لیا اور مسئلہ آپ کو یاد ہو گیا لیکن جس مسجد میں آپ نماز پڑھتے ہیں اس مسجد کا امام اس طرز پر تلاوت نہیں کرتا جو میں نے بتائی ہے تو اس کے بارے میں دل میں نفرت کے خیالات ہرگز نہ لائیں کہ اس کو مسئلے کا پتا نہیں، یہ مسنون قرأت نہیں کر رہا کیونکہ یہ اس سے بھی بڑا گناہ ہے، اس لیے بہت جلد کسی کے بارے میں ایسا ذہن نہ بنایا کریں! اس سے نفرت کی فضا پھیلتی ہے، اس کو نقصان کچھ

نہیں ہوتا اور بندہ اپنی آخرت تباہ کر بیٹھتا ہے۔

استواء علی العرش متشابہات میں سے ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾

اللہ رب العزت نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے چھ دنوں میں پیدا کیا۔ چھ دنوں سے مراد چھ دنوں کی مقدار ہے کیونکہ اس وقت تو دن رات ہوتے ہی نہیں تھے۔ ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ پھر اللہ عرش پر مستوی ہوئے۔ یہ متشابہات میں سے ہے اور استواء علی العرش کا معنی ہم نہیں جانتے بلکہ اس کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔ اس پر میں پہلے تفصیل سے بات کر چکا ہوں۔

قیامت کے دن کی مقدار؛ تعارض کا حل

﴿یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۵﴾

اللہ رب العزت آسمان سے لے کر زمین تک جتنے معاملات ہیں ان سب کی تدبیر اور انتظام خود فرماتے ہیں اور پھر ہر امر؛ اللہ کی طرف لوٹتا ہے ایک ایسے دن میں جو تمہارے ایک ہزار سال کے برابر ہے یعنی قیامت کے دن۔

بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۝۴﴾[126]

کہ وہاں کا ایک دن دنیا کے پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے اور اس

126۔ المعارج 4:70

سورت میں فرمایا کہ وہاں کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہے لیکن اس میں کوئی تعارض نہیں ہے کہ یہ فرق مختلف اشخاص کی مختلف کیفیات کے اعتبار سے ہے۔ بعض بندوں کو وہاں کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر لگے گا اور بعضوں کو وہاں کا ایک دن دنیا کے پچاس ہزار سال کے برابر لگے گا اور صحیح اور راجح بات یہ ہے کہ نہ ہمیں ایک ہزار سال کے برابر ہونے کی کیفیت کا پتا ہے اور نہ ہمیں پچاس ہزار سال کے برابر ہونے کی کیفیت کا پتا ہے، ہم اس پر بھی ایمان لاتے ہیں اور اس پر بھی ایمان لاتے ہیں، اس کا حقیقی معنی قیامت کے دن خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ دنیا میں اس طرح ہوتا ہے کہ مثلاً ایک شخص صحت مند ہو، خوراک اس کی اچھی ہو، راحت کے اسباب موجود ہوں، عشاء پڑھ کر سوتا ہے اور جب فجر ہوتی ہے تو اس کو پتا نہیں چلتا یوں لگتا ہے کہ جیسے ابھی سویا تھا اور ایک شخص تکلیف میں ہو، اس کو رات کو نیند نہ آتی ہو تو اس کو ایک رات یوں لگتی ہے کہ جیسے مہینا گزر گیا ہو۔ ایک وقت ایک شخص کے لیے لمبا ہو جاتا ہے اور وہی وقت دوسرے کے لیے بہت چھوٹا ہو جاتا ہے، دنیا میں ہم اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

منکرین حیات الانبیاء کے ایک شبہ کا جواب:

یہ بات سمجھ آجائے تو اس سے ایک اور عقیدہ سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام ایک بستی سے گزرے، ﴿اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا﴾[127] وہ بستی تباہ شدہ تھی تو انہوں نے کہا کہ اللہ رب العزت اس کو کیسے زندہ کریں گے؟ ﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ﴾ اللہ نے انہیں سو

127۔ البقرۃ 259:2

سالوں کے لیے موت دے دی پھر ان کو زندہ کیا۔ پھر پوچھا ﴿كَمْ لَبِثْتَ﴾ آپ کتنا ٹھہرے ہیں؟ عرض کیا: ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ کہ میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا ہوں۔ فرمایا: ﴿بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾ کہ آپ سو سال تک ٹھہرے ہیں۔

اب اس سے وہ لوگ دلیل پکڑتے ہیں جو قبور میں انبیاء علیہم السلام کے اجساد کی حیات کی نفی اور انکار کرتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ دیکھو! اللہ نے پوچھا کہ کتنا ٹھہرے ہو؟ انہوں نے کہا: دن یا دن کا بعض حصہ۔ اللہ رب العزت نے فرمایا کہ نہیں بلکہ تم سو سال ٹھہرے ہو! اگر حضرت عزیر زندہ ہوتے تو ان کو پتا چل جاتا کہ میں کتنا عرصہ ٹھہرا ہوں، ان کو پتا نہیں چلا۔ لہذا معلوم ہوا کہ وہ زندہ نہیں ہیں۔ یعنی منکرین حیات نے ان کے عدمِ علم کو عدمِ حیات پر دلیل بنا دیا۔

پہلی بات تو یہ سمجھیں کہ عدمِ علم کو عدمِ حیات پر دلیل بنانا ہی غلط ہے۔ مثال کے طور پر آپ یہاں بیٹھے ہیں اور میں پوچھوں کہ میرے سبق کو شروع ہوئے کتنے سیکنڈ ہوئے ہیں؟ آپ جواب دیں کہ پتا نہیں۔ اب اس کا معنی کیا ہے کہ آپ مردے ہیں؟ اب عدمِ علم عدمِ حیات پر دلیل کیسے بنا؟ قرآن کریم میں ہے:

﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا﴾[128]

کہ قیامت کے دن اللہ تمام رسولوں کو جمع فرمائے گا اور ان سے کہے گا کہ میں نے تمہیں ان لوگوں کے پاس بھیجا تھا ان کی طرف سے تمہیں کیا جواب ملا؟ نبی کہیں گے کہ ہمیں تو کچھ پتا نہیں۔ تو کیا نبی دنیا میں زندہ نہیں ہوتے؟! اگر عدمِ علم؛ عدمِ حیات پر دلیل ہے تو پھر تو دنیا میں کوئی نبی زندہ نہیں ہو گا حالانکہ ایسا نہیں ہے!

128۔ المائدۃ 109:5

قرآن کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جہنمیوں سے پوچھیں گے:

﴿كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ﴿١١٢﴾﴾

کہ تم زمین میں کتنے سال ٹھہرے رہے؟ وہ کہیں گے:

﴿لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾[129]

کہ دن یا دن کا کچھ حصہ ہم ٹھہرے ہیں۔ حالانکہ دیکھا جائے تو دن کا کچھ حصہ تھوڑا ٹھہرے ہیں بلکہ کوئی ساٹھ سال جیا ہے، کوئی سو سال جیا ہے تو کیا یہ سارے لوگ مردے ہیں؟ اس لیے عدمِ علم کو عدمِ حیات پر دلیل نہیں بنا سکتے۔

اور دوسری بات یہ سمجھیں کہ عزیر علیہ السلام دنیا میں نہیں تھے ان کی حیات عالمِ برزخ یعنی دوسرے جہان کی حیات تھی، اِس عالم اور دوسرے عالم میں فرق یہ ہے کہ اِس عالم کا ایک ہزار سال ہو تو اگلے عالم کا ایک دن بنتا ہے۔ تو اللہ رب العزت نے پوچھا: ﴿كَمْ لَبِثْتَ﴾ کہ تم کتنا عرصہ ٹھہرے ہو؟ عرض کیا: ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ کہ میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا ہوں۔ تو بات تو ٹھیک تھی کیونکہ جب اللہ نے پوچھا تو عزیر علیہ السلام یہ سمجھے کہ شاید مجھ سے وہاں کے بارے میں سوال کیا جا رہا ہے، فرمایا: نہیں! ہم وہاں کا نہیں بلکہ ہم یہاں کا پوچھ رہے ہیں، اور یہاں کا کتنا بنتا ہے؟ فرمایا: ﴿بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾ بلکہ تم ایک سو سال ٹھہرے ہو! اب یہاں کا ایک سو سال اور وہاں کا دن یا دن کا بعض حصہ ہو تو یہ تو موافقت ہے، یہ مخالفت کیسے ہے؟! اور اگر عدمِ علم کو عدمِ حیات کی دلیل بنائیں تو بھی ٹھیک نہیں ہے اور اگر آپ کہتے ہیں کہ ان کو علم نہیں تھا یہ بھی ٹھیک نہیں ہے بلکہ ان کو تو علم بھی تھا۔ اس لیے اس آیت کو عدمِ حیات پر دلیل نہیں بنا سکتے۔

129۔ المؤمنون 23:112، 113

ملک الموت اور ان کی جماعت:

﴿قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ﴾

آپ ان سے فرمائیں کہ ملک الموت تمہاری روح کو قبض کرتا ہے جو تم پر مقرر کیا گیا ہے، پھر تمہیں واپس تمہارے رب کی طرف لے جایا جائے گا۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک الموت روح کو قبض کرتا ہے اور دوسرے مقام سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ روح قبض کرتے ہیں۔ فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ﴾[130]

کہ جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، جب فرشتے ان کی روح قبض کرنے آئے تو پوچھنے لگے کہ تم کس حالت میں تھے؟ جواب یہ ہے کہ یہاں "ملک" وہاں "ملائکہ" میں کوئی تعارض نہیں ہے، روح قبض کرنے پر کئی فرشتے متعین ہیں جن کے سربراہ ملک الموت ہیں جن کا نام عزرائیل علیہ السلام ہے۔

یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بعض لوگ بڑی شدت سے رد کرتے ہیں کہ ملک الموت کا نام عزرائیل کہیں بھی نہیں آیا۔ میں نے کہا کہ مفسرین نے ملک الموت کا نام عزرائیل لکھا ہے اس لیے ہر بات کا شدت سے رد نہ کیا کریں۔ بعض لوگ معروف بات کے رد کرنے کو بڑا عالم ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں کہ یہ بہت بڑا مولوی ہے کیونکہ معروف بات کا رد کیا ہے یہ بعض لوگوں کا مزاج ہے۔ جب مفسرین نے ملک الموت کا نام عزرائیل رکھا ہے تو آپ کو شدت سے رد کرنے کی ضرورت کیا ہے! بس خاموشی اختیار کرلیں۔

130۔ النساء4:97

عزرائیل علیہ السلام کے بارے میں کئی ایک روایات ہیں کہ عزرائیل علیہ السلام کو جب ارواح قبض کرنے کی ڈیوٹی پر متعین کیا تو انہوں نے خود اللہ سے درخواست کی کہ اے اللہ! میرے ذمے جو آپ نے کام لگایا ہے میں کروں گا لیکن اس کی بدنامی بہت ہوگی، ہر بندہ مجھے برا کہے گا کہ یہ ہمارے باپ کی روح لے گیا، ماں کی روح لے گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ارواح تم قبض کروگے لیکن ہم اس کے ظاہری اسباب کچھ ایسے پیدا کریں گے کہ لوگ آپ کا تذکرہ بھی نہیں کریں گے۔ تو کوئی ایکسیڈنٹ میں جارہا ہے، کوئی بیماری میں جارہا ہے، کوئی آدمی بالکل صحت مند ہو اور موت آئے ایسا بہت کم ہوتا ہے جب بھی کسی پر موت آتی ہے تو اس کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ بن جاتا ہے۔ کبھی بوڑھا ہوگیا، کبھی بیمار ہوگیا اور کبھی اتنا بوڑھا ہو جاتا ہے کہ لوگ خود ہی کہتے ہیں کہ مر ہی جائے تو اچھا ہے، اب عزرائیل علیہ السلام کو بددعائیں کیا دینی ہیں، اب تو دعائیں دیں گے کہ اچھا ہے کہ اس کی روح تو لے گیا۔

یہ معاملہ تو انسانوں کا ہے کہ عزرائیل علیہ السلام اور ان کی جماعت ارواح قبض کرتی ہے لیکن انسان کے علاوہ جو حیوانات ہیں ان کے بارے میں دونوں قسم کی روایات ملتی ہیں کہ ان کی روح ملک الموت قبض کرتے ہیں یا یہ کہ ان کی روح براہِ راست اللہ تعالیٰ خود قبض فرمالیتے ہیں۔ دونوں قسم کے اقوال ملتے ہیں۔

حدودِ شریعت کا لحاظ کیجیے!

﴿وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۳﴾﴾

یہاں یہ مسئلہ ذہن نشین فرمالیں کہ ہم دعوت کے پابند ہیں، ہم تبلیغ کے پابند ہیں، لوگوں کو ہدایت کی طرف لانے پر پابند ہیں لیکن حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے، حدودِ شریعت سے نکل کر ہم دعوت کبھی نہ دیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ

تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر ہم چاہتے تو ہر کسی کو ہدایت عطا فرما دیتے لیکن ہمارا فیصلہ ہے کہ جہنم کو ہم نے لوگوں اور جنات سے بھرنا ہے۔ تو جب ہر بندے نے جنت میں نہیں جانا بہت ساروں نے جہنم میں بھی جانا ہے تو پھر آپ حدودِ شریعت کو توڑ کر دین کی دعوت کیوں ہیں؟ حدودِ شریعت میں رہ کر دین کی دعوت دیں، کسی کے مقدر میں ہو گا تو دعوت قبول کرے گا، مقدر میں نہیں ہو گا تو نہیں قبول کرے گا۔

”اللہ بھلا دیں گے“ کا معنی:

﴿فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٤﴾﴾

قیامت کے دن اللہ خود فرمائیں گے یا بذریعہ ملائکہ فرمائیں گے کہ آج تم چکھو اس عذاب کو، تم نے قیامت کے دن کو بھلا دیا تھا تو آج ہم نے تمہیں بھلا دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اللہ کسی بندے کو بھلا تو نہیں سکتے تو کیسے فرما دیا کہ آج ہم نے تمہیں بھلا دیا ہے؟ اس کا معنی یہ ہے کہ بھلایا نہیں بلکہ اس کے ساتھ معاملہ ایسا ہو گا جیسے بھلا دیا ہے۔ جیسے بسا اوقات حکمران کسی بندے کو پکڑتے ہیں اور جیل میں ڈالتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکمران تو ایسے ہیں کہ جیسے جیل میں ڈال کر بھلا دیا ہے حالانکہ بھلایا نہیں ہوتا بلکہ پتا ہوتا ہے لیکن چونکہ رہا نہیں کرتے تو گویا یہ معاملہ ایسے ہے جیسے بھول گیا ہو۔

﴿وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٢١﴾﴾

اللہ رب العزت کبھی دنیا میں انسان کو مصیبت اور تکلیف دیتے ہیں آخرت کے عذاب سے پہلے تا کہ یہ بندہ لوٹ آئے اور کفر سے باز آ جائے اور اگر کسی بندے کو

دنیا میں تکلیف پہنچے اور اس کی وجہ سے توبہ کر کے گناہ چھوٹ جائے تو یہ تکلیف تکلیف نہیں بلکہ یہ خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ ظاہری طور پر اگرچہ عذاب ہے لیکن درحقیقت خدا کی بہت بڑی نعمت ہے اور آپ یقین فرمائیں میں کس درد کے ساتھ آپ کو یہ بات سمجھاؤں کہ بسا اوقات اللہ کی طرف سے آنے والی تکالیف یہ انسان کے لیے اتنی مفید ہوتی ہیں کہ اگر یہ تکالیف نہ ہوتیں تو شاید بندے کو اتنا فائدہ نہ ہوتا اور بسا اوقات فتوحات ملتی ہیں، نعمتیں ملتی ہیں، صحت ملتی ہے، مسلسل عزت ملتی ہے تو انسان غرور اور گھمنڈ کا شکار ہو جاتا ہے لیکن جب اللہ اس بندے کو تھوڑی سی تنبیہ فرماتے ہیں تو پھر بندہ رجوع الی اللہ کر کے توبہ کرتا ہے۔ تو یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے، خدا کا کتنا بڑا اکرم ہے۔ اس لیے اللہ کی طرف سے آنے والی تکلیف کو اللہ کی محبت سمجھا کریں کہ اللہ کو مجھ سے پیار ہے تبھی تو اللہ نے مجھے تنبیہ فرمائی ہے، اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

سفر معراج میں موسیٰ اور حضور علیہما السلام کی ملاقات:

﴿وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ فَلَا تَکُنۡ فِیۡ مِرۡیَۃٍ مِّنۡ لِّقَآئِہٖ وَ جَعَلۡنٰہُ ہُدًی لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۲۳﴾﴾

اس کا ایک معنی یہ ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی ہے اور آپ کو ہم نے قرآن کریم دیا ہے ﴿فَلَا تَکُنۡ فِیۡ مِرۡیَۃٍ مِّنۡ لِّقَآئِہٖ﴾ یہ قرآن ہماری طرف سے ہے اس قرآن میں آپ نے شک نہیں کرنا! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے قرآن ہونے میں کوئی شک نہیں تھا لیکن بسا اوقات اس پر مزید پختہ رہنے کے لیے اللہ پاک ایسی بات ارشاد فرماتے ہیں۔

اور دوسرا معنی اس آیت کا بعض مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ ہم نے موسیٰ

علیہ السلام کو تورات دی اور آپ کی موسیٰ علیہ السلام سے اس دنیا میں ملاقات ہو گی اس ملاقات میں آپ شک نہ کرنا، یقین کرنا کہ آپ کی ملاقات موسیٰ علیہ السلام ہی سے ہوئی ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ملاقات کہاں پر ہوئی ہے؟ تو یہ ملاقات معراج کی رات آسمانوں پر ہوئی ہے۔

☼ اللہ کے نبی پہلے آسمان پر گئے ہیں ملاقات حضرت آدم علیہ السلام سے ہے

☼ دوسرے آسمان پر ملاقات حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہے

☼ تیسرے آسمان پر ملاقات حضرت یوسف علیہ السلام سے ہے

☼ چوتھے آسمان پر ملاقات حضرت ادریس علیہ السلام سے ہے

☼ پانچویں آسمان پر ملاقات حضرت ہارون علیہ السلام سے ہے

☼ چھٹے آسمان پر ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے

☼ ساتویں آسمان پر ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ کس نبی سے کس آسمان پر ملاقات ہوئی اس کو یاد رکھنے کے لیے جو مخفف ہے وہ ہے "أَعَيَاهُمَا" اس میں پہلے الف ہے مراد آدم، پھر عین ہے مراد عیسیٰ، پھر یا ہے مراد یوسف، پھر الف ہے مراد ادریس، پھر آگے ھا ہے مراد ہارون، پھر میم ہے مراد موسیٰ، پھر الف ہے مراد ابراہیم۔ یہ سات حروف ذہن میں رکھیں گے تو یاد کرنا بہت آسان ہو گا کہ کس آسمان پر کس نبی سے ملاقات ہوئی تھی۔

تو چھٹے آسمان پر ملاقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی اور یہ لمبا واقعہ ہے، اس وقت میں اس پر بات نہیں کرتا۔

موسیٰ علیہ السلام کا قبر میں نماز پڑھنا:

اسی طرح صحیح مسلم کی جو روایت ہے کہ کثیب احمر سرخ ٹیلے سے آپ

صلی اللہ علیہ وسلم گزرے تو موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

مَرَرْتُ عَلٰی مُوسٰی لَیْلَةَ اُسْرِیَ بِیْ عِنْدَ الْکَثِیْبِ الْاَحْمَرِ وَھُوَ قَائِمٌ یُّصَلِّیْ فِیْ قَبْرِہٖ۔ [131]

معراج والی رات میرا گزر موسیٰ علیہ السلام پر ہوا تو وہ سرخ ٹیلہ کے پاس اپنی قبر میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔

اب جو نہیں مانتے وہ آسان سا اعتراض کر دیتے ہیں کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا۔ ہم نے کہا کہ دو باتیں الگ ہیں؛ ایک ہے موسیٰ علیہ السلام کا قبر میں نماز پڑھنا اور ایک ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا باہر سے دیکھ لینا! تو معجزہ اُن کا نماز پڑھنا نہیں ہے بلکہ معجزہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھ لینا ہے۔ بحث دیکھنے پر نہیں ہو رہی، بحث نماز پڑھنے پر ہو رہی ہے۔

کبھی اعتراض کر دیتے ہیں کہ جی نماز تو روحیں پڑھتی تھیں، جسم نہیں پڑھتے تھے۔ میں نے کہا کہ جس کو قبر میں دفن کیا ہے نماز وہی پڑھے گا نا؟ اگر اس قبر میں روح ہے تو پھر روح پڑھے گی اور اگر اس قبر میں جسم ہے تو پھر جسم پڑھے گا۔ جب اس قبر میں نماز پڑھی جا رہی ہے تو اس قبر میں روح کیسے نماز پڑھے گی؟ تمہارا تو عقیدہ یہ ہے کہ روح کا جسم کے ساتھ تعلق بھی نہیں ہے اور روح ہوتی بھی علیین میں ہے، یہ تو ہمارا عقیدہ ہے کہ روح اور جسم کا تعلق ہے، تمہارے عقیدے پر تو نہ یہاں روح ہے اور نہ اس کا تعلق ہے تو خالص جسم نماز پڑھ رہا ہے نا! ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں:

131۔ صحیح مسلم، رقم:2375

فَإِنَّ حَقِيْقَةَ الصَّلَاةِ وَهِيَ الْإِتْيَانُ بِالْأَفْعَالِ الْمُخْتَلِفَةِ إِنَّمَا تَكُوْنُ لِلْأَشْبَاحِ لَا لِلْأَرْوَاحِ.[132]

کہ اصل نماز تو وہی ہوتی ہے جو جسم پڑھتا ہے، وہ نماز نہیں ہوتی جو روح پڑھتی ہے۔

نماز پڑھنا جسم کا کام ہے:

اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ نماز کا تعلق روح سے نہیں ہے بلکہ جسم سے ہے۔ حدیث جبرائیل مفصل حدیث ہے۔ اس میں ہے کہ جبرائیل امین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلا سوال کیا "أَخْبِرْنِيْ عَنِ الْإِسْلَامِ" حضور! فرمائیے کہ اسلام کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا

کہ اسلام یہ ہے کہ تو اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کر، زکوۃ ادا کیا کر، رمضان کا روزہ رکھا کر اور اگر طاقت ہو تو بیت اللہ کا حج ادا کر۔

پھر پوچھا: "فَأَخْبِرْنِيْ عَنِ الْإِيْمَانِ" کہ ایمان کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ چیزیں فرمائی ہیں:

أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ.

کہ اللہ کو ماننا، اللہ کے فرشتوں کو ماننا، خدا کی آسمانی کتابوں کو ماننا، اللہ کے

132۔ مرقاۃ المفاتیح: ج10 ص571 کتاب الفضائل والشمائل باب فی المعراج

رسولوں کو ماننا، آخرت کے دن کو ماننا اور اچھی یا بری تقدیر کو ماننا۔ یہ ایمان ہے۔

پھر پوچھا: "فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ" احسان کیا ہے؟ فرمایا:

أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ.

کہ اللہ کی عبادت یوں کر کہ گویا تو اللہ کو دیکھ رہا ہے، اگر یوں نہ کر سکے تو پھر عبادت یوں کر کہ گویا خدا تجھے دیکھ رہا ہے۔

پھر پوچھا: "فَأَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ" قیامت کے بارے میں بتائیے! فرمایا:

مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ.

فرمایا: اس سوال کا جواب تجھے بھی نہیں آتا، اس سوال کا جواب مجھے بھی نہیں آتا۔

پھر پوچھا: "فَأَخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَاتِهَا" کہ اچھا قیامت کی کچھ نشانیاں ہی بتا دیجیے! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَنْ تَلِدَ الْأَمَةُ رَبَّتَهَا وَأَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ. [133]

فرمایا: جب وہ دور آجائے کہ باندی اپنی مالکہ کو جنے یعنی بیٹی کی حیثیت مالکہ کی بن جائے اور ماں کی حیثیت باندی کی بن جائے تو سمجھ لینا قیامت آنے لگی ہے اور فرمایا کہ جب دیکھو کہ ایک آدمی جس کے پاؤں میں جوتے بھی نہیں ہیں، اس کے جسم پر کپڑا بھی نہیں ہے، پیٹ میں روٹی بھی نہیں ہے اور بکریاں چرانے والا ہے جب ایسے آدمی بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کریں تو سمجھ لینا کہ قیامت آرہی ہے۔

اب دیکھو! پہلا سوال اسلام، دوسرا ایمان اور تیسرا احسان کے بارے میں کیا

133۔ سنن ابی داؤد، رقم: 4695

ہے۔ اسلام کا تعلق جسم سے ہے، ایمان کا تعلق دل سے ہے اور احسان کا تعلق دل میں چھپی ہوئی کیفیت سے ہے۔ تو اسلام میں جو پانچ چیزیں ہیں ان میں سے دوسری چیز نماز ہے۔ تو نماز جسم کا کام ہے یا روح کا؟ (جسم کا۔ سامعین) یہ تو کام ہی جسم کا ہے۔ تو پھر روح کیسے پڑھ رہی ہے؟! اس لیے ہم کہہ رہے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو نماز پڑھی ہے وہ جسم نے پڑھی ہے، یہ مت کہو کہ روح نے پڑھی ہے۔

مقتدا کے لیے دو شرطیں:

﴿وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ۫ وَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾﴾

اور ہم نے ان میں سے کچھ لوگوں کو جنہوں نے صبر سے کام لیا پیشوا بنا دیا وہ ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے اور ہماری آیات پر یقین بھی رکھتے تھے۔

اللہ رب العزت جس کو ہدایت کا مقتدا بناتے ہیں اور امام الہدیٰ بناتے ہیں تو اس کے لیے دو شرطیں ہیں:

1: کمال علمی 2: کمال عملی

علم اور عمل میں کمال ہو تو اللہ اس بندے کو مقتدیٰ بناتے ہیں۔

﴿لَمَّا صَبَرُوْا﴾ یہ کمال عملی ہے۔ صبر کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ "اَلصَّبْرُ عَلَى الطَّاعَاتِ" کہ نیکی پر دل نہیں کرتا پھر بھی کرتا ہے، "اَلصَّبْرُ عَنِ الْمَعَاصِيْ" کہ گناہ کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن پھر بھی نہیں کرتا، "اَلصَّبْرُ عَلَى الْمَصَائِبِ" کہ مصیبت آئے تو اس پر صبر کرے اور برداشت کرے۔ تو یہ تین قسم کے صبر اس میں شامل ہیں۔ طاعات پر بھی صبر کرتا ہے، گناہوں سے رکنے پر بھی صبر کرتا ہے، مشقت آئے تو اس کو بھی برداشت کرتا ہے تو کمال عملی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا؟ اس سے

بڑا کمال اور کیا ہو سکتا ہے؟

﴿وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ﴾ کہ ہماری آیات پر یقین رکھتے ہیں۔ تو یقین وہی کرے گا جس کے پاس علم ہو گا، علم بھی آ گیا فہم بھی آ گیا تو یہ کمالِ علمی اس میں آ گیا۔

تو جس شخص میں کمالِ علمی بھی ہو اور کمالِ عملی بھی ہو تو مقتدا بننا اس کا حق ہے۔ جب اللہ بندے کو یہ دو چیزیں دے اور پھر اس کو اقتداء بھی ملے تو اس بندے کو قبول کرنا چاہیے، اس کے خلاف پلان نہ بناؤ! تمہارا کچھ بھی فائدہ نہیں ہونا اور اس کا کچھ بھی نہیں بگڑنا، انسان اپنی دنیا اور آخرت تباہ کر بیٹھتا ہے۔

صبر کی تین اقسام:

صبر کی تین قسمیں ہیں؛ صبر علی الطاعات، صبر عن المعاصی اور صبر علی المصائب۔ تو یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں۔ عوام کو الجھن ہو تو تعجب نہیں ہونا چاہیے لیکن اگر علماء کو الجھن ہو تو تعجب ہوتا ہے کہ نماز میں دل نہیں لگتا، مطالعہ میں دل نہیں لگتا، تکرار کو دل نہیں کرتا۔ مجھے بعض طلبہ کہتے ہیں کہ استاذ جی دعا کریں! میں نے کہا: اس کا تعلق دعا سے نہیں ہے اس کا تعلق چستی سے ہے، میں بھی کبھی تھکا ہوا ہوتا ہوں میرا بھی دل نہیں کرتا کہ مطالعہ کروں، میرا بھی جی چاہتا ہے کہ سبق کی چھٹی کروں لیکن جی چاہنے کا نام تو عبادت نہیں ہے، اگر دل کیا اور آپ نے پڑھ لیا تو کون سا ثواب کمایا؟ دل کیا اور تلاوت کر لی تو کون سی عبادت کی؟ عبادت تو اس چیز کا نام ہے کہ دل نہ کرے پھر بھی انسان اسے کرے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کتنے بڑے آدمی تھے! حضرت کے ایک مرید نے خط لکھا کہ حضرت میں عبادت کرتا ہوں لیکن مزا نہیں آتا۔ حضرت تھانوی نے جواب لکھا کہ مزا؛ مذی میں ہے عبادات میں نہیں ہے، اس کو اللہ کا حکم سمجھ کر کرو! اب دیکھو بظاہر ہنسانے والی بات ہے لیکن حکیم

الامت نے کتنی بڑی بات فرمائی! کیسے امت کے نبض کو سمجھتے تھے!

متکلمِ اسلام کی طلبہ کو نصیحت:

میں اس لیے کہتا ہوں کہ بس ایک فیصلہ کرو! مزوں کو چھوڑو! مزا آتا ہے یا نہیں آتا، جی چاہتا ہے یا نہیں کرتا لیکن یہ کام کرنا ہی کرنا ہے، کچھ وقت گزرے گا تو مزا بھی آنا شروع ہو جائے گا اور وہ طبیعت بن جائے گی، اطاعت کے بغیر بندے کو لطف ہی نہیں آئے گا لیکن اس پر تھوڑی سی محنت کرنی پڑتی ہے۔ محنت سے مطالعہ کا ذوق بنالو پھر دیکھنا کہ مطالعہ میں کتنا مزا آتا ہے، پھر نکات سننے کو دل کتنا کرتا ہے، ایک نکتہ ملے تو بندہ باغ باغ ہو جاتا ہے کہ ایک نکتہ میرے سامنے آگیا۔ اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین فرمالیں کہ جب انسان مطالعہ میں آگے بڑھتا ہے اور علوم میں وسعت آتی ہے تو انسان میں تواضع آتی ہے، کبر نہیں آتا، کیونکہ مطالعے کی وسعت سے اپنی جہالت بندے پر کھلتی ہے تو جہالت کھلنے سے تواضع آتی ہے کہ مجھے ان ان چیزوں کا پتا نہیں تھا۔ اب آپ تفسیر پڑھ رہے ہیں تو آپ کو کتنی باتیں معلوم ہو رہی ہیں جن کا آپ کو پتا نہیں تھا۔ تو جب چیزوں کا پتا چل رہا ہے تو آپ کے اوپر اپنی جہالت کھل رہی ہے یا نہیں؟ کھل رہی ہے تو اس سے بندے میں عاجزی آنی چاہیے، جب آپ اپنا یہ رخ بنا لیں تو پھر اللہ کے شکر کی توفیق ملتی ہے۔

مشکلات کے بعد راحتوں کا دور ہے:

آپ یقین فرمائیں کہ میں آپ کو اپنے دل کی کیفیت نہیں بتا سکتا بس! میں جب کبھی گھر میں بیٹھا ہوتا ہوں تو ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ جیسے بندے کے آنسو آنے لگتے ہیں، میں ایک ایک چیز دیکھتا ہوں تو خدا کا بہت شکر ادا کرتا ہوں کہ آج سے کچھ سال پہلے میری حالت یہ تھی کہ مجھ سے کوئی بندہ سلام لینے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اس سے ملیں گے تو مصیبت، اس سے ملیں گے تو تکلیف، اس سے تعلق بنے گا تو پتا نہیں

کیا ہوگا؟! اتنی مشکلات سے میں گزرا ہوں کہ میرا نام لینے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا۔ اب اللہ کا شکر ہے۔ کبھی لوگ ملنے کے لیے تیار نہیں تھے اور ابھی میں کسی علاقے میں جاؤں تو جانے سے پہلے فون شروع ہو جاتے ہیں کہ ہمارا گھر راستے میں ہے ہماری دکان روڈ کے اوپر ہے ہمارا مدرسہ سامنے ہے بس ایک منٹ کے لیے رک جائیں! خدا گواہ ہے کہ میرے دل میں اس پر اکڑ نہیں آتی بلکہ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ایک وقت تھا کہ کوئی پوچھنے کے لیے تیار نہیں تھا اور آج فون کر رہے ہیں، کل گھاس نہیں ڈالتے تھے اور آج دیسی مرغ کھلانے کے لیے تیار ہیں، ایسی چیزیں آنے سے خدا کا شکر ادا کیا کریں۔

میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ آج دنیا میں مسلمانوں پر اتنے شدید حالات ہیں کہ آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے اور یہاں آپ کو تو کوئی ٹینشن ہی نہیں، قالین پر بیٹھے ہیں، پنکھے لگے ہوئے ہیں، صبح وشام وقت پر پکا پکایا کھانا مل رہا ہے اور آپ سبق پڑھ رہے ہیں۔ دیکھو خدا کے کتنے انعامات ہیں! تو ان انعامات کا کیا معنی ہے کہ ہم اپنی زندگیاں گناہوں میں گزار دیں؟ بلکہ ہمیں شکر اور اللہ کی عبادت کے ساتھ زندگی گزارنی چاہیے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

پانی کا نظام قدرت کا کرشمہ:

﴿اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَسُوۡقُ الۡمَآءَ اِلَی الۡاَرۡضِ الۡجُرُزِ فَنُخۡرِجُ بِہٖ زَرۡعًا تَاۡکُلُ مِنۡہُ اَنۡعَامُہُمۡ وَ اَنۡفُسُہُمۡ ؕ اَفَلَا یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۷﴾﴾

کیا ان لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو کھینچ کر خشک زمین کی طرف لے جاتے ہیں، پھر اس سے کھیتی پیدا کرتے ہیں جسے ان کے جانور بھی کھاتے ہیں اور یہ لوگ خود بھی کھاتے ہیں۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں!

یہاں اللہ پاک نے نظام آب پاشی کو بیان کیا ہے اور قرآن کریم نے دونوں

نظاموں کو بیان فرمایا ہے۔ بعض ایسے علاقے ہیں کہ اللہ پاک فرشتوں کو حکم دیتے ہیں وہ وہاں بارش برساتے ہیں اور زمین تازہ ہو جاتی ہے، سبزے اگتے ہیں اور بعض زمینیں ایسی ہوتی ہیں کہ جو زیادہ بارشوں کی متحمل نہیں ہوتیں، پھر اس علاقے میں بارشیں نہیں ہوتیں، بارشیں وہاں ہوتی ہیں جہاں زمینیں بارشوں کی متحمل ہوتی ہیں تو وہاں سے پانی چلتا ہے اور بذریعہ نہر ان علاقوں میں آتا ہے جہاں کی زمین بارش کی متحمل نہیں ہوتی۔ یہ ہماری زمینیں ہیں، یہاں دس دن بارشیں ہو جائیں تو سیلاب آ جائے اور چلنا مشکل ہو جائے۔ اللہ پانی پہاڑوں پر برساتے ہیں وہاں سے ندیاں نکلتی ہیں نہریں بنتی ہیں اور آگے ہماری زمینیں سیر اب ہوتی ہیں۔ یہاں پر اس کا ذکر فرمایا کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ ہم برساتے کہاں پر ہیں اور وہاں سے پانی کو چلا کر کہاں لے جاتے ہیں جس سے تمہاری زمینیں سرسبز ہو جاتی ہیں۔ اللہ رب العزت ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الاحزاب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَ لَا تُطِعِ الۡكٰفِرِیۡنَ وَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیۡمًا حَكِیۡمًا ۙ﴿۱﴾ وَّ اتَّبِعۡ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا ۙ﴿۲﴾﴾

غزوۂ احزاب کا واقعہ:

جنگ بدر مدینہ منورہ میں پہنچنے کے بعد سن 2 ہجری میں ہوئی۔ اس کے بعد غزوۂ احد سن 3 ہجری میں ہوا۔ پھر غزوۂ احزاب سن 4 ہجری میں پیش آیا اور بعض کہتے ہیں کہ 5 ہجری میں پیش آیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ احد سے فارغ ہوئے۔ ادھر مدینہ منورہ سے یہود کے قبیلہ بنو نضیر اور بنو وائل سے تقریباً بیس آدمی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے سخت نفرت اور عداوت رکھتے تھے مکہ گئے اور ابوسفیان اور دیگر سردارانِ مکہ کو جا کر ملے اور کہا کہ ہم تمہارے ساتھ تعاون کرتے ہیں تم جا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ کرو اور ان کو ان کے ساتھیوں سمیت ختم کر دو۔

قریش مکہ نے کہا کہ وہ تو ہمیں کافر سمجھتے ہیں، ہمارا اور ان کا دین و مذہب کا سخت اختلاف ہے اور تم یہودی ہو اہلِ کتاب ہو تو تم بتاؤ کہ تمہارے نزدیک ہم سچے ہیں

یا وہ سچے ہیں؟ قریش مکہ نے سوچا کہ اگر ان کے ساتھ بات پکی کر لیں اور یہ بھی ہمیں غلط سمجھتے ہوں تو پھر ان کے ساتھ مل کر لڑنے کی ضرورت کیا ہے؟ یہودیوں نے جھوٹ بولا اور کہا کہ ہم ان کو غلط سمجھتے ہیں اور تمہیں درست سمجھتے ہیں۔

قریشیوں نے کہا کہ چلو پھر مسجدِ حرام میں جا کر معاہدہ کرتے ہیں۔ بیس آدمی ان یہودیوں کے تھے اور پچاس آدمی ان قریش مکہ کے تھے۔ مسجد حرام میں جا کر خانہ کعبہ کی دیواروں سے چمٹ کر معاہدہ کر رہے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ختم کرنے کے لیے اور اللہ کا حلم دیکھو کہ اللہ پھر بھی ان کو برداشت کر رہے ہیں۔ خیر ان کا معاہدہ ہو گیا۔

ان یہودیوں نے جب قریش مکہ سے معاہدہ کیا تو واپسی پر ایک جنگجو قبیلہ غطفان کے پاس گئے، انہیں اپنے اور قریش کے معاہدے کا بتایا اور ان کو بھی اس بات پر ابھارا کہ تم بھی ہمارا ساتھ دو اور اس نئے دین کو ختم کرنے میں مدد کرو تو ہم تمہیں خیبر کی ایک سال کی کھجوروں کی آمدن دیں گے۔ بعض روایات میں ہے کہ آدھی آمدن دیں گے۔ اس رشوت کی شرط پر قبیلہ غطفان کے سردار عُیَیْنہ بن حِصن نے آمادگی ظاہر کی کہ ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔

کفر کے لشکر کی تعداد:

جب یہ معاہدے ہو گئے تو قریش مکہ کا قافلہ مکہ سے نکلا۔ انہوں نے چار ہزار بندے ساتھ لیے اور ساتھ تین سو گھوڑے اور ایک ہزار اونٹ لیے۔ ان پر سامان لادا اور مدینہ منورہ کا رخ کیا۔ پھر راستے میں ایک جگہ "مرّ ظہران" میں پڑاؤ ڈالا۔ یہاں اس لشکر میں کئی قبیلے شامل ہو گئے، قبیلہ اسلم، قبیلہ اشجع اور بنو مرہ، اسی طرح بنو کنانہ، بنو فزارہ اور غطفان کے سارے قبیلے جن کے ساتھ معاہدہ ہوا تھا یہ سارے کے سارے اس لشکر میں شامل ہوتے گئے تو یہ لشکر بارہ ہزار افراد تک جا پہنچا۔ یہ سارا لشکر اب

مدینہ منورہ کی طرف چلا۔

مسلمانوں کی تیاری:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع مل گئی کہ یہ لوگ حملے کے لیے آ رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مشورہ یہ تھا کہ یارسول اللہ! ہمارے ہاں عجم میں جب کوئی دشمن باہر سے حملہ کرے تو ہم خندق کھود کر اپنے شہروں کا دفاع کرتے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ رائے ٹھیک ہے۔ چنانچہ ان کے مشورے پر عمل کیا گیا اور تقریباً ساڑھے تین میل لمبی خندق کھودنے کا فیصلہ ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کو دس دس ساتھیوں میں تقسیم کیا اور ان دس کو حکم دیا کہ وہ چالیس گز خندق کھودیں۔ اس جہاد کے لیے انصار کا جھنڈا حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو دے دیا اور مہاجرین کا جھنڈا حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔

سَلْمَانُ مِنَّا أَهْلَ الْبَيْتِ:

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ انصار کے ساتھ ہوں یا مہاجرین کے ساتھ؟! اب انصار کہتے کہ یہ ہمارے ہیں اور مہاجرین کہتے کہ ہمارے ہیں۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نزاع کو ختم فرمایا، فرمایا: نہ تمہارے ہیں نہ ان کے ہیں "سَلْمَانُ مِنَّا أَهْلَ الْبَيْتِ" بلکہ یہ ہمارے ہیں۔ اب لڑائی ختم ہوگئی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ کچھ انصاری صحابہ ملائے کچھ مہاجر صحابہ ملائے، دس بندے ان کو بھی دے دیے کہ یہ تمہارا حصہ ہے تم کھودو! اندازہ کریں ساڑھے تین میل لمبی خندق صرف چھ دن میں کھودی گئی۔ اس خندق کی چوڑائی اور گہرائی اتنی تھی جس سے گھوڑا پھلانگ نہ سکے اور دشمن اس کو کراس نہ کر سکے۔

ایک عظیم معجزہ:

خندق کھود رہے تھے کہ اس میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ظاہر ہوا۔ خندق کھودنے کا مشورہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دیا تھا، آپ اس فن کے ماہر بھی تھے لیکن اللہ کی شان کہ حضرت سلمان ہی کے حصے میں جو جگہ آئی وہیں ایک بڑی چٹان آگئی جو ان سے نہیں ٹوٹ رہی تھی۔ اب یہ ماہر بھی ہیں اور رکاوٹ بھی وہیں پیدا ہو گئی۔ دیکھو اللہ پاک کیسے تربیت فرماتے ہیں! ان کے ساتھ والے بعض صحابہ نے کہا کہ ہم سیدھی خندق کھودنے کے بجائے تھوڑا سا راستے کو موڑ لیں اور پھر اصل خندق کے ساتھ ملا لیں گے لیکن اس کا خط چونکہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کھینچا ہے کہ خندق یہاں سے کھودنی ہے اس لیے جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھیں گے نہیں یہ تھوڑی سی جگہ بھی موڑنی نہیں ہے۔

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے جا کر عرض کیا تو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی خندق کھود رہے تھے اور اتنی مٹی آپ کے جسم پر گری ہوئی تھی کہ آپ کا پیٹ اور پیٹھ نظر نہیں آرہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لائے، پوچھا کون سا حصہ ہے؟ عرض کیا: یہ چٹان ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کدال لی اور ایک ضرب لگائی اور یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا﴾[134] اس سے اس چٹان کا تیسرا حصہ ٹوٹ گیا اور ایک روشنی بھی اس چٹان سے نکلی۔ دوسری ضرب لگائی اور یہی آیت یوں پڑھی: ﴿وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا﴾ تو اس کا دو تہائی حصہ ٹوٹ گیا اور ساتھ ہی ایک روشنی بھی نکلی اور جب تیسری

134۔ الانعام 115:6

ضرب لگائی اور یہی آیت پھر پوری پڑھی: ﴿وَتَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ﴾ تو پوری چٹان ٹوٹ گئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم خندق سے باہر تشریف لائے اور ایک جگہ بیٹھ گئے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضور! میں نے ہر ضرب پر پتھر سے ایک روشنی نکلتے دیکھی ہے۔ فرمایا کہ کیا واقعی تم نے روشنی دیکھی ہے؟ عرض کیا جی حضور! حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو پہلی روشنی تھی اس میں خدا نے مجھے یمن اور کسریٰ کے محلات دکھائے اور جبرئیل امین نے مجھے کہا کہ آپ کی امت ان کو فتح کرے گی اور پھر جو دوسری مرتبہ روشنی نکلی ہے اس میں میں نے روم کے سرخ محلات کو دیکھا اور جبرئیل امین نے مجھے کہا کہ آپ کی امت ان شہروں کو بھی فتح کرے گی۔

منافقین مذاق اڑاتے تھے کہ کھانے کے لیے روٹی نہیں ہے، بچنے کے لیے خندقیں کھودی جارہی ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ روم اور کسریٰ فتح کریں گے کتنے تعجب کی بات ہے! لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم کو پورا یقین تھا کہ ایک وقت آئے گا کہ یہ فتوحات ہوں گی۔

بنو قریظہ کی عہد شکنی:

یہ محاصرہ ایک مہینے تک چلا۔ اب بتاؤ! یہ جنگ کتنی سخت تھی بندہ اندازہ نہیں کرسکتا۔ سردی کا مہینا، سخت تیز ہوا جو خیموں تک کو اکھاڑ دے اور سارے یہودی بھی قریش کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا بنو قریظہ جو مدینہ میں تھا ان کا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدہ تھا کہ کسی لڑائی میں ایک دوسرے کے خلاف دشمن کی مدد نہیں کریں گے۔ انہوں پہلے تو قریش کا ساتھ نہیں دیا لیکن قبیلہ بنو نضیر کا سردار حییّ بن اخطب ان کے پاس آیا۔ اس نے بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد سے کہا کہ تم ہمارے ساتھ ملو اور مسلمانوں کا خاتمہ کریں۔ بار بار یہی بات کرتا

رہا۔ کعب بن اسد اپنے قلعے میں سے جواب دیتا رہا کہ ہمارا معاہدہ ہے، ہم توڑ نہیں سکتے لیکن حییّ بن اخطب نے دلائل دے کر اس کو قائل کر لیا اور اپنے ساتھ ملا لیا۔ جب یہ اطلاع ملی تو اس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پریشانی ہوئی کہ یہ کیا ہوا؟ باہر سے احزاب ہیں اور مدینہ میں اس قبیلہ بنو قریظہ کی بغاوت۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابہ کرام پر شفقت:

اب محاصرہ لمبا ہو گیا۔ کھانے کا سامان کم ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مشقت بھی دیکھ رہے تھے تو صحابہ کی مشقت کے پیش نظر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں ایک تدبیر آئی کہ قبیلہ غطفان کے سردار عیینہ بن حصن نے یہودیوں کے کہنے پر ان مشرکین کا ساتھ اس لالچ میں دیا ہے کہ اسے خیبر کی کھجوریں ملیں گی، تو غطفان کے دو سرداروں کے پاس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قاصد بھیجا کہ تم ہمارے ساتھ معاہدہ کرو کہ تم ان مشرکین سے الگ ہو کر واپس چلے جاؤ گے تو ہم تمہیں مدینے کی کھجوروں کا ایک تہائی حصہ دیں گے۔

یہ گفتگو ابھی چل رہی تھی، اس قبیلہ کے سردار بھی راضی ہو چکے تھے لیکن ابھی معاہدہ پر دستخط نہیں ہوئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو قبیلہ اوس کے سردار تھے اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ جو قبیلہ خزرج کے سردار تھے ان کو بلایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے یہ صورتحال رکھی اور مشورہ لیا، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ نہیں فرمایا بلکہ معاملہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے پر چھوڑ دیا۔

جب ان سے کہا تو حضرت سعد بن معاذ نے کہا: یارسول اللہ! جب ہم نے کلمہ نہیں پڑھا تھا ہم نے انہیں ایک کھجور کبھی نہیں دی الا یہ کہ وہ ہمارے مہمان بن کر

آئیں تو ہم کھلاتے تھے یا یہ کہ وہ ہم سے خرید لیتے تھے، اب ہم نے کلمہ بھی پڑھا ہے اور سچے بھی ہیں اس لیے اب مصالحت کے لیے ان کو مدینے کی کھجور کا ایک تہائی حصہ دیں ہمیں اس مصالحت کی کوئی ضرورت نہیں، ہم اب ان کو اپنی تلواریں دیں گے! حضور! اگر آپ پر یہ وحی آئی ہے تو سر آنکھوں پر ہمیں قبول ہے، اگر آپ کی ذاتی رائے اور طبیعت کا فیصلہ ہے تب بھی قبول ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وحی بھی نہیں آئی اور طبیعت میری بھی قبول نہیں کرتی لیکن میں تمہاری مشقت دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا چاہ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ حضور! ہماری مشقت کو چھوڑ دیں ہم آپ کے ساتھ ہیں لیکن ان کو کھجور کا دانہ بھی نہیں دیں گے۔ چونکہ ابھی معاہدہ فائنل نہیں ہوا تھا اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ختم فرما دیا۔

حضرت سعد بن معاذ کا جذبہ ایمانی:

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ قبیلہ اوس کے سردار تھے۔ بنو حارثہ کا قلعہ تھا جہاں پر مستورات کو محفوظ کیا ہوا تھا۔ حضرت سعد بن معاذ وہاں اپنی والدہ کے پاس گئے۔ امی عائشہ رضی اللہ عنہا بھی وہاں پر تھیں۔ ابھی پردے کا حکم نازل نہیں تھا امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے دیکھا کہ ان کی زرہ چھوٹی سی تھی تو میں نے ان کی والدہ سے کہا کہ ان کو ذِرہ بڑی دو تاکہ ان کو زخم نہ لگے۔ ان کی والدہ کہنے لگیں کہ کوئی مسئلہ نہیں، جو اللہ کو منظور ہو وہ ہو کر رہتا ہے۔ خیر حضرت سعد بن معاذ جب لشکر میں آئے تو ان کو بازو میں تیر لگا جس سے خون بہنے لگا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ یا اللہ! میری دو خواہشیں ہیں؛ ایک تو یہ ہے کہ اگر آئندہ قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی حملہ کرنا ہے تو اس وقت تک مجھے زندہ رکھ تاکہ میں ان کا مقابلہ کروں جنہوں نے حضور کو ستایا ہے، آپ کو ہجرت پر مجبور کیا ہے، آپ کو تکلیفیں دی ہیں، ایذائیں پہنچائی ہیں اور اگر آئندہ کوئی

ایسا سلسلہ نہ ہو تو مجھے شہادت کی موت عطا فرما اور میری دوسری خواہش یہ ہے کہ قبیلہ بنو قریظہ نے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدعہدی کی ہے تو میں جب تک ان کا انجام نہ دیکھ لوں مجھ پر موت نہ آئے، یہ دو میری خواہشیں ہیں۔ اللہ نے ان کی دونوں دعاؤں کو قبول فرمالیا۔

حضرت نعیم بن مسعود کا ایمان اور جنگی تدبیر:

اب ہوا یوں کہ قبیلہ غطفان جو احزاب میں ایک بڑی طاقت کا حامل قبیلہ تھا اس قبیلہ کے ایک فرد نعیم بن مسعود مسلمان ہوئے اور مدینہ منورہ آ گئے، انہوں نے کہا کہ حضور! میں نے کلمہ پڑھا ہے میرے ذمہ آپ خدمت لگائیں میں کیا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم تنہا کیا کر سکتے ہو! واپس جاؤ اور جتنا ممکن ہو سکے اسلام سے مدافعت کا کام کرو! اب اس صحابی کا ذوق دیکھو! انہوں نے کہا کہ حضور! آپ مجھے اجازت دیں کہ اگر میں وہاں جا کر جو مصلحت دیکھوں اس کے مطابق کچھ کرنا چاہوں تو کر سکوں! فرمایا: کرو تمہیں اجازت ہے۔

یہ سیدھا بنو قریظہ کے پاس گئے۔ ان کو جا کر کہا کہ تم مجھے جانتے ہو کہ میں تمہارا پرانا دوست ہوں! کہا کہ جی جانتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ قریش تو مکہ چلے جائیں گے، ہم قبیلہ غطفان والے بھی چلے جائیں گے، یہودیوں کے دوسرے قبائل بھی شکست ہوئی تو اپنے اپنے وطن واپس لوٹ جائیں گے اور تم تو مدینہ میں رہتے ہو، تمہارا مال اور تمہاری عورتیں تو یہیں مدینہ میں ہیں، اگر فتح مسلمانوں کو مل گئی تو تمہارا کیا بنے گا؟ بنو قریظہ نے کہا کہ بات تو ٹھیک ہے۔ انہوں نے کہا کہ پھر میں تمہیں خیر خواہانہ مشورہ دیتا ہوں کہ تم قبیلہ غطفان سے اور قریش سے معاہدہ کرو کہ وہ اپنے پچاس سردار تمہارے پاس بطور گروی رکھیں کہ اگر تمہیں شکست ہوئی اور انہوں نے تمہارا ساتھ دیا ہو گا تو تم ان کے سردار ان کو واپس کر دو گے اور اگر ساتھ نہ دیا تو تم ان کے

سرداروں کو قتل کروگے۔ انہوں نے کہا کہ بات تمہاری بہت اچھی ہے، ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔

وہ صحابی ان سے بات کرنے کے بعد سیدھے ابوسفیان کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ اے ابوسفیان! جس بنو قریظہ پر تم نے اعتماد کیا ہے وہ تمہارے نہیں ہیں، انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں ہیں؟! کہا کہ وہ تم سے معاہدہ کرنے کے بعد اپنے فیصلے پر بڑے نادم ہیں اور پریشان ہیں، انہوں نے اندرونِ خانہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشکش کی ہے کہ ہم قریش اور غطفان کے چند سردار تمہارے حوالے کریں گے تم ان کو قتل کردینا۔ پھر ہم آپ کے ساتھ مل کر ان سب سے جنگ کریں گے۔ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس شرط کو قبول کرلیا ہے۔ اب آپ قریش جو فیصلہ کریں سوچ سمجھ کر کریں۔

پھر یہ صحابی اپنے قبیلہ غطفان کے پاس گئے، ان کو جاکر کہا کہ قبیلہ بنو قریظہ تمہارے ساتھ نہیں ہے، تم تو باہر سے آئے ہو اور وہ مدینہ شہر میں رہتے ہیں، جن پر تم نے اعتماد کیا ہے کہ مشکل وقت میں ساتھ دیں گے وہ تمہارا ساتھ نہیں دیں گے، انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کیا ہے تمہارے پچاس سردار لیں گے، ان کے حوالے کریں گے اور وہ انہیں قتل کریں گے، اس طرح تم دوڑ جاؤ گے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا مسلمانوں سے معاہدہ ہے، بنو قریظہ اوپر سے تو تمہارے ساتھ ہیں لیکن اندر سے مسلمانوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بات تو تمہاری ٹھیک لگتی ہے۔

ابوسفیان نے کہا: اب دیکھیں کہ نعیم بن مسعود کی بات غلط ہے یا ٹھیک ہے؟ تو ابوسفیان نے دو آدمی بنو قریظہ کے پاس بھیجے، قریش کی طرف سے عکرمہ بن ابی جہل کو اور بنو غطفان کی طرف سے ورقہ بن غطفان کو اور یہ پیغام دیا کہ کافی دن گزر گئے ہیں ہمارے پاس خوراک کم ہوگئی ہے، ہمیں تمہاری خوراک کی ضرورت ہے، کافی دن ہو

گئے ہیں تیر اندازی دونوں طرف سے ہو رہی ہے اسلحہ کم ہے ہمیں تمہارے اسلحہ کی ضرورت ہے، تم نے ہمارے ساتھ معاہدہ کیا تھالہٰذا اسلحہ بھیجو اور جنگ میں شرکت کرو ہمارا ساتھ دو۔

جب انہوں نے بندے بھیجے تو بنو قریظہ نے کہا کہ ہم جنگ میں شرکت کریں گے لیکن ہماری ایک شرط ہے کہ تم پچاس سردار ہمارے پاس گروی رکھو ہم پھر تمہارے ساتھ چلیں گے، اگر تم چلے گئے تو ہمارا کیا بنے گا؟ اگر مسلمانوں کو فتح ہوئی تو تم ہمارا ساتھ دو گے اس لیے پچاس سردار بطور گروی ہمارے پاس رکھو۔ ابو سفیان نے کہا کہ نعیم بن مسعود ٹھیک کہتا تھا، ہم نے ان پر بھروسہ کیا لیکن یہ ہمارے مخالف ہو گئے۔ اس سے ان کا دل ٹوٹ گیا کہ اب اندر کے لوگ بھی مخالف ہو گئے ہیں۔ ابو سفیان نے بھی پیغام بھجوا دیا کہ تم نے ساتھ دینا ہے تو دو لیکن ہم اپنے سردار تمہارے پاس گروی نہیں رکھیں گے۔ اس سے بنو قریظہ نے بھی کہا کہ واقعی نعیم بن مسعود نے ہم سے ٹھیک بات کہی تھی۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا دشمن کی خبر لانا:

اندازہ کرنا کہ یہ کس قدر مشقت کا معاملہ تھا! ادھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت نماز پڑھی اور فرمایا کہ تم میں سے کون ہے جو ابو سفیان کے قافلے میں جائے اور آکر مجھے حالات بتائے۔ ایک شخص بھی کھڑا نہیں ہوا۔ حالات کی کتنی سختی ہو گی! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر نماز شروع کر دی، دو رکعات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر پوچھا کہ تم میں سے کون ہے جو اس لشکر کی خبر لائے گا۔ ایک بھی کھڑا نہیں ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر نماز شروع کر دی۔ پھر سلام پھیرا اور پوچھا کہ کون خبر لائے گا؟ صحابہ پھر خاموش ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم جاؤ! حضرت حذیفہ کھڑے ہو

گئے کیونکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا۔

سردی بہت سخت تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے کچھ دعا فرمائی، اپنا ہاتھ مبارک ان کے سر اور چہرے پر پھیرا اور ان کو رخصت کیا تو فرمایا کہ تم نے یہاں سے لے کر وہاں جانے تک پھر واپس میرے پاس آنے تک کام کچھ نہیں کرنا صرف تم نے مجھے خبر لا کر دینی ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں وہاں سے اٹھا تو میں اس طرح چل رہا تھا کہ جیسے کوئی بندہ گرم حمام میں چل رہا ہو، آج کے دور میں ایسے سمجھو جیسے ہیٹر لگا لیا جائے تو گرمائش محسوس ہوتی ہے۔ ایسے بدن گرم ہو گیا کہ ٹھنڈک اور سردی کا احساس ہی ختم ہو گیا۔ دل سے خوف بھی ختم ہو گیا اور دشمن کا رعب بھی ختم ہو گیا۔ حضرت حذیفہ رات کو جہاں مشرکین کے خیمے تھے وہاں چلے گئے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابوسفیان میرے نشانے پر تھا، میں تیر مارتا تو وہ قتل ہو جاتا لیکن مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات یاد آگئی کہ تو نے کرنا کچھ نہیں ہے بس مجھے آکر اطلاع دینی ہے، اس لیے میں نے اپنے تیر کو روک دیا۔ کہتے ہیں کہ وہاں سب آگ سینک رہے تھے تو میں بھی جا کر وہاں ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ حالات چونکہ سخت تھے کہ ہوا سے خیمے اکھڑ گئے تھے، ان کی ہانڈیاں الٹ گئی تھیں تو ابوسفیان چاہتا تھا کہ واپسی کا اعلان کریں اس لیے اس نے خاص ذمہ داروں سے بات کرنا چاہی۔

سب بیٹھے تھے تو انہوں نے کہا کہ ہمارا راز کہیں فاش نہ ہو جائے اس لیے جو بندے بیٹھے ہیں ہر بندہ ساتھ والے سے پوچھے کہ تو کون ہے؟ حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ میں بہت پریشان ہو گیا کہ مجھ سے پوچھا تو میں تعارف کیا کراؤں گا؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے ذہن میں ایک بات آئی کہ جو میرے ساتھ بیٹھا

ہوا تھا میں نے پہل کی اور اس سے پوچھ لیا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا میں فلاں بن فلاں ہوں۔ قبیلہ ہوازن کا کوئی آدمی تھا۔ جب اس نے بتایا تو میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، مجھے اب تسلی ہے کہ بندے اپنے ہی ہیں۔ اس نے ان سے پوچھا ہی نہیں۔

اب ابوسفیان نے کہا کہ حالات بہت خراب ہیں، ہمارے پاس کمک بھی نہیں ہے، بنو قریظہ نے ہمارے ساتھ غداری کی ہے، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ یہاں سے نکلو! یوں پورے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی اور سب جانے کی تیاری کرنے لگے۔ حضرت حذیفہ رات ہی کو واپس آئے اور آکر خبر دی کہ یارسول اللہ! وہ جارہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنے مسکرائے کہ حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ رات کی تاریکی میں مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دانت مبارک نظر آنے لگے۔ جب انہوں نے خبر دی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَلْآنَ نَغْزُوْهُمْ وَلَا يَغْزُوْنَنَا نَحْنُ نَسِيْرُ إِلَيْهِمْ"[135] اب مشرکین ہم پر حملہ نہیں کریں گے، جب بھی ہو گا ہم ہی حملہ کریں گے اور ان کے ملک پر چڑھائی کریں گے۔ یعنی یہ آخری معرکہ تھا جو ختم ہو گیا، اس کے بعد ہمارے اوپر کوئی حملہ نہیں کر سکتا۔

غزوہ بنو قریظہ:

خیر مشرکین چلے گئے، مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ ابھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام مدینہ پہنچے ہی تھے کہ جبرائیل امین حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں تشریف لائے، انہوں نے کہا کہ یارسول اللہ! آپ لوگوں نے ہتھیار اتار دیے ہیں لیکن ہم فرشتوں نے نہیں اتارے، ابھی بنو قریظہ کی طرف چلیں اور ان کی خبر لیں۔ جبرائیل امین نے کہا کہ میں آپ سے پہلے جارہا ہوں آپ بھی آجائیں اور

135۔ صحیح البخاری، رقم:4110

ہتھیار لے کر آئیں۔ جب مسلمان وہاں پہنچے تو بنو قریظہ نے خود کو قلعہ میں بند کر لیا۔ مسلمانوں نے اس قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ بنو قریظہ کا سردار تھا کعب بن اسد، اس نے اپنے قبیلے والوں سے کہا کہ تین باتوں میں تم کو اختیار ہے:

نمبر1: تم سب کو معلوم ہے کہ مسلمان سچے ہیں قرآن سچا ہے اس لیے کلمہ پڑھ لو اور حضور کی غلامی میں آجاؤ! دنیا میں مال، اولاد بچا لوگے اور آخرت میں عذاب سے بچ جاؤ گے۔

نمبر2: اپنے بچوں اور عورتوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر و اور پھر ان سے لڑو ورنہ تمہارے بعد ان کا حشر بہت برا ہو گا۔

نمبر3: یوم السبت یعنی ہفتے کے دن مسلمانوں پر حملہ کر دو کیونکہ مسلمان سمجھتے ہیں کہ یہ دن ہمارے نزدیک بڑا مقدس دن ہے اور ہم اس دن مسلمانوں پر حملہ نہیں کریں گے۔ اس دن یہ لوگ بے خبر ہوں گے تو تم اسی دن بے خبری میں ان پر حملہ کر دو اور مسلمانوں پر فتح حاصل کر لو۔

اس کی قوم نے کہا کہ کلمہ تو ہم کبھی نہیں پڑھیں گے، تورات تو ہم چھوڑ نہیں سکتے۔ بچے اور عورتیں ذبح کرنا یہ ہمارے بس میں نہیں ہے اور ہفتے والے دن ان پر حملہ کریں تو یہ ہماری شریعت کے خلاف ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے تمہیں تین آپشن دیے ہیں باقی تمہاری مرضی ہے۔ بالآخر سب اس پر متفق ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں، جو فیصلہ حضور کریں گے وہی قبول ہو گا۔

انصار صحابہ میں سے جو اوس قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے ان کا بنو قریظہ کے ساتھ کسی زمانے میں معاہدہ رہا تھا تو ان انصار صحابہ نے کہا کہ بنو قریظہ کا معاملہ ہمارے حوالے کر دیں۔ بنو قریظہ کا بھی خیال تھا کہ اوس سے ہمارے پرانے تعلقات ہیں وہ ہمارے حق میں کوئی نرم فیصلہ کریں گے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

میں اس کا فیصلہ تمہارے ہی ایک سردار کے سپرد کر دوں تو کیا تم راضی ہو؟ ان صحابہ نے کہا جی ہاں ہم راضی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا۔ اس بات پر سب راضی ہو گئے۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ قبیلہ اوس کے سردار تھے، زخمی تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے مسجد نبوی میں خیمہ لگوا دیا تھا تاکہ لوگ وہاں آ کر ان کی تیمارداری کریں۔ فیصلہ ان کے سپرد ہوا تو حضرت سعد نے عجیب فیصلہ کیا۔ فرمایا کہ ان کے جو مرد لڑنے کے قابل ہیں سارے ذبح کر دیے جائیں، ان کی عورتوں اور بچوں کو باندیاں اور غلام بنالیا جائے اور ان کا سارا مال بطور غنیمت کے مسلمانوں کے حوالے کیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب تو سعد کا فیصلہ ہے، اسی پر عمل ہوا کہ بچے اور عورتیں باندیاں اور غلام بن گئے اور جوان سارے ذبح ہو گئے اور جتنا مال تھا وہ مسلمانوں کے حوالے ہو گیا جس طرح مال غنیمت جمع ہوتا ہے۔

احسان کا بدلہ احسان:

ایک صحابی تھے حضرت ثابت بن شماس بن قیس رضی اللہ عنہ۔ زمانہ جاہلیت میں ایک جنگ ہوئی تھی جنگ بعاث اس میں حضرت ثابت بن شماس قید ہو کر بنو قریظہ کے ایک آدمی زبیر بن باطا کے قبضے میں آ گئے تھے۔ زبیر بن باطا نے ان کا سر مونڈ کر ان کو چھوڑ دیا، آزاد کر دیا اور قتل نہیں کیا۔ اب ان کا جی چاہا کہ میں اس کے احسان کا بدلہ دوں! چنانچہ انہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں فلاں جنگ میں قیدی بنا تھا اس نے میرا سر مونڈ کر مجھے چھوڑ دیا تھا، مجھے قتل نہیں کیا تھا تو میرا جی چاہتا ہے کہ آپ اس کو آزاد فرما دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے آزاد فرما دیا۔ حضرت ثابت بن شماس نے اسے کہا کہ دیکھو تم نے مجھ پر احسان کیا تھا تو میں نے اس احسان کا بدلہ تمہیں دے دیا ہے۔ زبیر بن باطا نے کہا کہ اس زندگی کا

کیا فائدہ جس میں بیوی اور بچے میرے ساتھ نہ ہوں۔ وہ صحابی پھر گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی بیوی اور بچے آزاد کرنے کی درخواست کی۔ فرمایا کہ اس کی بیوی اور بچے بھی آزاد ہیں۔ اس نے کہا کہ میں نے وہاں کیا جینا ہے جہاں میرا مال بھی میرے پاس نہ ہو۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے، فرمایا کہ اس کا مال بھی اس کو دے دو۔ یوں اس شخص کو اس کے احسان کا پورا پورا بدلہ دیا گیا۔

ایک کافر کی قومی حمیت:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ایک مسلمان کی شرافت اور احسان شناسی ہے کہ احسان کا بدلہ احسان سے دیا۔ اب اس کافر کی غیرت کو بھی دیکھو! اس کافر نے کہا کہ ہمارے یہودیوں کے سردار ابن ابی الحُقَیق کہاں ہیں؟ بتایا گیا کہ وہ قتل ہو گیا ہے۔ اس نے پوچھا کہ بنو قریظہ کے سردار کعب بن قریظہ اور عمرو بن قریظہ کا کیا بنا؟ کہا کہ وہ بھی قتل ہو گئے ہیں۔ پھر اس نے دو جماعتوں کے متعلق پوچھا تو ان کے بارے میں بھی یہی بتایا گیا کہ وہ بھی قتل ہو گئے ہیں۔ یہ سن کر زبیر بن باطا نے کہا کہ جب سارے قتل ہو گئے ہیں تو میرے زندہ رہنے کا کیا فائدہ! مجھے بھی قتل کرو! حضرت ثابت بن شماس نے کہا کہ میں تو تمہیں اپنے ہاتھ سے نہیں مار سکتا۔ کہتا ہے کہ تم نہیں مار سکتے تو کسی اور سے کہو کہ مجھے قتل کرے، میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ تو کسی اور صحابی نے اس کو قتل کر دیا۔ اب دیکھو! یہ اس کافر کی غیرت تھی جس نے اپنوں کے ساتھ مرنا تو گوارا کیا لیکن غیر کے پاس زندہ رہنا گوارا نہیں کیا۔

اللہ ہم سب کو دین اور مذہب کی غیرت عطا فرمائے۔ بہر حال یہ غزوہ احزاب کا پورا خلاصہ تھا جو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔

کفار و منافقین کی بات نہ مانیں!

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ﴿۱﴾ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ﴿۲﴾

ہجرت مدینہ کے بعد مکہ مکرمہ کے کچھ مشرکین ولید بن مغیرہ اور شیبہ بن ربیعہ مدینہ منورہ آئے اور انہوں نے آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ کمپرومائز کریں، آپ نے جو دعویٰ کیا ہے اس دعوے سے دستبردار ہو جائیں تو ہم قریش اپنی آدھی دولت آپ کو دیں گے۔ ادھر مدینہ کے یہود نے بھی کہا کہ اگر آپ اپنے دعوے اور اسلام کی دعوت سے باز نہ آئے تو ہم آپ کو قتل کر دیں گے۔ تو اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

بعض روایات میں ہے کہ جب حدیبیہ والا واقعہ ہو چکا تھا، مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ اب ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہیں کریں گے۔ اس زمانے میں مکہ مکرمہ سے ابوسفیان، عکرمہ بن ابی جہل اور ابو الاعور سلمی یہ مدینہ منورہ آئے اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ایک تو آپ ہمارے معبودوں کی برائی کرنا چھوڑ دیں اور دوسرا آپ صرف یہ کہہ دیں کہ یہ بھی نفع پہنچاتے ہیں شفاعت کرتے ہیں، بس اتنا کرلیں تو ہم آپ کو بھی کچھ نہیں کہیں گے اور آپ کے رب کو بھی چھوڑ دیں گے! ان کی یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو بہت بری لگی تو بعض صحابہ کرام کا ذہن بنا کہ ان کو قتل کر دینا چاہیے کہ انہیں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ بات کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ لیکن چونکہ حدیبیہ میں معاہدہ ہو چکا تھا اس معاہدے کی وجہ سے قتل نہیں کر سکتے تھے تو قرآن کریم نے کہا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ﴿۱﴾﴾

یہاں خطاب اگرچہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن سنایا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو جارہاہے۔اے نبی! اللہ سے ڈرو۔کیا مطلب کہ یہ جو تم نے ان کو مارنے کا ارادہ کیاہے اس کو ختم کرو۔﴿وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ﴾ کفار اور منافقین کی بات کبھی نہ مانو! کفار جو مکہ سے آئے تھے یا مدینہ کے یہودی تھے اور آپ کو پیشکش کررہے تھے تو ان کی بات ہرگز نہ مانیں اور بعض لوگ جو مدینہ کے ہیں اور اوپر سے مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں لیکن اندر سے کافر ہیں یعنی منافق لوگ تو ان کی بات بھی نہ مانیں،﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والے حکمت والے ہیں۔

اور اگر یہ خطاب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو اور سنایا بھی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو تو پھر اس کا معنی یہ ہے اللہ کے نبی! اللہ سے ڈرتے تو آپ پہلے بھی ہیں اور کفار کی اطاعت تو پہلے بھی نہیں کرتے تھے لیکن اس پر پختگی سے کاربند رہیں کہ گناہ بھی نہیں کرنا اور کفار کی بات کو ماننا بھی نہیں ہے۔

نام لے کر خدا نے پکارا نہیں:

قرآن کریم میں یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص اعزاز ہے کہ ان کا نام لے کر اللہ نے خطاب نہیں فرمایا، جب بھی خطاب کیا ہے تو کسی وصف سے کیا ہے، ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ﴾، ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ﴾، ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ﴾، ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ جبکہ باقی انبیاء علیہم السلام کا نام لے کر خطاب فرمایا ہے۔

تین باطل خیالات و رسوم کی تردید:

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ

قَوۡلُكُمۡ بِاَفۡوَاهِكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ يَقُوۡلُ الۡحَـقَّ وَهُوَ يَهۡدِى السَّبِيۡلَ ﴿۴﴾

عرب میں تین قباحتیں رائج تھیں اور ان میں تین غلط باتیں معروف تھیں۔
ان میں ایک یہ کہ جو سمجھ دار آدمی ہوتا اور بات کی تہہ تک پہنچتا تو لوگ اس کے بارے میں کہتے کہ اس کے دو دل ہیں۔ تو اللہ نے فرمایا: ﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنۡ قَلۡبَيۡنِ فِىۡ جَوۡفِهٖ﴾ کہ اللہ نے کسی آدمی کے پیٹ میں دو دل پیدا نہیں فرمائے، آدمی ایک ہوتا ہے تو اس کا دل بھی ایک ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں لوگ یہ تو نہیں کہتے کہ دل دو ہوتے ہیں لیکن باتیں ایسی کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو دل کا کہہ رہے ہیں جیسے میرا ایک دل کرتا ہے کہ آج پڑھ لوں اور ایک دل کرتا ہے کہ آج نہ پڑھوں! اس جملے سے ایسے لگتا ہے کہ اس کے دو دل ہیں حالانکہ دل تو ایک ہی ہوتا ہے، اس لیے اگر اس کے بجائے یہ کہہ دیا کریں کہ میرا ایک خیال ہے کہ پڑھ لوں اور ایک خیال آتا ہے کہ نہ پڑھوں، اب بات بالکل قرآن کریم کے مطابق ہو جائے گی۔

رسم ظِہار:

قرآن نے ایک تو اس رسم کی تردید کی ہے اور دوسری رسم جس کی تردید کی ہے وہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنی ماں کی پیٹھ کے ساتھ تشبیہ دے دیتا یا اپنے ماں کے کسی اور عضو کے ساتھ تشبیہ دے دیتا یعنی تو میرے لیے ایسے ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ، میری ماں کا پیٹ تو لوگ اس کو ہمیشہ کے لیے حقیقی ماں کی طرح حرام سمجھتے تھے۔ شریعت نے اس کی تردید کی ہے کہ ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہے، اس کو وہ بھی "ظِہَار" کہتے تھے اور شریعت بھی "ظِہَار" کہتی ہے۔ ظِہَار؛ ظَہر سے ہے، ظَہر پیٹھ کو کہتے ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جاتا کہ تیری پیٹھ میرے لیے ایسے ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ۔ شریعت نے اس رسم کو ختم کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسا کہنے سے بیوی حرام تو ہو جاتی ہے

لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ کچھ وقت کے لیے۔ اٹھائیسویں پارے کے شروع میں یہ مسئلہ بیان فرما دیا ہے، اس موقع پر تفصیل کے ساتھ آئے گا کہ اس کا کفارہ ادا کر دو، کفارہ ادا کرنے کے بعد بیوی اپنے شوہر کے لیے پھر حلال ہو جاتی ہے۔

یہاں ایک بات سمجھیں۔ محرَم یہ بہت قابل احترام رشتہ ہے۔ اگر اس کے عضو کے ساتھ بیوی کو تشبیہ دی ہے تو بیوی حرام ہوئی ہے۔ اب بیوی کے حرام ہونے کی وجہ سے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ جو ہماری ماں ہے اس کا احترام کم ہو گیا ہے، اس سے ماں کا احترام بڑھا ہے کم نہیں ہوا، اس سے بہن کا احترم بڑھا ہے کم نہیں ہوا یعنی ماں، بہن، بیٹی، پھوپھی اتنی احترام والی ہیں کہ اگر بیوی کو ماں یا بہن یا بیٹی یا پھوپی کہہ دیا تو بیوی حرام ہو جائے گی جب تک کفارہ ادا نہیں کریں گے اس کے پاس جانا حرام ہے۔ تو اس سے ماں اور بہن کی عزت بڑھی ہے یا کم ہوئی ہے؟ یقیناً بڑھی ہے۔

شاہ اسماعیل شہید پر اعتراض کا جواب:

اب اس سے اچھی طرح یہ بات سمجھیں کہ اہل بدعت نے اھل السنۃ و الجماعۃ احناف دیوبند پر جو اعتراضات کیے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور دورانِ نماز گدھے کا خیال آ جائے تو نماز نہیں ٹوٹتی اور اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال آ جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ اعتراض یوں کرتے ہیں لوگوں کو دیوبند سے نفرت دلانے کے لیے کہ دیکھو یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخ ہیں کہ گدھے کے خیال سے نماز نہیں ٹوٹتی اور حضور کا خیال آ جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔

یہ عبارت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی نہیں ہے، یہ عبارت تو سید احمد شہید کی ہے جس کو نقل شاہ محمد اسماعیل شہید نے فرمایا ہے۔ شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید رحمہما اللہ یہ بزرگ دار العلوم دیوبند بننے سے پہلے کے ہیں بعد کے نہیں ہے۔ اس

لیے یہ کہنا کہ دیوبندی بزرگوں نے لکھا ہے یہ بات بھی غلط ہے اور بعض لوگ نہیں سمجھتے تو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا نام لے کر کہتے ہیں کہ حضرت تھانوی نے لکھا ہے... حالانکہ عبارت حضرت تھانوی کی بھی نہیں ہے۔

اور تیسری بات یہ سمجھیں کہ یہ جو عبارت بیان کی جاتی ہے عبارت یوں نہیں ہے کہ اگر کسی کو دورانِ نماز گدھے کا خیال آ گیا تو نماز نہیں ٹوٹتی اور اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال آ گیا تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ یہ عبارت نقل بھی غلط ہوتی ہے۔

چوتھی بات... اس کی اصل عبارت سن لیں کہ عبارت وہاں پر کیا ہے کہ عبادت خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتی ہے، اس لیے ہر ایسے عمل سے بچنا چاہیے جہاں اللہ کے بجائے غیر اللہ کی عبادت کا شبہ ہو۔ اگر نماز کے دوران حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال آ جائے تو حضور اتنے عظمت والے ہیں کہ بندے کا دل نہیں کرتا کہ خیال وہاں سے ہٹے، بندہ خیال کو جما دیتا ہے، اب ظاہر ہے کہ نماز تو اللہ کے لیے ہے اللہ کے نبی کے لیے تو نہیں ہے، اس لیے وہاں خیال کو جمانا نہیں دینا چاہیے بلکہ ہٹا دینا چاہیے تاکہ نماز خالص اللہ پاک کے لیے ہو جائے۔

اب آپ نماز پڑھ رہے ہیں، نماز کے دوران خیال آ جاتا ہے مدینے کا، روضے کا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا، مدینہ کی گلیوں میں چلنے کا تو بندے کا ذہن وہاں متوجہ ہوتا ہے، ادب محبت عقیدت اتنی ہوتی ہے کہ دل نہیں کرتا کہ خیال وہاں سے بدلے حالانکہ خیال نہیں آنا چاہیے، نماز خالص اللہ کے لیے ہے اور اگر نماز کے دوران گدھے کا خیال آ جائے تو گدھا اتنا مکروہ اور ناپسند ہے کہ اس کی طرف بندے کا ذہن جائے بھی تو ذہن جھٹک کر واپس آ جاتا ہے۔ اب نماز کے دوران گدھے کے خیال آ جانے سے آدمی کا ذہن کسی اور یعنی مخلوق کی طرف نہیں جاتا لیکن اگر دورانِ نماز اللہ کے نبی کا خیال آ جائے تو آدمی جھٹک کر ادھر سے ذہن کو کھینچتا نہیں ہے بلکہ

ادھر ذہن رکھتا ہے۔ تو اب غیر اللہ؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق ہیں خالق تو نہیں ہیں تو نماز میں ذِہن ان کی طرف منتقل ہونا یہ مناسب نہیں ہے۔

سید احمد شہید نے یہ بات سمجھائی ہے کہ دورانِ نماز اگر گدھے کا خیال آ جائے تو ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوتا اور منتقل کرنے کو دل بھی نہیں کرتا، اس لیے بندہ فوراً ذہن بدل کے اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو یہ نقصان دہ کم ہے اور اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال آ جائے تو بندہ ذہن ادھر سے جھٹکتا نہیں ہے بلکہ ادھر متوجہ رکھتا ہے اور یہ اللہ کی عبادت میں زیادہ مخل ہوتا ہے، اس لیے گدھے کا خیال آنا اتنا مخل نہیں ہے جتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال کا آجانا نقصان دہ ہے۔ اس کی وجہ صرف عبادت ہے اور کوئی نہیں ہے۔

اب اس پر جو بندہ اعتراض کرتا ہے اس کو ایک تو ہم نے علمی انداز میں سمجھایا ہے اور ایک طرز یوں سمجھیں۔ جب کسی بندے کو تحقیقی انداز میں بات سمجھ نہ آئے تو اس کو الزامی طور پر بات سمجھاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اب ان اہلِ بدعت سے پوچھو کہ اگر تمہارے گھر میں کوئی جانور آ جائے کبھی تو آپ نے کہا کہ اماں جی! پردہ کرو جانور آ گیا؟ نہیں کہتے۔ باجی! پردہ کرو جانور آ گیا! نہیں کہتے اور اگر گھر میں تمہارا کوئی بزرگ آ جائے تو کہتے ہو جی! پردہ کرو بزرگ آ گئے۔ اب کوئی بندہ یہ کہے کہ کیا یہ بزرگ جانور سے بھی بد تر ہوا کہ اس کے آنے سے تو پردہ نہیں ٹوٹا لیکن اس کے آنے سے پردہ ٹوٹ گیا۔

وجہ یہ ہے کہ جانور کے آنے سے پردے کے احترام میں فرق نہیں پڑتا اور انسان اتنا معزز اور محترم ہے کہ اس کے آنے سے پردے کے احترام میں فرق پڑتا ہے۔ اب جانور کے آنے سے پردے کے احترام میں فرق نہ پڑنا یہ جانور کے اعلیٰ ہونے کی نہیں بلکہ گھٹیا ہونے کی دلیل ہے اور انسان کے آنے پر فرق پڑنا یہ انسان کے

گھٹیا نہیں اعلیٰ ہونے کی دلیل ہے۔ اسی طرح نماز میں گدھے کا خیال آئے تو یہ گدھے کے گھٹیا ہونے کی دلیل ہے کہ اس سے نماز میں فرق نہیں پڑتا اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال آنے سے نماز میں فرق پڑتا ہے یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ ہونے کی دلیل ہے۔

اب میں کفارۂ ظِہار کے حوالے سے مثال سمجھانے لگا ہوں کہ دیکھو! کوئی آدمی اپنی بیوی سے کہہ دے کہ تیری پیٹھ میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے تو بیوی حرام ہو گئی۔ اگر اس نے کہا کہ تیری پیٹھ گدھے کی پیٹھ کی طرح ہے تو حرام نہیں ہوئی۔ اس کا مطلب کہ ماں گدھے سے بھی گندی ہو گئی؟ (نہیں۔ سامعین) اس لیے کہ ماں کی وجہ سے تو بیوی حرام ہوتی ہے لیکن گدھے کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ اب اس کا مطلب کہ ماں گدھے سے بھی گئی گزری ہے؟! ہم کہتے ہیں کہ گئی گزری نہیں ہے، بیوی کو گدھی کہنے سے بیوی حرام نہیں ہوتی کیونکہ گدھی کسی کھاتے میں نہیں ہے اور بیوی کو ماں کہنے کی وجہ سے بیوی حرام ہوتی ہے کیونکہ ماں بہت بڑی عظمت والی چیز ہے۔ بات سمجھ آئی آپ کو؟ (جی ہاں۔ سامعین)

منہ بولا بیٹا بنانے کی تردید:

﴿وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ﴾

تیسری رسم ان میں یہ تھی کہ جب کسی کو متبنیٰ یعنی منہ بولا بیٹا بنا لیتے تھے تو اسے حقیقی بیٹے کی طرح سمجھتے تھے، وہ وراثت میں بھی شریک ہوتا جس طرح حقیقی بیٹا وارث بنتا ہے، اس متبنیٰ کی وفات کے بعد اس کی بیوہ سے اس کا باپ نکاح نہیں کر سکتا تھا اور اگر وہ متبنیٰ اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا تو اس کے بعد بھی اس کا باپ نکاح نہیں کر سکتا تھا اس لیے کہ وہ اس کی حقیقی بہو کی طرح شمار ہوتی تھی۔ تمام معاملات حقیقی بیٹوں کی طرح تھے۔ شریعت نے اس رسم کی تردید کی ہے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا قصہ:

لوگ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو زید بن محمد کہتے تھے حالانکہ وہ زید بن محمد نہیں تھے بلکہ زید بن حارثہ تھے، تو اس آیت کے اترنے کے بعد حضرت زید کو زید بن محمد کے بجائے زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔ حضرت زید کو کافروں نے ڈاکہ مار کر چرایا اور مکہ میں لا کر فروخت کر دیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے انہیں خریدا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ہدیہ پیش کر دیا۔ ان کے رشتے دار تلاش کرتے ہوئے مکہ پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا کہ یہ ہمارا بیٹا ہے، اس کی والدہ پریشان ہے، ہم اس کو لے جانا چاہتے ہیں، لہٰذا آپ جتنا پیسہ لینا چاہتے ہیں لے لیں اور ہمارا بیٹا واپس کر دیں۔ تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں بغیر پیسوں کے بھیج دوں گا لیکن آپ خود زید سے پوچھ لیں۔

حضرت زید سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: میں جانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ تو یہاں رہے گا تو غلامی اختیار کرے گا۔ حضرت زید نے کہا: میں آزادی سے اس غلامی کو ترجیح دیتا ہوں، میں نہیں جاؤں گا، مجھے اس غلامی پر فخر ہے۔ تو اس کے بعد حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد فرما دیا اور منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ چونکہ حضرت زید نے اپنے حقیقی باپ کو چھوڑا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سر پر باپ والا ہاتھ رکھا تھا۔ اب مکہ میں "زید بن محمد" مشہور ہو گیا۔ تو ان آیات کے نزول کے بعد انہیں زید بن محمد کے بجائے زید بن حارثہ کہا جانے گا۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بھی افسوس تھا کہ کہاں "زید بن محمد" اور کہاں "زید بن حارثہ" تو اللہ رب العزت نے ان کے اس دکھ کا ازالہ قرآن کریم میں ان کا نام "زید" لے کر فرمایا: ﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا﴾ حضرت زید کا ذکر ان کے نام سے قرآن میں کیا۔ اس کی ایک وجہ مفسرین نے یہ لکھی ہے کہ جو ان کو دکھ ہوا تھا

تو اس کا ازالہ اس سے کر دیا گیا۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد صحابہ کرام میں سے بڑے سے بڑے صحابی کا نام قرآن میں نہیں ہے اور حضرت زید کا نام قرآن کریم میں ہے۔ بطور قرآن ان کا نام لیں تو تیس نیکیاں ملتی ہیں۔ رضی اللہ عنہ، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہمیشہ بہت اعزاز بخشا ہے۔ ام المؤمنین امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت زید کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی کسی جہاد کے قافلے پر بھیجا ہے تو امیر بنا کر بھیجا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک اعزاز تھا، مامور بنا کر آپ ان کو کبھی نہیں بھیجتے تھے۔

کسی کو بیٹا یا بیٹی بنانے کا حکم:

﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾

متبنیٰ کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اس کو اس کے باپ کے نام سے پکارو!

اب یہ مسئلہ ذہن نشین فرمالیں۔ ہمارے ہاں کسی لڑکے کو یا لڑکی کو بیٹا یا بیٹی بنالیں تو جب ان کا نام لکھتے ہیں تو جو حقیقی باپ ہے اس کا نام نہیں لکھتے حالانکہ حقیقی باپ کا نام لکھنا یونین کونسل میں ضروری ہے، نکاح نامہ میں جب کوائف لکھتے ہیں تو اس میں بیٹی کا حقیقی باپ نہیں لکھتے بلکہ جس نے بیٹی بنایا ہے اس کا نام لکھتے ہیں حالانکہ حقیقی باپ کا نام لکھنا ضروری ہے۔ اور وراثت، پردہ وغیرہ تمام احکام میں بھی حقیقی ماں باپ کا اعتبار ہوگا، جنہوں نے لے کر پالا ہے ان کا نہیں۔

رسول خدا عزیز از جان:

﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤی اَوْلِیٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ

مَسْطُوْرًا ﴿٦﴾

یہ فرمایا کہ پیغمبر کی ذات مؤمنین کو ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ محبوب ہے اور پیغمبر کی بیویاں مومنین کی مائیں ہیں۔

یہ مسئلہ اچھے طریقے سے سمجھیں کہ پیغمبر مؤمنین کے لیے مؤمنین کی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ پیغمبر کی بیویاں مؤمنین کی مائیں ہیں تو اس سے یہ مسئلہ خود بخود سمجھ میں آ گیا کہ پیغمبر امت کے باپ ہیں۔ اس سے ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں امت کی مائیں ہیں تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم امت کے باپ ہوئے۔ اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ امتی سارے آپس میں بہن بھائیوں کی طرح ہیں، تو پھر نکاح کا مسئلہ کیا ہوگا؟ پھر ان کی وراثت کا مسئلہ کیا ہوگا؟ تو اس شبہ کو ﴿وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ سے دور کیا کہ پیغمبر اور امت کا یہ رشتہ جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہے، جو تمہارے جسمانی رشتہ دار ہیں وراثت میں وہ تمہارے حق دار زیادہ ہیں ان کو وراثت دو! یعنی ایک بھائی روحانی بھائی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہونے کی وجہ سے اور ایک آپ کا حقیقی بھائی ہے آپ کے ماں اور باپ شریک ہونے کی وجہ سے، اب یہ جو روحانی بھائی ہے مالی معاملات میں زیادہ حق اس کا نہیں ہے بلکہ مالی معاملات میں زیادہ حق اس کا ہے جو آپ کا جسمانی اور خونی بھائی ہے۔ اس شبہ کو اس سے دور کر دیا۔

نبی کی بیوی سے نکاح کی حرمت منصوص:

یہاں ایک بات اور سمجھیں! یہ جو فرمایا: ﴿وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ﴾ کہ پیغمبر کی بیویاں یہ امت کی مائیں ہیں۔ پیغمبر کی بیوی کے ساتھ امتی کے نکاح کا حرام ہونا اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کے

ساتھ امتی کا نکاح حرام ہے اس حرمت کی دلیل قرآن کریم کی دوسری آیت میں صراحتاً موجود ہے ﴿وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا﴾ کہ پیغمبر کی بیوی سے امتی کبھی بھی نکاح نہیں کر سکتا۔ یہ مسئلہ ذرا سمجھ لینا! پیغمبر کی بیوی سے امتی کا نکاح حرام ہے اور اس آیت ﴿وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ﴾ کو نبی کی بیوی کے ساتھ امتی کے نکاح کے حرام ہونے پر بطور دلیل کے کبھی بھی پیش نہ کرنا۔

"پیغمبر کی بیوی سے امتی کا نکاح کیوں حرام ہے؟" ہم نے کہا کہ خود اللہ نے حرام قرار دیا ہے ﴿وَ لَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا﴾ اس لیے حرام ہے۔ اب دیکھو! ماں سے نکاح کیوں حرام ہے؟ پھوپی سے نکاح کیوں حرام ہے؟ بہن سے نکاح کیوں حرام ہے؟ بیٹی سے نکاح کیوں حرام ہے؟ اس لیے کہ اللہ نے جو محرمات بتا دیے ہیں بس وہ محرمات ہیں۔ اسی طرح اللہ نے بتا دیا ہے کہ پیغمبر کی بیوی امت کے لیے حرام ہے تو بس حرام ہے۔ نکاح حرام ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ﴿وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ﴾ کہ پیغمبر کی بیویاں امت کی مائیں ہیں، کیونکہ اگر پیغمبر کی بیوی امت کی ماں ہے اور اس وجہ سے نکاح جائز نہیں تو خود پیغمبر امت کے باپ ہیں تو پھر نبی کا نکاح بھی کسی امتی کی لڑکی کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے لیکن پیغمبر باپ ہونے کے باوجود امتی لڑکی سے نکاح کر رہے ہیں تو پھر پیغمبر کی بیوی ماں ہو اور امت کا نکاح نہ ہو... حرمت کی یہ وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

اس لیے جب مسئلہ حیات اپنی جگہ پر آئے گا تو وہاں پر میں یہ بات سمجھاؤں گا اور یہ دلیل آپ کے ذہن میں ہو گی تو بات سمجھنی بہت آسان ہو گی۔ اب دیکھو! استاد کی بیوی شاگرد کی روحانی ماں ہے لیکن شاگرد نکاح کر سکتا ہے استاد کے فوت

ہونے پر استاد کے طلاق دینے پر، مرشد کی بیوی یہ مرید کی ماں ہے لیکن روحانی ہے اس کے فوت ہونے پر طلاق ہونے پر مرید نکاح کر سکتا ہے۔ پیغمبر کی بیوی روحانی ماں ہے لیکن پیغمبر کی وفات کے بعد بھی امتی نکاح نہیں کر سکتا تو معلوم ہوا کہ اس کی وجہ روحانی ماں ہونا نہیں ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ اللہ نے اس سے نکاح حرام قرار دے دیا ہے اور بس۔

انبیاء علیہم السلام سے عہد:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ ۪ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا ۟ۙ۷﴾

عام مفسرین کی رائے ہے کہ یہ میثاق؛ عالمِ ارواح میں لیا گیا تھا۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ ہم نے تمام انبیاء سے عہد لیا تھا اور اے حضور! آپ سے بھی عہد لیا، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہم السلام سے بھی لیا اور ہم نے ان سے مضبوط عہد لیا کہ دنیا میں جاؤ گے اور تبلیغ احکام کرو گے۔

﴿لِّیَسْـَٔلَ الصّٰدِقِیْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا اَلِیْمًا ۟۸﴾

تاکہ اللہ سچوں سے ان کی سچائی کے بارے میں پوچھے اور ہم نے کافروں کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ہم نے آپ سے وعدہ لیا تھا کہ آپ نے کام کرنا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کام کیا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پوچھیں گے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہیں گے کہ جی ہاں اے اللہ! جو میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا میں نے اس کے مطابق تبلیغ کی ہے۔ یہاں فرمایا: ﴿مِنَ النَّبِیّٖنَ﴾ کہ ہم نے تمام انبیاء سے عہد لیا اور ان پانچ کا بطور خاص اللہ نے الگ ذکر فرمایا؛ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم،

حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام ان کے اعزاز اور اکرام کی بنیاد پر کہ یہ حضرات تمام انبیاء میں سب سے زیادہ اولو العزم اور مرتبے والے انبیاء ہیں۔

نبی؛روح مع الجسد کا نام ہے:

یہاں دیکھیں!عالمِ ارواح میں وعدہ ہے اور عالمِ ارواح میں اللہ تعالی نے ان انبیاء کی روحوں کو نبی فرمایا یعنی روحوں کو ﴿مِنَ النَّبِيّٖنَ﴾ کہا۔

وہ لوگ جو قبور میں انبیاء کی حیات کے منکر ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم انکار نہیں کرتے ہم بھی کہتے ہیں کہ نبی زندہ ہے لیکن فرق کیا ہے؟ تم کہتے ہو کہ نبی کا جسم زندہ ہے اور ہم کہتے ہیں کہ نبی کی روح زندہ ہے اور وصفِ نبوت یہ روح کی صفت ہے، وصفِ رسالت یہ روح کی صفت ہے جسم کی نہیں ہے۔ دلیل یہ ہے ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ﴾ عالمِ ارواح تھا وہاں اجسام نہیں تھے صرف ارواح تھیں اور اللہ نے ارواحِ انبیاء کو "النبیین" فرمایا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی؛روح ہوتی ہے، نبی؛ جسم نہیں ہوتا۔ تو جب وفات آئی ہے تو ہم نے وفات کے بعد بھی روح کو زندہ مانا ہے تو ہم تو وفات کے بعد نبی کو زندہ مانتے ہیں لیکن اس قبر میں جسم ہے روح نہیں ہے، روح اعلیٰ علیین میں ہے۔ لہذا نبی زندہ ہے اور اعلیٰ علیین میں زندہ ہے۔

اب دیکھیں! بظاہر کتنا عجیب شبہ ہے، بندہ سمجھتا ہے کہ بڑی مضبوط بات ہے۔ اس طرح یہ لوگ کہتے ہیں کہ حدیث پاک میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كُنْتُ نَبِيًّا وَآدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّيْنِ.[136]

حضرت آدم علیہ السلام کا جسم ابھی مٹی اور گارے کے درمیان تھا میں تب

136۔ مرقاۃ المفاتیح: ج10 ص439

بھی نبی تھا۔ اس وقت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم نہیں بنا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیسے نبی تھے؟ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کو اللہ نے نبی فرمایا۔ تو یہ وصفِ نبوت روح کے لیے ہے، وصفِ رسالت روح کے لیے ہے، جسم کے لیے نہیں ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ نبی؛ روح اور جسم کے مجموعے کو کہتے ہیں، اس پر دلیل ﴿اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ﴾ ہے، پیغمبر کی ذات مؤمنین کے لیے ان کی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ تو مؤمنین نے جس پیغمبر کی ذات کو اپنی جانوں سے عزیز مانا وہ پیغمبر پاک کا جسم بھی تھا یا صرف روح تھی؟ جسم مع الروح تھا۔ آگے ہے ﴿وَاَزۡوَاجُہٗۤ اُمَّہٰتُہُمۡ﴾ یہ "ہ" ضمیر کا مرجع ﴿اَلنَّبِیُّ﴾ ہے یعنی اس نبی کی بیویاں امت کی مائیں ہیں۔ تو یہ جو بیویاں تھیں یہ جسم کی تھیں یا روح کی تھیں؟ جسم کی تھیں۔ تو قرآن تو خود بتا رہا ہے کہ وصفِ نبوت یہ پیغمبر کے جسم کے لیے ہے لیکن جسم بھی کون سا؟ جس میں روح ہو، وہ جسم نہیں جس میں روح نہیں ہے۔

توجہ سے بات سمجھنا! جب ہم کہتے ہیں کہ قبر میں جسم کو دفن کر دیا گیا تو یہ جسم نبی ہے۔ کیونکہ جسم کی نبوت تو قرآن سے ثابت ہو گئی نا ﴿اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ﴾ مؤمنین اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں نبی کو، وہ نبی کی روح تھی یا جسم تھا؟ (جسم تھا۔ سامعین) جس کے لیے جانیں دی جا رہی ہیں، صحابہ کٹ رہے ہیں، سب کچھ قربان ہو رہا ہے، جس کو بچانے کے لیے طلحہ رضی اللہ عنہ خود تیر کو برداشت کر رہے ہیں تو وہ نبی کا جسم تھا نا! جس کی بیویاں امت کی مائیں ہیں، "ہ" ضمیر کا مرجع ﴿اَلنَّبِیُّ﴾ ہے تو یہ بیویاں جسم کی تھیں یا روح کی تھیں؟ روح کی تو نہیں تھیں نا! تو نبی جسم ہوا ہے لیکن جسم کون سا؟ مع الروح والا۔

اب منکرین حیات الانبیاء کہتے ہیں کہ وفات کے بعد نبی زندہ ہے تو سوال یہ ہے کہ وفات کس پر آئی ہے جسم پر یا روح پر؟ روح تو مرتی نہیں ہے تو وفات تب ہی ہو گی جب نبی کے جسم کو نبی مانیں گے! اگر نبی کے جسم کو نبی نہیں مانیں گے تو نبی پر وفات کیسے ہوئی؟ اگر صرف روح نبی ہے تو اس پر وفات آتی نہیں ہے، موت تو تب ہی مانیں گے جب وصفِ نبوت آپ جسم کے لیے ثابت کریں۔ پھر اس کے بعد کہتے ہیں کہ نبی زندہ ہے تو جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ وصفِ نبوت جسم کے لیے ہے تو زندہ کون ہو گا؟ جسم، اور جسم بھی کون سا کہ جس میں روح ہو۔ تو یہ ماننا پڑے گا نا کہ وفات کے بعد جسم زندہ ہے اور وہ جسم زندہ ہے جس کے ساتھ روح کا تعلق موجود ہے، ایسا جسم نبی نہیں ہے کہ جس کے ساتھ روح کا تعلق نہ ہو بلکہ ایسا جسم نبی ہے جس کے ساتھ روح کا تعلق ہو۔

تو قرآن کریم سے ثابت ہو رہا ہے کہ وصفِ نبوت پیغمبر کے جسم کے لیے ہے اور وصفِ رسالت بھی پیغمبر کے جسم کے لیے ہے یہ بھی قرآن سے ثابت ہو رہا ہے، آگے بائیسویں پارے میں آ رہا ہے کہ:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ وَلٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی بالغ مرد کے باپ نہیں ہیں لیکن رسول اللہ ہیں۔ اب دیکھو! جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی بالغ مرد کے باپ نہیں ہیں وہی محمد اللہ کے رسول ہیں اور جس محمد سے بالغ مردوں کی نفی کی جا رہی ہے وہ محمد کی روح نہیں ہے وہ محمد کا جسم ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ تو جس جسم سے بالغ مردوں کی نفی کی جا رہی ہے اسی جسم کے لیے رسالت کو ثابت کیا جا رہا ہے، کیونکہ "لٰكِنۡ" عربی زبان میں استدراک کے لیے آتا ہے، استدراک کا معنی ہے کہ کلامِ سابق میں جو شبہ پیدا ہوا

”لٰکِنۡ“ کے بعد والا کلام اس شبہ کو دور کرتا ہے۔ ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ﴾ حضور بالغ مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، اس میں شبہ یہ تھا کہ جب امت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی ابوت سے محروم ہوگئی جسمانی شفقت سے محروم ہوگئی تو کیا اللہ کے نبی کی روحانی ابوت اور روحانی شفقت سے بھی امت محروم ہوئی یا نہیں؟ فرمایا: ﴿وَلٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ﴾ کہ امت اگرچہ اللہ کے نبی کی جسمانی ابوّت سے محروم ہوگئی ہے لیکن روحانی ابوت باقی ہے اور جب روحانی ابوت باقی ہے تو روحانی شفقت بھی باقی ہے، ﴿وَلٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ﴾ اس لیے تمہیں یہ ٹینشن نہیں لینی چاہیے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی بالغ مرد کے باپ نہیں ہیں تو امت شفقت سے محروم ہوگئی، فرمایا: نہیں، روحانی باپ اب بھی ہیں، اب بتاؤ! کون روحانی باپ ہیں؟ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، وہ جسم جس میں روح موجود ہے۔ تو قرآن کریم سے وصفِ نبوت بھی جسم کے لیے ثابت ہو رہی ہے اور وصفِ رسالت بھی جسم کے لیے ثابت ہو رہی ہے۔

کرے غلط تفسیر اور کہلائے شیخ القرآن!

اب بتاؤ! قرآن کتنی واضح بات کر رہا ہے۔ لوگ ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ جی ماشاء اللہ انہیں بہت قرآن آتا ہے۔ میں نے کہا: عجیب بات ہے کہ یہ غلط قرآن پڑھے تو شیخ القرآن بنتا ہے اور غلط تفسیر کرے تو شیخ التفسیر بنتا ہے، یعنی جتنا زیادہ قرآن غلط پڑھے اتنا زیادہ شیخ القرآن بنتا ہے، ارے بابا! غلط قرآن پڑھنے سے بندہ شیخ القرآن تھوڑا بنتا ہے؟! میں ایک بات کہتا ہوں کہ ہمارے ہاں اہلِ باطل نے اس قدر محنت کی ہے کہ اپنے بارے میں مشہور کرا دیا ہے کہ جی یہ قرآن بہت جانتے ہیں اور ایک آپ لوگ ہیں کہ آپ یہاں سے جائیں گے صحیح عقیدہ اور صحیح تفسیر پڑھ کر جائیں گے لیکن

مجال ہے کہ آپ واپس جا کر یہ کہیں کہ ہمارے استاد جی کو قرآن بہت زیادہ آتا ہے! تفسیر کرتے ہیں تو بہت مزا آتا ہے! یہ آپ کبھی نہیں کہیں گے اور وہ پوری دنیا میں پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ جی ہمارے ہاں دورہ ہوتا ہے، قرآن وہاں پہ کھلتا ہے، قرآن کی خدمت بہت ہو رہی ہے۔ اب اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ کہ ہمارے اہلِ حق بزرگ بھی اپنی زبانوں سے کہہ دیتے ہیں کہ جی عقیدے میں ان سے اختلاف ہے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ قرآن کی خدمت اس نے کی ہے۔ میں نے کہا یہ جو ہم نمازِ فجر سے پہلے تفسیر پڑھ رہے ہیں یہ قرآن کی خدمت نہیں ہے؟ (خدمت ہے۔ سامعین) فرق صرف یہ ہے کہ ہم خدمت میں شبہات کو رفع کرتے ہیں اور ان کی خدمت یہ ہے کہ قرآن میں شبہات کو پیدا کر رہے ہیں، شر جلدی پھیلتا ہے اور خیر دیر سے پھیلتی ہے، یہ امت کا مزاج ہے۔

میں اس لیے کہتا ہوں کہ قرآن مجید کو سمجھو! اب دیکھو بات کیسے کھل رہی ہے! بندے کا ضمیر کہتا ہے کہ وصفِ نبوت یہ جسم کے لیے ہے۔ راولپنڈی کے ایک عالم تھے، انہوں نے مجھ سے بات کی۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ لوگ جنہوں نے اُن کے پاس قرآن پڑھا ہے انہیں کہنا کہ کبھی ہمارے استاذ کے پاس بھی پڑھنا! پھر آپ دیکھنا کہ شبہات ختم کیسے ہوتے ہیں؟! اب دیکھو بندے کا دل مانتا ہے، ضمیر مانتا ہے کہ قرآن کیا کہتا ہے! اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

امہات المؤمنین کا مطالبہ اور خدائی تنبیہ:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۲۸﴾﴾

غزوۂ احزاب کے بعد بنو نضیر اس کے بعد بنو قریظہ کی فتوحات کے دروازے کھلے تو ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! قیصر اور کسریٰ بادشاہ

ہیں ان کی بیگمات سونے سے لدی ہوئی ہیں، ان کی خدمت پر کنیزیں مامور ہیں، ہم اتنا تو نہیں مانگتیں لیکن اب جو وسعت پیدا ہو گئی ہے تو ہمارے خرچے میں بھی وسعت ہونی چاہیے، ہم ان کی طرح نہیں مانگتیں لیکن آپ بھی وسعت فرما دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات کا یہ مطالبہ سنا تو آپ کو بہت رنج ہوا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بلایا، حضرت عائشہ سے پیار بھی سب سے زیادہ تھا۔ فرمایا کہ عائشہ! میں ایک بات کہنے لگا ہوں لیکن اس کا جواب جلدی نہ دینا، ماں باپ سے مشورہ کر کے دینا۔ عرض کیا: حضور فرمائیں! فرمایا کہ دیکھو! اگر تم دنیا چاہتی ہو تو میں طلاق دیتا ہوں اور ساتھ تمہیں دنیا دے کر رخصت کر دیتا ہوں اور اگر مجھے چاہتی ہو تو پھر دنیا کی وسعت نہیں ملے گی اسی فقر کے ساتھ رہنا پڑے گا۔

حضرت عائشہ نے کہا کہ حضور! اس پر بھی کوئی والدین کے ساتھ مشورہ کرنے کی ضرورت ہے؟ اس پر بھی میں ماں باپ سے مشورہ کروں گی؟ میں سب کچھ قربان کرتی ہوں آپ کی ذات پر، آپ کی ذات مل جائے تو ہمیں اور کیا چاہیے؟ یہی بات جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری ازواجِ مطہرات سے کی تو سب نے یہی جواب دیا لیکن امی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے فخر اس بات پر ہے کہ سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ مجھ سے کیا۔ اسے تخییر طلاق کا مسئلہ کہتے ہیں۔ تخییر طلاق دو طرح سے ہوتی ہے:

نمبر 1: خاوند اپنی بیوی سے کہے کہ اگر تم یہ چیز چاہتی ہو، تم اس چیز کو پسند کرتی ہو تو میں تجھے طلاق دے کر یہ چیز دے دیتا ہوں۔

نمبر 2: اگر تم یہ چاہتی ہو کہ تمہیں یہ چیز ملے تو میری طرف سے تمہیں اختیار ہے کہ خود کو طلاق دینا چاہو تو دے لو۔

دونوں صورتیں ٹھیک ہیں۔ پہلی یہ کہ تم یہ چیز لینا چاہتی ہو تو کہو میں تمہیں یہ چیز بھی دے دوں اور تمہیں طلاق بھی دے دوں! وہ کہتی ہے کہ مجھے منظور ہے۔ اب شوہر طلاق دے دیتا ہے اور دوسری صورت یہ کہ بیوی خود اپنے آپ کو طلاق دینا چاہے تو بھی ٹھیک ہے کیونکہ خاوند نے اختیار دیا ہے کہ اگر چاہو تو اپنے آپ کو طلاق دے لو تمہیں طلاق کا اختیار ہے اور یہ چیز بھی لے لو اور بیوی کہتی ہے میں خود کو طلاق دیتی ہوں تو اسے طلاق ہو جائے گی۔

امہات المؤمنین کا مقام:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ﴾

اے پیغمبر کی بیویو! اگر تم نے گناہ کیا تو تمہیں دوگنا عذاب ملے گا۔

یہاں بات سمجھنا! ''فاحشہ'' سے مراد زنا نہیں ہے، اس کی وجہ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کسی نبی کے نکاح میں ایسی عورت نہیں آئی جس میں زنا کا عیب موجود ہو۔ ہاں ایسی بیوی آئی ہے کہ جس میں کفر ہو لیکن ایسی نہیں آئی جس میں زنا کا عیب ہو۔ آپ کو تعجب تو ہو گا کہ کفر برداشت کیا ہے لیکن زنا کو برداشت کیوں نہیں کیا؟ ایک ہوتا ہے عیبِ شرعی اور ایک ہوتا ہے عیبِ عرفی۔ شرعی عیب تو مسلمانوں میں عیب شمار ہو گا اور عرفی عیب مسلمان اور کافر دونوں میں عیب شمار ہو گا۔ کفر؛ یہ انسان میں عیب ہے لیکن یہ عیبِ شرعی ہے، عیب عرفی نہیں ہے۔ بات سمجھ آرہی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین) معاشرے میں کسی بندے کا کافر ہونا یہ عیب نہیں ہوتا، انسان ہے اس کی مرضی ہے مسلمان ہو اس کی مرضی ہے کافر ہو، شریعت نے اسے پورا اختیار دیا ہے کہ جو چاہے اختیار کرے لیکن زنا یہ عرفی عیب ہے، معاشرے میں اس کو گندا سمجھا جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی بیوی میں وہ

عیب نہیں رکھتے جس کو معاشرے میں گندا سمجھا جاتا ہو۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ یہاں فرمایا﴿بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ یعنی کھلی ہوئی بے حیائی۔ یہ جو زنا ہوتا ہے یہ علانیہ نہیں ہوتا، یہ چھپ کر ہوتا ہے اور "فاحشہ" کو "مبینہ" فرمایا گیا تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں زنا مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد عام گناہ ہے۔ بس پیغمبر کی بیوی اگر گناہ کرے گی تو عذاب ڈبل ہوگا اور اگر نیکی کرے گی تو اس کو اجر بھی دوہرا دیا جائے گا جس کا ذکر "مَرَّتَيْنِ" میں آگے آرہا ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ یہ پیغمبر کی بیوی ہے۔

اس سے بعض علما نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ یہی حال عالم کا ہے جو نبی کا وارث ہے، یہ نیک عمل کرے گا تو اس کے عمل پر دوہرا اجر ملے گا اور اگر یہ گناہ کرے گا تو اس کے گناہ پر عذاب بھی دوہرا ہوگا کیونکہ یہ نبی پاک کا وارث ہے، اس کو یہ کام نہیں کرنا چاہیے تھا۔

آگے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے لیے فرمایا: ﴿نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ﴾ اس پر پہلے بات ہو چکی ہے کہ انہیں ان کے نیک اعمال پر دوہرا اجر ملے گا، یہ نہیں کہ دو عملوں پر دو اجر ملیں گے۔

ازواجِ مطہرات کو پانچ ہدایات:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۳۲﴾

اس آیت میں اللہ پاک نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کی عظمت بیان فرمائی ہے کہ دنیا جہاں کی عورتوں سے یہ افضل ہیں اور ان کے افضل ہونے کی وجہ ان کے اعمال نہیں، افضل ہونے کی وجہ نبی کی بیوی ہونا ہے، پیغمبر کی بیوی ہونا اتنا بڑا اشرف

ہے جو کسی اور عورت کو نہیں ملتا۔ لہذا ان سے کوئی عورت افضل نہیں ہے۔ یہاں ازواجِ مطہرات کو اللہ نے پانچ ہدایات دی ہیں:

ہدایت نمبر 1: اگر کوئی بندہ آئے، کوئی مسئلہ پوچھے، کوئی جائز بات کرے تو بات کرنے کی تو گنجائش ہے لیکن ﴿فَلَا تَخۡضَعۡنَ بِالۡقَوۡلِ﴾ عورت کی فطرت میں جو نزاکت ہے اس فطری نزاکت کو تم نے استعمال نہیں کرنا، تم نے تکلف کر کے اس فطری نزاکت کو ختم کر کے تھوڑی سی ترش بات کہنی ہے۔ ﴿فَيَطۡمَعَ الَّذِىۡ فِىۡ قَلۡبِهٖ مَرَضٌ﴾ عورت کی فطری نزاکت والی بات کرو گی تو وہ شخص جس کے دل میں مرض ہے اس کے دل میں طمع پیدا ہو گا، تم اس طمع کے دروازے کو بھی بند کر دو۔ ﴿وَّ قُلۡنَ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا﴾ اور جو عفت کا تقاضا ہے اس کے مطابق بات کیا کرو۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت پیاری بات لکھی ہے، ﴿وَّ قُلۡنَ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا﴾ کا ترجمہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”اور قاعدہ کے موافق بات کرو!“ لفظ قاعدہ کے بعد قوسین میں لفظ ”عفت“ بڑھا دیا ہے، قاعدۂ عفت کے موافق بات کرو یعنی پاکدامن عورتیں جس طرح بات کرتی ہیں اس طرح بات کرو۔ [137]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر اشکال کا جواب:

آگے فرمایا: ﴿وَ قَرۡنَ فِىۡ بُيُوۡتِكُنَّ﴾ بلا ضرورت گھر سے باہر نہ نکلو بلکہ گھر ہی ٹھہرا کرو۔ ام المؤمنین امی عائشہ رضی اللہ عنہا مکہ سے بصرہ گئی ہیں۔ اس پر روافض بہت چیختے ہیں کہ یہ ﴿وَ قَرۡنَ فِىۡ بُيُوۡتِكُنَّ﴾ کے خلاف ہے کہ اللہ کا حکم ہے نبی کی بیویاں گھر میں ٹھہریں اور حضرت عائشہ مکہ سے بصرہ چلی گئی ہیں تو قرآن کے حکم کی

137۔ بیان القرآن: ج3 ص169

خلاف ورزی کی ہے، حالانکہ یہ خلاف ورزی نہیں ہے، ﴿وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ﴾ کا حکم عام حالات میں ہے اور اگر خاص ضرورت ہو تو نکلنا جائز ہے۔ حضرت امی عائشہ رضی اللہ عنہا مدینہ سے مکہ گئی ہیں اس پر اعتراض کیوں نہیں کیا؟ یہ بھی تو ﴿وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ﴾ کے خلاف ہے؟! امی عائشہ جب گھر سے نکلی ہیں تو مدینہ سے مکہ پھر مکہ سے بصرہ گئی ہیں، اگر گھر سے نکلنا ﴿وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ﴾ کے خلاف ہوتا تو اعتراض پھر مدینہ سے مکہ جانے پر بھی ہونا چاہیے تھا۔

کہتے ہیں: نہیں جی! مدینہ سے مکہ جانا ٹھیک تھا چونکہ حج مقصود تھا اور مکہ سے بصرہ کیوں گئی ہیں وہاں مقصود کیا تھا؟ ہم کہتے ہیں کہ وہاں بھی تو شرعی تقاضا مقصود تھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں شہید کر دیا گیا تھا تو حضرت زبیر، حضرت طلحہ، حضرت نعمان بن بشیر، حضرت کعب بن حجرہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین مدینہ سے مکہ پہنچے اور وہاں آ کر امی عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ حضرت عثمان تو شہید ہو گئے ہیں اور قاتلانِ عثمان حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حلقے میں ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مجبوری ہے کہ ان سے قصاص نہیں لے سکتے اور اگر ہم مدینہ جائیں گے تو آپ ہمیں بتائیں کہ ہم کیا کریں؟ ہمیں خدشہ ہے کہ لوگ ہمیں بھی مار دیں گے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مشورہ دیا کہ تم فی الحال مدینہ نہ جاؤ تم مکہ سے بصرہ چلے جاؤ، وہاں مسلمانوں کی مستحکم حکومت ہے اور تمہیں تحفظ ملے گا، کچھ نہیں ہو گا، جب حالات سازگار ہو جائیں گے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا باغیوں پر کنٹرول ہو جائے گا، مزید قتل وغارت کی ان کو ہمت نہیں ہو گی تو مدینہ چلے آنا! انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ آپ ہماری والدہ ہیں، آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ اب یہ کون ہیں؟ امی عائشہ رضی اللہ عنہا کے رشتہ دار ہیں، عام آدمی

نہیں ہیں، حضرت عبد اللہ بن زبیر یہ امی عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے ہیں اور امی عائشہ ان کی خالہ ہیں، یہ آپ کے محرم ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ بھی چلیں تو اپنے بھانجے کے ساتھ گئی ہیں، محرم کے ساتھ سفر کرنا گناہ بھی نہیں ہے، پھر ہودج پر پردے لٹکائے ہیں، پردے کے ساتھ گئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ بھی کچھ عرصہ وہاں ٹھہریں، ماحول ساز گار ہو گا تو آپ بھی تشریف لے آئیں۔ تو جس طرح ان کا شرعی تقاضا مدینہ سے مکہ جانے کا تھا ایسا ہی شرعی تقاضا مکہ سے بصرہ جانے کا بھی تھا۔ اس لیے اعتراض بالکل فضول ہے۔

ہدایت نمبر2: ﴿وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولٰى﴾

اور قدیم جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو! جاہلیت اولیٰ سے مراد وہ جاہلیت ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس زمانہ کی عورتیں بے حیائی اور بے شرمی کے ساتھ بلا جھجک بازاروں، میلوں، گلی کوچوں میں بے پردہ ہو کر پھرا کرتی تھی۔ جب باہر نکلتیں تو بن ٹھن کر نکلتیں۔ اپنے پرائے کا امتیاز تھا نہ غیر محرموں سے بچنے کی فکر، اور ایک ہوتی ہے جاہلیت اُخریٰ یعنی اسلام لانے کے بعد آدمی اگر شریعت پر عمل نہ کرے اس کو بھی جاہلیت کہتے ہیں لیکن یہ اخریٰ ہوتی ہے۔ تو فرمایا کہ جس طرح زمانہ جاہلیت میں عورتیں بغیر پردے کے نکلتی تھیں تم ایسا کبھی نہیں کرنا۔

ہدایت نمبر3: ﴿وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ﴾ نماز کی پابندی کیا کرو۔

ہدایت نمبر4: ﴿وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ﴾ زکوٰۃ ادا کیا کرو۔

ہدایت نمبر5: ﴿وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کیا کرو۔

یہ پانچ ہدایات ازواج مطہرات کو دی ہیں لیکن اس کا خطاب تمام عورتوں کے لیے ہے، سب اس کے اندر شامل ہیں۔

اہلِ بیت کا مصداق کون؟

﴿اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا ﴿۳۳﴾﴾

اے اہلِ بیت! اللہ رب العزت چاہتے ہیں کہ تم سے گندگی کو دور کریں اور تمہیں پاک صاف رکھیں۔

یہاں ایک مسئلہ تو یہ سمجھیں کہ اہلِ بیت کا مصداق کون ہے؟ اھل السنۃ والجماعۃ کا اجماعی عقیدہ ہے کہ اہلِ بیت میں پہلے پیغمبر کی بیویاں، پھر پیغمبر کی اولاد، پھر اولاد کی اولاد اور پھر داماد شامل ہیں۔ اہلِ بیت کا اولین مصداق ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن ہیں۔ یہ جو آیت کریمہ ہے یہ ازواج مطہرات کے حق میں نازل ہوئی۔ آپ اس کے پیچھے دیکھیں ﴿یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنۡ یَّاۡتِ مِنۡکُنَّ﴾ خطاب نبی کی بیویوں کو ہے، اس کے بعد آپ دیکھیں ﴿یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسۡتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ یہاں بھی خطاب نبی کی بیویوں کو ہے، پھر اسی آیت کے آگے دیکھیں ﴿وَ اذۡکُرۡنَ مَا یُتۡلٰی فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ﴾ یہاں بھی خطاب نبی کی بیویوں کو ہے۔ تو اس آیت سے پہلے اور بعد میں ازواج مطہرات کا تذکرہ ہے اور انہی کو خطاب ہو رہا ہے، لہذا درمیانی آیت سے مراد بھی ازواج مطہرات ہی ہیں۔ اس لیے اہل بیت کا مصداق ازواج مطہرات ہیں۔

اہل بیت کا آپ لغوی مفہوم دیکھیں تب بھی پیغمبر کی بیویاں ہی ہیں۔ لفظ ”اہل بیت“ میں ”بیت“ کسے کہتے ہیں؟ یہ لفظ ”بَاتَ، یَبِیۡتُ، بَیۡتًا“ سے ہے بمعنی رات گزارنا، ”اَلۡبَیۡتُ“ اس کمرے کو کہتے ہیں جہاں آدمی رات گزارے اور اہل بیت

اسے کہتے ہیں کہ جو رات کمرے میں آپ کے ساتھ رہے۔ آدمی کی بیوی رات کو آدمی کے ساتھ کمرے میں ہوتی ہے۔ بیٹا اور بیٹی ایک وقت تک تو ہوتے ہیں لیکن اس کے بعد ان کے سونے کی جگہ الگ ہو جاتی ہے، جو ہمیشہ کے لیے خاوند کے ساتھ کمرے میں آرام کرے یہ بیوی ہوتی ہے، اس لیے اہل بیت سے مراد پیغمبر کی بیویاں ہیں۔

ہمارے عرف میں بھی جب ''گھر والے'' کہا جائے تو گھر والوں سے مراد بیویاں ہوتی ہیں اولاد وغیرہ بعد میں ہے۔ آپ اپنے شاگرد کے پاس جانا چاہتے ہیں اور وہ کہے کہ استاد جی! جب آپ آئیں تو گھر والوں کو بھی ساتھ لائیں۔ اب استاد جائے تو ساتھ بیٹی ہو، ساتھ داماد ہو تو شاگرد پوچھے گا کہ گھر والے آئے ہیں؟ آپ کہتے ہیں کہ نہیں، گھر والے بیمار تھے نہیں آسکتے البتہ بیٹی میرے ساتھ آئی ہے۔ اب ہر بندہ سمجھتا ہے کہ بیٹی اہل بیت نہیں ہے، داماد اہل بیت نہیں ہے، بندہ یہ کہتا ہے کہ گھر والے تو نہیں آسکے البتہ میں بچے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ تو عرف میں بھی اہل بیت سے مراد بیوی ہوتی ہے۔

روافض کہتے ہیں کہ اہلِ بیت سے مراد ازواجِ مطہرات نہیں ہیں۔ ان کی ایک دلیل یہ ہے ﴿لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ﴾ کہ دیکھو! اللہ رب العزت نے ''كُمْ'' ضمیر کا استعمال کیا ہے، ازواج مطہرات تو ساری عورتیں ہیں، چلو کچھ عورتیں اور کچھ مرد ہوں تو ''كُمْ'' کہہ سکتے ہیں۔ یہ تو مذکر کی ضمیر ہے مؤنث کی تو نہیں ہے، اس میں تو حضرت علی، حسن، حسین رضی اللہ عنہم ہیں، پھر حضرت فاطمہ ہیں۔ تو ان کے ساتھ تین مرد ہیں اور ایک عورت ہے تو ''كُمْ'' لائے ہیں تغلیباً جو ایک عورت کو بھی شامل ہے۔ اگر ازواجِ مطہرات ہی اہل بیت کا اصل مصداق ہیں تو پھر ''كُمْ'' کیوں فرمایا؟

ہم کہتے ہیں کہ اس کا جواب تو خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں فرشتے آئے اور ان کی بوڑھی بیوی کو بچے کی بشارت دی تو

ان کو بڑا تعجب ہوا۔ فرشتوں نے کہا:

﴿اَتَعۡجَبِیۡنَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ رَحۡمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيۡكُمۡ اَهۡلَ الۡبَيۡتِ﴾[138]

کیا آپ اللہ کے حکم پر تعجب کا اظہار کر رہی ہیں؟! اے اہلِ بیت تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں ہیں!

اب دیکھو! یہاں تنہا ابراہیم علیہ السلام کی بیوی ہے تو فرشتوں نے ان کے لیے "کُمۡ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تو "کُمۡ" کی اصل وضع تو مردوں کے لیے ہے لیکن جب ایسے صیغے ہوں سلام وغیرہ کے تو اس قسم کے صیغوں میں "کُمۡ" کا لفظ عورتوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اب دیکھو! یہاں تو صرف ایک بیوی پر "کُمۡ" کا اطلاق ہو رہا ہے تو یہاں نو بیویوں کے لیے "کُمۡ" کا استعمال کیوں نہیں ہو سکتا؟

اور دوسرا یہ سمجھیں کہ جب ہم کہتے ہیں کہ اہلِ بیت کا اولین مصداق پیغمبر کی بیویاں ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم پیغمبر علیہ السلام کے داماد اور نواسوں کو اس سے خارج کرتے ہیں بلکہ ان کو بھی اہلِ بیت میں شامل مانتے ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد اور نواسے شامل ہوں گے تو پھر "کُمۡ" کے لفظ پر کوئی اعتراض ہی نہیں رہتا، وہ بھی اہل بیت ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں بھی اہل بیت ہیں۔

تطہیر تکوینی اور تطہیر تشریعی:

ہاں البتہ اس سے روافض یہ استدلال کرتے ہیں کہ پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی، داماد اور حسنین کریمین اہل بیت بھی ہیں اور معصوم بھی ہیں۔ معصوم ہونے کی دلیل ﴿لِيُذۡهِبَ عَنۡكُمُ الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَيۡتِ﴾ ہے کہ دیکھو! اللہ فرما

138۔ ھود 11:73

رہے ہیں کہ ہم ”رجس“ کو آپ کے قریب بھی نہیں آنے دیں گے اور ”رجس“ سے مراد گناہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اللہ نے ان سے دور کر دیے ہیں۔ لہذا وہ معصوم ہو گئے۔

یہ بات یاد رکھنا! ایک ہے تطہیرِ تکوینی اور ایک ہے تطہیرِ تشریعی، تطہیر تشریعی کا معنی ہے کہ کوئی بندہ گناہ نہ کرے یہ شرعاً پاک ہے اور تطہیرِ تکوینی کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک بندے کا مقدر ایسا فرما دیں کہ وہ گناہ کرے گا ہی نہیں۔ انبیاء اور ملائکہ کی تطہیر تکوینی ہے۔ اب اس کا معنی یہ نہیں کہ کسی اور بندے کی تطہیر ہو ہی نہیں سکتی، ہو سکتی ہے لیکن وہ تشریعی ہو گی تکوینی نہیں ہو گی اور تکوینی ہونے پر مستقل دلیل چاہیے۔

اب اس کو دوسرے لفظوں میں سمجھنا! ہم کہتے ہیں کہ نبی ہو گا اور معصوم ضرور ہو گا، فرشتہ ہو گا اور معصوم ضرور ہو گا۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ فرشتے کی طبیعت میں گناہ کا میلان رکھا ہی نہیں ہے اس لیے وہ معصوم ہے اور پیغمبر چونکہ انسان ہے گناہ کا میلان ہو گا لیکن پیغمبر کو تکویناً گناہ سے ہمیشہ خدا بچائیں گے۔ تو فرشتے اور انبیاء کی تطہیر تکوینی ہے کہ ان سے کبھی گناہ ہو گا ہی نہیں! اور انبیاء کے علاوہ جو امت ہے ان میں کسی کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں ہے کہ یہ گناہ کرے گا نہیں! ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ امت کا ایسا فرد ہو جو گناہ نہ کرے۔ معصوم کا معنی یہ نہیں کہ بندہ گناہ نہ کرے بلکہ معصوم کا معنی یہ ہے کہ اللہ اس کو تمام گناہوں سے پاک رکھیں گے، لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی امتی بندہ ہو اور گناہ کبھی نہ کرے تو یہ عصمتِ نبوت کے خلاف نہیں ہے۔ لہذا تکوینی تطہیر الگ ہے اور تشریعی تطہیر الگ ہے۔

مؤمنات کی صفات:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ

الْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ وَ الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآىِٕمِيْنَ وَ الصّٰٓىِٕمٰتِ وَ الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾

بے شک فرمانبر دار مرد اور فرمانبر دار عورتیں، ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں، عبادت گزار مرد اور عبادت گزار عورتیں، سچے مرد اور سچی عورتیں، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، دل سے عاجزی کرنے والے مرد اور دل سے عاجزی کرنے والی عورتیں، صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں، ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور عظیم الشان اجر تیار کر رکھا ہے۔

قرآن کریم میں اکثر مقامات پر جب خطاب کیا ہے تو مردوں کو کیا ہے جبکہ شریعت کی مکلف خواتین بھی ہیں، اس بنا پر بعض صحابیات رضی اللہ عنہن نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ! ہمیں تو ڈر لگتا ہے کہ ہماری عبادات اللہ کے ہاں قبول بھی ہیں یا نہیں۔ کیونکہ ہمیں اللہ نے قرآن میں کبھی خطاب نہیں کیا اور نہ براہ راست ہمیں کوئی حکم دیا ہے۔ تو اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ ان میں جس طرح مردوں کو خطاب ہے اسی طرح خواتین کو بھی ہے۔

کثرتِ ذکر اللہ کا معمول بنائیے!

﴿وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ﴾

میں نے جمعرات خانقاہی اجتماع میں بھی عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ہم سے صرف ذکر کا مطالبہ نہیں کرتے بلکہ کثرتِ ذکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہاں ﴿وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ﴾ میں بھی کثرتِ ذکر کی بات کی ہے۔ اس لیے میں اس پر بہت زیادہ زور دیتا ہوں کہ علماء اور طلبہ کو کثرت سے ذکر کرنا چاہیے۔ عموماً ہم ذکر میں بہت کوتاہی سے کام لیتے ہیں اور عام طور پر علماء کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ ہم مطالعہ کریں، پڑھیں، بیان کریں، سبق پڑھائیں لیکن ذکر پر توجہ نہیں دیتے حالانکہ ذکر کرنے کے ساتھ کام میں برکت ہوتی ہے، جو کام آپ کا دو سال میں ہونا ہے وہ ایک سال میں ہو گا، جو کام کم بڑھنا ہے ذکر کی وجہ سے زیادہ بڑھے گا، تو ذکر اینڈھن ہے عالم کے کام کے لیے، اس لیے اس پر بہت زیادہ توجہ دینی چاہیے خصوصاً قرآن کریم کی تلاوت اور اللہ کے نام کا ذکر جس حد تک ممکن ہو کریں۔ ہمارے اکابر اس کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا کرتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سرِ تسلیم خم:

﴿وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ غلام تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آزاد فرمایا اور اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ لوگ بھی ان کو زید بن محمد کہہ کر پکارتے تھے۔ جب یہ آیات نازل ہوئیں کہ منہ بولے بیٹے کو اس شخص کا بیٹا کہہ کر نہ پکارا جائے بلکہ ان کو ان کے اصلی باپ کی نسبت سے پکارا جائے تو ان کو زید بن محمد کے بجائے اصلی باپ کی طرف منسوب کر کے پکارا جانے لگا۔ واقعہ پہلے میں نے بیان کر دیا ہے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جب جوان ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم کی پھوپھی کی بیٹی تھیں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا، قریشی تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کا نکاح ان سے کرنا چاہا۔ زینب بنت جحش کو حضرت زید کے نکاح کا پیغام بھیجا۔ حضرت زینب بنت جحش اور ان کے بھائی عبد اللہ بن جحش اس نکاح پر آمادہ نہیں ہوئے، کیونکہ حضرت زید رضی اللہ عنہ میں ایک عرفی عیب تھا، عرفی عیب کا مطلب کہ جو شریعت میں عیب شمار نہیں ہوتا اور معاشرے میں عیب شمار ہوتا ہے، ان کا عرفی عیب یہ تھا کہ وہ غلام تھے پھر آزاد ہوئے اور قریش بڑا خاندان ہے اس بنیاد پر وہ نکاح تیار نہیں ہوئے۔ تو قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی کہ جب اللہ اور اللہ کا رسول کوئی فیصلہ کر دے تو پھر مؤمن مرد اور مؤمن عورت کا اختیار ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت زینت بنت جحش رضی اللہ عنہا کا کمالِ ایمان دیکھیں کہ آپ فوراً نکاح کے لیے راضی ہو گئیں اور ان کے بھائی بھی راضی ہو گئے۔ تو زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کا نکاح منعقد ہو گیا۔ شریعت نے کفو کا خیال بھی کیا ہے لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھیں کہ اعلیٰ اور ادنیٰ ہونے کی بنیاد کفو نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد ایمان اور تقویٰ ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾[139]

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں مختلف قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے افضل وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو!

تو افضلیت کی بنیاد تو ایمان اور اعمال ہیں ہاں البتہ معاشرے میں شریعت نے

139۔ الحجرات 13:49

کفو اور برابری کا خیال کیا ہے، خاندانوں کا خیال کیا ہے، معاشرت میں اس چیز کا خیال کیا ہے۔

کفو کی تین اقسام:

اور کفو تین قسم کی ہوتی ہے؛ ایک کفو شرعی ہے، ایک کفو نسبی ہے اور ایک کفو مالی ہے۔ تو شریعت نے ان تینوں کا خیال رکھا ہے۔

نمبر1: کفوِ شرعی کا معنی کہ مسلمان؛ کافر سے اعلیٰ ہے برابر نہیں ہے، اسلام اور کفر میں برابری نہیں ہے، اس لیے مسلمان لڑکی کا نکاح کافر لڑکے سے نہیں ہو سکتا کیونکہ عورت اعلیٰ ہے اور یہ مرد ادنیٰ ہے۔ شریعت نے یہ تو کہا ہے کہ مرد مسلمان ہو اور عورت کتابی ہو تو اس کی گنجائش ہے لیکن عورت مسلمان ہو اور مرد کتابی ہو اس کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ شرعی کفو ہے۔ اس میں کسی مسلمان کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ دخل اندازی کرے۔

نمبر2: کفو نسبی یعنی خاندان کی جو برابری ہے یہ لڑکی کا بھی حق ہے اور خاندان کا بھی حق ہے۔ لہٰذا لڑکی اپنی مرضی سے اپنے سے ادنیٰ خاندان میں نکاح کرنا چاہے تو والدین کو حق حاصل ہے کہ وہ نکاح کو رکوا دیں باوجود اس کے کہ بالغ لڑکی اپنے اختیار سے نکاح کر سکتی ہے لیکن یہ کفو؛ خاندان کا بھی حق ہے اور لڑکی کا بھی حق ہے۔

نمبر3: مالی کفو یعنی مال میں برابر ہونا، یہ لڑکی کا حق ہے خاندان کا نہیں ہے یعنی اگر کفو نسبی میں برابری ہے اور لڑکا مال کے اعتبار سے کمزور ہے اور بالغ لڑکی نکاح کرنا چاہے تو اب والدین اور خاندان لڑکی کو روک نہیں سکتے کہ کفو میں برابر نہیں ہے۔

آپ نے اس کا حال اپنے علاقے میں، اپنے گاؤں میں دیکھا ہو گا کہ بعض لوگ کم مالدار ہوتے ہیں لیکن خاندانی لوگ ہوتے ہیں اور بعضوں کے پاس مال بہت ہوتا ہے لیکن خاندان کے اعتبار سے وہ چھوٹے لوگ ہوتے ہیں، اس لیے اگر مال تھوڑا

ہو اور خاندان میں برابری ہو تو یہ مالی کفو لڑکی کا حق ہے، یہ اپنا حق چھوڑنا چاہے تو اس کو شریعت نے اجازت دی ہے۔ کفو میں تینوں چیزوں کا خیال رکھیں۔

حضرت زید کا نکاح اور طلاق:

﴿وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ﴾

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا نکاح ہو گیا لیکن یہ نکاح زیادہ عرصہ تک چلا نہیں۔ نکاح تو قبول کر لیا لیکن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا مزاج کچھ تیز تھا، پھر خاندان بھی بڑا تھا اور حضرت زید آزاد کردہ غلام تھے، اس لیے اِن کے دل میں اُن کی وہ اہمیت نہ آ سکی جو شوہر اور بیوی کے درمیان ہونی چاہیے۔ بالآخر نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات وحی کے ذریعے بتا دی گئی کہ زید انہیں طلاق دے دیں گے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں گی۔ اب ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت زید نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ یا رسول اللہ! ہمارا نباہ نہیں ہوتا، میں آزاد کردہ غلام ہوں اور وہ قریش کی لڑکی ہے، اس کے مزاج میں کچھ تیزی ہے جو مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اس سے رکو! اللہ سے ڈرو کا معنی کہ اگرچہ طلاق دینا مباح ہے لیکن "أَبْغَضُ الْمُبَاحَات" ہے کہ جائز چیزوں میں سے سب سے زیادہ اللہ کو ناپسندیدہ ہے، اللہ سے ڈرو اور اس کا ارتکاب نہ کرو۔

اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر انہوں نے طلاق دے دی اور میں نکاح کرتا ہوں تو لوگ اس کو معیوب سمجھیں گے کہ دیکھو

اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا اور عرب منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹے کا درجہ دیتے تھے، اس کی بیوی کے ساتھ باپ کبھی بھی نکاح نہیں کرتا تھا تو لوگ تو طعنے دیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ خوف محسوس کرتے تھے اس لیے آپ ان سے فرماتے تھے کہ انہیں طلاق نہ دو! لیکن حضرت زید رضی اللہ عنہ کا نباہ نہیں ہوا۔ بالآخر انہوں نے طلاق دے دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت زینب بنت جحش سے ہو گیا۔

پیغمبر تبلیغِ دین میں خوف نہیں کھاتے:

یہاں ایک بات تو یہ سمجھیں کہ قرآن کریم میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

﴿الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ يَخْشَوْنَهٗ وَ لَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ﴾

انبیاء اور رسل وہ لوگ ہیں جو اللہ کا پیغام بندوں تک پہنچاتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتے۔

اور یہاں اللہ پاک فرماتے ہیں:

﴿وَ تُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ﴾

کہ آپ دل میں ایک بات چھپا رہے تھے، اس کا اظہار نہیں کر رہے اور اللہ اس بات کو ظاہر کرنے والا تھا، آپ کے دل میں تھا کہ زید طلاق دے گا تو بحکمِ خداوندی نکاح آپ کریں گے تو آپ اس کا اظہار کیوں نہیں کر رہے تھے اور حضرت زید کو طلاق نہ دینے کی نصیحت کیوں فرما رہے تھے، آپ لوگوں سے ڈرتے ہیں کہ لوگ تہمت لگائیں گے، لوگ الزام لگائیں گے، لوگ برا کہیں گے حالانکہ آپ کو اللہ

سے ڈرنا چاہیے!

تو قرآن کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام نہیں ڈرتے اور ایک سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام ڈرتے ہیں۔ دونوں میں فرق کیا ہے؟ یہ بات اچھی طرح سمجھیں کہ جہاں فرمایا کہ نہیں ڈرتے تو اس کا معنی یہ ہے انبیاء اور رسل عوام سے نہیں ڈرتے تبلیغ، دعوت اور شریعت کے معاملے میں کہ جب اللہ فرمائیں کہ یہ حکم شریعت ہے اسے بیان کرو تو پھر وہ نہیں ڈرتے کہ لوگ کیا کہیں گے! کیا الزام لگائیں گے! کیا بہتان لگائیں گے! بلکہ انبیاء علیہم السلام فریضہ نبوت کو ادا کرتے ہیں، اور یہاں جو فرمایا کہ آپ لوگوں سے ڈرتے تھے تو اس کا معنی یہ ہے کہ یہ نکاح بظاہر ایک دنیاوی معاملہ ہے، بظاہر تبلیغ ورسالت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے کہ فلاں سے نکاح کرو! بظاہر یہ دنیاوی معاملہ تھا، اس لیے آپ کو خوف محسوس ہوا کہ اہلِ دنیا اس پر اعتراض کریں گے۔ تو وہاں خوف نہیں کرتے دینی اور شرعی امور کے بیان کرنے میں اور یہاں خوف کیا ہے دنیوی امور میں، تو اُس کی وجہ اور ہے اور اِس کی وجہ اور ہے۔ لہٰذا دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

لیکن جب آپ کو یہ بات بتادی گئی کہ متبنیٰ کی بیوی سے والد نکاح کر سکتا ہے اور آپ نے نکاح کرنا ہے۔ ایک ہے زبان سے مسئلہ بتانا اور ایک ہے عمل سے مسئلہ بتانا، یہ شریعت کا وہ حکم ہے جو آپ نے عمل سے بتانا ہے اور زبان سے بتانے سے وہ اثر نہیں ہوگا جو آپ کے عمل سے ہوگا، تو جب یہ وحی آگئی اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوف محسوس نہیں کیا بلکہ حضرت زینب سے نکاح فرمایا ہے۔

حضرت زینب کا نکاح کس نے کرایا؟

﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا﴾

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح کس نے کیا؟ اب قرآن مجید میں تو ہے

﴿زَوَّجۡنٰکَهَا﴾ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ کا نکاح زینب کے ساتھ کیا ہے۔ اس بنیاد پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا یہ بات فرمایا کرتی تھیں کہ تمام ازواجِ مطہرات میں سے یہ مجھے شرف حاصل ہے کہ میرا نکاح کسی انسان نے نہیں اللہ نے خود پڑھایا ہے اور بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا ہے لیکن چونکہ اللہ کے حکم سے تھا اس لیے اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے کیا ہے لیکن زیادہ بہتر رائے یہ ہے کہ حضرت زینب کا نکاح دنیا میں کسی نے نہیں پڑھا اللہ نے خود پڑھایا ہے، یہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا بہت بڑا اعزاز تھا۔

حضرت زید بن حارثہ کا اعزاز:

حضرت زینب اور حضرت زید کے درمیان جدائی ہو گئی۔ اس جدائی کا حضرت زینب کو نقصان نہیں ہوا، کیونکہ حضرت زید کے نکاح سے نکلیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں چلی گئیں، حضرت زینب کا تو طلاق کے بعد اعزاز بڑھ گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آ گئی ہیں۔ اب حضرت زید کا کیا ہو گا! یہ بات بڑی سمجھنے کی ہے کہ حضرت زید جو قریشی خاندان کے داماد تھے جب ان کا نکاح ختم ہو گیا تو قریشی خاندان کی دامادی ختم ہو گئی تو ان کا مقام بظاہر بڑھا نہیں بلکہ کم ہوا۔ تو اللہ رب العزت نے حضرت زید کو یہ اعزاز دیا ﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيۡدٌ مِّنۡهَا وَطَرًا زَوَّجۡنٰکَهَا﴾ کہ حضرت زینب کو طلاق کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح دے دیا اور حضرت زید طلاق کے بعد قرآن کریم کے اندر آ گئے اور یہ ایسا اعزاز ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد کسی صحابی کو یہ اعزاز نہیں ملا، تنہا حضرت زید کا اعزاز ہے کہ جن کا نام اللہ نے قرآن میں لیا ہے۔ اب ظاہر ہے اس طلاق کے بعد حضرت زید کا دل تو ٹوٹنا تھا اور دل ٹوٹنے کا خدا نے ازالہ کیسے کیا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا ذکر قرآن

میں کر دیا، اب اگر یہ کہا جائے گا کہ حضرت زینب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی ہیں تو یہ بھی کہا جائے گا کہ حضرت زید کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔

متبنیٰ کی مطلقہ سے نکاح کی حکمت:

﴿لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِيٓ أَزْوَاجِ أَدْعِيَآئِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا﴾

ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عملاً فیصلہ اس لیے کروایا تاکہ آئندہ ایمان والوں پر حرج نہ ہو اور مسئلہ کھل جائے کہ اگر کوئی شخص اپنے متبنیٰ کی بیوی سے نکاح کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

﴿مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ۭ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۙ﴿۳۸﴾﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ یہ معاملہ آپ کے ساتھ نہیں ہے بلکہ آپ سے گزشتہ انبیاء علیہم السلام کو بھی جو ہم نے حکم دیا اس پر انہوں نے عمل فرمایا ہے، اور جو اللہ کا فیصلہ ہوتا ہے اس نے ہو کر رہنا ہوتا ہے۔ اس لیے ہم نے جو حکم دیا آپ نے عمل کیا اسی طرح پہلے انبیاء علیہم السلام بھی عمل فرماتے رہے ہیں۔

عقیدہ ختمِ نبوت:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾﴾

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی بالغ مرد کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کو جاننے والے ہیں۔

یہ بات یہاں پر کیوں ذکر فرمائی؟ اس لیے کہ جب حضرت زید نے حضرت

زینب کو طلاق دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرمایا تو اعتراض ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کیا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ﴾ کہ حضور تم میں سے کسی بالغ مرد کے باپ نہیں ہیں، جب زید حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا ہی نہیں تو تم کیسے کہتے ہو کہ زید حضور کا بیٹا ہے؟ وہ بیٹا جو خونی رشتے سے ہو اس کے بیٹے کی مطلقہ سے تو نکاح جائز نہیں ہوتا، یہ زید بن محمد نہیں ہے یہ زید بن حارثہ ہے، اس لیے تمہیں یہ اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْكُمْ" بلکہ "مِنْ رِّجَالِكُمْ" فرمایا، اگر "مِنْكُمْ" فرماتے تو یہ اشکال رہتا کہ حضور کے تو تین بیٹے تھے، حضور کی چار بیٹیاں بھی ہیں، پھر یہ کیسے فرما دیا! تو "مِنْ رِّجَالِكُمْ" کہہ کر فرمایا کہ حضور باپ تو ہیں لیکن رجال کے باپ نہیں۔ "رجل" کہتے ہیں جو نرینہ بھی ہو اور بالغ بھی ہو۔ تو حضور کسی رجل کے باپ نہیں ہیں، نہ زید حضور کے سگے بیٹے ہیں اس لیے ان کی طلاق یافتہ سے نکاح کرنے پر حضور پر اعتراض کرنا غلط ہے۔

حضور علیہ السلام کی ابوتِ روحانی:

جب یہ بات فرمائی ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ﴾ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی بالغ مرد کے باپ نہیں ہیں۔ اب اس پر ایک شبہ پیدا ہوا۔ وہ شبہ یہ ہے کہ یہ امت پیغمبر کی اَبُوَّت؛ باپ والی شفقت سے تو ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی تو کیا جو روحانی شفقت تھی وہ بھی ختم ہو گئی؟ "اَبُوَّت" کی نفی تو ہو گئی ہے لیکن کیا نبوت کی نفی بھی ہے؟ فرمایا ﴿وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ﴾ کہ ہم نے اَبُوَّت کی نفی کی ہے نبوت کی نفی نہیں کی، تو پیغمبر جو اَبُوَّت کی وجہ سے جسمانی باپ تھا اس شفقت سے تم محروم ہو لیکن نبوت کی وجہ سے جو روحانی باپ ہے وہ شفقت اب بھی باقی ہے۔

"لٰکِنۡ" عربی میں استدراک کے لیے آتا ہے، استدراک کا معنی ہوتا ہے کہ "لٰکِنۡ" سے پہلے والی عبارت میں جو شبہ پیدا ہوا "لٰکِنۡ" کا مابعد اس شبہ کو ختم کر دیتا ہے۔ ﴿وَ لٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور صرف رسول ہی نہیں، فرمایا: ﴿وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ یہ آخری نبی ہیں، ایسا نہیں کہ آج تو امت کو روحانی شفقت ملی ہے لیکن جو تمہارے بعد آئیں گے ان کے لیے کوئی اور نبی آئے گا، فرمایا نہیں نہیں! ان کے لیے بھی یہی نبی ہوں گے اور ان کو باپ والی روحانی شفقت بھی یہیں سے ملے گی۔ ﴿وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیۡءٍ عَلِيۡمًا ۝۴۰﴾ اور اللہ ہر چیز کو جاننے والے ہیں۔

روحانی بیٹے قیامت تک ہوں گے:

یہاں پر جس طرح ایک رسم بد کا رد ہوا ہے اسی طرح مشرکین مکہ کے ایک اعتراض کا جواب بھی ہوا ہے۔ اعتراض کیا تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے حضرت قاسم جب فوت ہوئے تو مشرکینِ مکہ نے اس بات پر کہ ان کی نرینہ اولاد فوت ہو گئی ہے خوشیاں منائیں تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ﴾ کہ تمہاری یہ بات تو ٹھیک ہے کہ میرے محمد کی نرینہ اولاد فوت ہو گئی ہے لیکن تمہیں خوش نہیں ہونا چاہیے۔

مشرکینِ مکہ کی خوشی یہ تھی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے کے بعد ہم سے لڑائی ان کی اولاد نے کرنی ہے، جب ان کی اولاد ختم ہو گئی تو ان کا مشن ختم ہو گا، اب ہم سے لڑائی کون لڑے گا؟! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ لٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ﴾ کہ تمہاری لڑائی محمد بن عبد اللہ سے نہیں محمد بن عبد اللہ رسول اللہ سے ہے، اگر صرف محمد بن عبد اللہ سے ہوتی اور رسالت کی حیثیت نہ ہوتی تو ان کے جانے کے بعد ان کے

بیٹے لڑائی لڑتے لیکن ان کا مسئلہ محمد بن عبد اللہ کا نہیں ہے محمد رسول اللہ کا ہے، لہذا ان کے جانے کے بعد ان کے جسمانی بیٹے نہیں لیکن ان کے روحانی بیٹے جنگ لڑیں گے اور وہ موجود ہیں اور وہ تھوڑے سے نہیں ہیں بلکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں۔

اب ان مشرکین کے ذہن میں پھر ایک خوشی آسکتی تھی کہ چلو ایک لاکھ چوبیس ہزار بھی فوت ہو جائیں گے تو پھر بھی ان کا مشن مٹ جائے گا، فرمایا کہ یہ صرف رسول اللہ نہیں ہیں بلکہ یہ خاتم النبیین بھی ہے۔ اگر صرف اللہ کے رسول ہوتے تو جو ان کے کلمہ گو تھے ایک لاکھ چوبیس ہزار وہی لڑتے، یہ رسول بھی ہیں اور آخری بھی ہیں اس لیے ان کے بعد قیامت تک آنے والی امت ان کی روحانی اولاد ہے، تمہاری جسمانی اولاد ہو گی یا نہیں لیکن ان کی روحانی اولاد قیامت تک چلتی رہے گی، اس لیے حضور کی اولاد بھی رہے گی اور حضور کا مشن بھی رہے گا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

عقیدہ ختم نبوت اور حضرت نانوتوی کی تعبیر:

اور ایک اس سے بھی اہم نکتہ سمجھیں۔ حجۃ الاسلام بانی دار العلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: خاتمیت ایک جنس ہے جس کی دو نوعیں ہے؛ ایک ہے خاتمیتِ زمانیہ اور ایک ہے خاتمیتِ ذاتیہ۔ خاتمیتِ زمانیہ کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تمام نبیوں سے آخر کا ہے۔ فرمایا: ہم یہ بھی مانتے ہیں لیکن یہ حضور کا کوئی زیادہ اعزاز نہیں ہے کیونکہ تقدم اور تاخر بالذات میں کوئی وجہ فضیلت نہیں ہے یعنی کسی کا اول ہونا یا آخر ہونا اس میں ذاتی طور پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ حضرت ابو بکر خلیفہ اول ہیں، حضرت علی خلیفہ آخر ہیں لیکن حضرت ابو بکر افضل ہیں، حضرت علی افضل نہیں ہیں۔ اگر صرف آخری ہونا افضلیت کی دلیل ہوتی تو آخری خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ

عنہ سے اعلیٰ ہوتے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ہمارے چاروں ائمہ میں سے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اول ہیں اور امام احمد بن حنبل چوتھے نمبر پہ ہیں۔ اب امام احمد بن حنبل آخر ہونے کی وجہ سے امام ابو حنیفہ سے افضل تو نہیں ہیں۔ با جماعت نماز ہوتی ہے، ایک صفِ اول ہے اور ایک صفِ آخر ہے، اب صفِ آخر یہ صفِ اول سے افضل تو نہیں ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ عجیب تشریح فرماتے ہیں، فرمایا کہ تقدم اور تاخر بالذات میں کوئی وجہ فضیلت نہیں ہے تو خاتم النبیین ہونا یہ افضیلت کی دلیل کیسے ہے؟ تو حضرت فرماتے ہیں کہ ایک ہے خاتمیتِ زمانیہ اور ایک ہے خاتمیتِ ذاتیہ، خاتمیتِ ذاتیہ کا معنی یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز اسی سے شروع ہے اور اسی پر ختم ہے، اسے کہتے ہے خاتمیتِ ذاتیہ یعنی یہ چیز اس کو بالذات ملی ہے اور دوسروں کو اس کے واسطے سے ملی ہے، اور اس کا ضابطہ یہ ہے کہ ایک چیز کسی کو بلا واسطہ ملے تو اسے کہتے ہیں "بالذات" اور اگر وہی چیز دوسرے کو بالواسطہ ملے تو اسے کہتے ہیں "بالعرض"۔

جیسے سورج جب طلوع ہوتا ہے تو اس کی روشنی دیوار پر پڑتی ہے، سورج کی روشنی بلاواسطہ ہے اور دیوار کی روشنی سورج کے واسطہ سے ہے، سورج ہو گا تو یہ روشنی ہو گی سورج نہیں ہو گا تو یہ روشنی بھی نہیں ہو گی لیکن جب سورج غروب ہوتا ہے تو یہ روشنی کہاں جاتی ہے؟ یہ واپس سورج میں چلی جاتی ہے۔ جیسے آپ ٹارچ چلائیں تو روشنی سامنے دیوار پر چلی جاتی ہے، جب بند کریں تو روشنی دوبارہ ٹارچ میں آجاتی ہے۔ تو فرمایا کہ سورج کی روشنی "بالذات" ہے اور دیوار کی روشنی "بالعرض" ہے۔ اسے کہتے ہیں ختم نبوت ذاتی یعنی اللہ کے نبی کی جو ختم نبوت ہے یہ ذاتی ہے، کیا معنی کہ اسی سے نبوت شروع ہو گی اور اسی پر نبوت ختم ہو گی۔ خاتمیتِ ذاتیہ کا مقصد ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت بالذات ہے؛ شروع بھی یہاں سے ہے اور ختم بھی

یہاں پر ہے۔ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں جس کا معنی یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو نبوت بالعرض ملی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت بالذات ملی ہے۔

ایمانِ اصل اور ایمانِ نسل:

اب اس کا فائدہ کیا ہو گا؟ بات توجہ سے سمجھنا! جب اللہ نے قرآن کریم میں ﴿وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ﴾ فرمایا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں مؤمنین کی مائیں ہیں، اس کا معنی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مؤمنین کے باپ ہیں، حضور باپ ہوں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں مائیں بنیں گی۔ اگر یہ باپ نہیں ہوں گے تو ان کی بیویاں مائیں کیسے بنیں گی؟ اب یہ پیغمبر باپ کیوں ہیں؟ اس لیے کہ ایک وہ شخص ہے جو ایمان لاتا ہے اور ایک وہ شخص ہے جس پر ایمان لایا جاتا ہے، تو جو ایمان لایا یہ بھی ایمان والا ہے اور جس پر ایمان لایا وہ بھی ایمان والا ہے، دونوں کے ایمانوں میں فرق کیا ہے کہ جس پر ایمان لایا جائے اس کا ایمان "اصل" ہوتا ہے اور جو ایمان لاتا ہے اس کا ایمان "نسل" ہوتا ہے، اصل کو باپ کہتے ہیں اور نسل کو اولاد کہتے ہیں۔ تو پیغمبر کا ایمان دیگر کے ایمان کے لیے مثل باپ کے ہے اور دیگر کا ایمان نبی کے ایمان کی نسبت مثل اولاد کے ہے۔ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم؛ صاحبِ ایمانِ اصل ہے اور باقی سارے صاحبِ ایمانِ نسل ہیں، تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم باپ ہیں اور باقی اولاد ہیں۔

اب توجہ فرمائیں! حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہم السلام تک یہ تمام انبیاء علیہم السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہیں ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ﴾، تو حضور کا ایمان اصل ہوا اور ان سب کا ایمان نسل ہوا، نسل ایمان والا بیٹا ہے اور اصل ایمان والا باپ ہوتا ہے۔ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مشرکینِ مکہ خوش ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد چلی گئی، فرمایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو ایسے صاحبِ

اولاد ہیں کہ جب دنیا میں نہیں تھے ان کی اولاد تب بھی تھی اور جب دنیا میں نہیں ہوں گے ان کی اولاد تب بھی ہو گی۔ (سبحان اللہ۔ سامعین) ایسا باپ دنیا میں کوئی ہو گا کہ جب نہیں تھے اولاد تب بھی تھی اور جب نہیں ہوں گے اولاد تب بھی ہو گی۔ اس لیے تم اس پیغمبر کی ذات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

اب دیکھو! ایسی عمدہ تعبیر اور تشریح ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو ہم پڑھتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں اور جب سمجھتے نہیں تو کہتے ہیں کہ یہ ان کا تفرد ہے! ان کی بات ٹھیک نہیں ہے! میں کہتا ہوں کہ بھائی! تفرد کا معنی یہ ہے کہ کسی نص کے خلاف تو ہو، جب کسی نص کے خلاف نہیں ہے تو آپ نے تفرد کیسے کہہ دیا؟!

ختمِ نبوت ذاتی اور ختمِ نبوت زمانی:

اس لیے حضرت نانا توی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک ہے حضور کی ختمِ نبوت ذاتی اور ایک ہے ختمِ نبوت زمانی، ہم زمانی بھی مانتے ہیں لیکن وجہِ فضیلت زمانی نہیں بلکہ وجہِ فضیلت ذاتی ہے۔ توجہ رکھنا! اب حضرت فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، ان کے بعد کوئی اور نبی آ بھی جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت پر فرق پھر بھی نہیں پڑتا! یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت ذاتی پر فرق نہیں پڑتا! یہ تحذیر الناس کی دوسری عبارت ہے جس پر اہلِ بدعت نے اعتراض کیا ہے کہ مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے نبوت کا دروازہ کھولا ہے اور مرزا قادیانی اس دروازے سے نبی بن کر آ گیا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مولانا قاسم نانوتوی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبین ہیں، اگر آپ کے بعد کوئی نبی آ بھی جائے تو ختم نبوت پر فرق نہیں پڑتا، یہ قضیہ شرطیہ ہے "لَوْ" والا اور "لَوْ" استعمال ہوتا ہے انتفائے ثانی کے لیے بوجہ انتفائے اول کے۔ جیسے قرآن میں ہے:

﴿لَوۡ كَانَ فِيۡهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾[140]

اگر زمین و آسمان میں کئی خدا ہوتے تو زمین و آسمان میں فساد آجاتا۔

لیکن فساد نہیں آیا کیونکہ کئی خدا نہیں ہیں۔ تو ﴿لَفَسَدَتَا﴾ ثانی ہے اور ﴿كَانَ فِيۡهِمَا﴾ اول ہے، تو "لَوۡ" آتا ہے انتفائے ثانی کے لیے بوجہ انتفائے اول کے۔ اب اعتراض سمجھنا! یہ لوگ کہتے ہیں کہ مولانا قاسم نانوتوی فرماتے ہیں کہ حضور خاتم النبیین ہیں، "اگر آپ کے بعد کوئی نبی آجائے" یہ اول ہے، "تو بھی ختمِ نبوت پر فرق نہیں پڑتا" یہ ثانی ہے۔ اب دیکھو! "اگر آپ کے بعد کوئی نبی آجائے" اس کا انتفاء ہے "اگر آپ کے بعد کوئی نبی نہ آئے" اور "ختمِ نبوت پر فرق نہیں پڑتا" اس کا انتفاء ہے "تو ختمِ نبوت پر فرق پڑتا ہے" اب وہ کہتے ہیں کہ حضرت نانوتوی کی عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ حضور کے بعد نبی کا آنا ضروری ہے، تو مرزا کہتا ہے کہ لو میں آگیا ہوں، تو یہ دروازہ مولانا قاسم نانوتوی نے کھولا تھا، مرزا اس سے نکل کر آگیا۔

اب جواب سمجھیں! ہم کہتے ہیں کہ "لَوۡ" ہمیشہ انتفائے ثانی کے لیے بوجہ انتفائے اول کے نہیں آتا۔ شرح جامی میں ہے: "وَلَهَا اسۡتِعۡمَالٌ ثَالِثٌ" کہ "لَوۡ" کا ایک استعمال اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ "لَوۡ" آتا ہے تاکیدِ ثانی کے لیے بوجہ انتفائے اول کے، جب پہلے کی نفی ہو گی تو دوسرا جملہ مزید مضبوط ہو گا۔ مثلاً میں کہتا ہوں "لَوۡ اَهَنۡتَنِيۡ لَاَكۡرَمۡتُكَ" کہ اگر تو میری توہین کرے گا تو میں تب بھی تیری عزت کروں گا! اب اس کی نفی یہ ہے کہ اگر تو مجھے گالی نہیں دے گا پھر تو بطریقِ اولیٰ میں تیری عزت کروں گا۔ اب حضرت کی عبارت کا معنی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اگر آپ کے بعد کوئی نبی آجائے تو ختم نبوت پر فرق نہیں پڑتا اور اگر نہ

140۔ الانبیاء 22:21

آئے تو پھر یقیناً ختم نبوت پر فرق نہیں پڑتا۔ اب دیکھو! مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی نحو کتنی مضبوط ہے۔ میں اس لیے کہتا ہوں کہ تمہیں نحو آدھی آتی ہے اور حضرت نانوتوی کو پوری آتی ہے۔

علم پورا تو عقیدہ پورا:

میرا کراچی کا ایک سفر تھا تو میں نے وہاں ایک مدرسے میں پورے دو گھنٹے طلبہ میں اسی موضوع پر بیان کیا کہ جب علم ادھورا ہو تو عقیدہ ادھورا ہوتا ہے اور اگر علم پورا ہو تو عقیدہ پورا ہوتا ہے۔

آج بھی اٹک سے چند طلبہ ملنے کے لیے آئے تھے میرے شاگرد سے فون کروا کے، تو ہم نے انہیں پکوڑے کھلائے، حلوا کھلایا، مٹھائی کھلائی، بسکٹ کھلائے، انڈے کھلائے اور چائے پلائی۔ میں نے ان سے پوچھا آپ کیوں آئے ہیں؟ کہا کہ ہم کراچی میں پڑھتے ہیں، وہاں ہمارے ساتھ مماتی لڑکے پڑھتے ہیں، وہ ہمیں بہت تنگ کرتے ہیں کہ مولانا الیاس گھمن صاحب سے کہو کہ چیلنج لکھ کر دیں ہمارے فلاں مناظر نے مناظرہ کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ صدقے جاؤں! یہ تو اس طرح ہے کہ میں کہوں کہ میں نے تم سے کُشتی کرنی ہے اور چیلنج لکھ کر تم دو! بہت عجیب بات ہے، بھائی! جس کو کُشتی کا شوق ہے چیلنج لکھ کر بھی وہی دے گا نا! آپ نے اتنا لمبا سفر کیا ہے وہ مناظر چیلنج لکھ کر دے دیتا کہ جی میں مناظرہ کرنا چاہتا ہوں، پھر آپ مجھے کہتے کہ جی آپ بھی کرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ مناظرہ اس نے کرنا ہے اور چیلنج لکھ کر میں دوں؟ میں نے کہا کہ بیٹا یہ ترتیب تو غلط ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ نہ میں آپ کا باپ جانتا ہوں، نہ خاندان جانتا ہوں، نہ میں آپ کا گھر جانتا ہوں تو آپ کے نام پر میں لیٹر پیڈ پر مناظرہ لکھ دوں گا؟ کم از کم یہ بات تو سوچو! کہا: جی وہ ہمیں بہت تنگ کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ تمہیں اس لیے تنگ کرتے ہیں کہ تم ہمارے پاس نہیں پڑھتے، ہمارے

پاس پڑھو پھر تمہیں کوئی تنگ نہیں کرے گا، میں یہ تو نہیں کہتا کہ تم تنگ کروگے لیکن تمہیں تنگ کوئی نہیں کرے گا!

آپ ٹینشن دیتے ہیں، لیتے نہیں!

میں ایک دفعہ جامعۃ الرشید کراچی میں تھا تو مفتی عبدالرحیم صاحب جو جامعہ کے مہتمم ہیں اور میرے استاذ ہیں، میں نے ثالثہ والے سال ان سے پہلے تین پاروں کی ترکیب پڑھی ہے، مجھے استاد جی فرمانے لگے کہ تمہاری تین بیویاں ہیں تو تمہیں پریشانی نہیں ہوتی؟ میں نے کہا کہ استاذ جی! پریشانی اس کو بنتی ہے جس کو ٹینشن ہو، میں ٹینشن فری آدمی ہوں مجھے کوئی بھی پریشانی نہیں ہوتی۔ تو استاد جی فرمانے لگے: یہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ مسئلہ اور ہے۔ میں نے کہا: وہ کیا؟ فرمایا: ایک بندہ ہوتا ہے جو ٹینشن نہ لے اور ایک ہوتا ہے جو ٹینشن دے، تو تمہاری عادت ہے کہ تم دوسروں کو ٹینشن دیتے ہو اور پھر خود سکون سے سوتے ہو، یہ نہیں کہ تم ٹینشن لیتے نہیں ہو بلکہ تم نے پوری دنیا کو ٹینشن دی ہوئی ہے، لوگ پریشان ہیں اور تم سکون سے سوتے ہو، پھر تمہیں پریشانی کہاں سے ہونی ہے؟

طلبہ کو نصیحت:

اور یہی وجہ ہے -آپ یقین کریں- کہ ہمیں کوئی ٹینشن نہیں ہے الحمد للہ، بڑے سکون سے سوتے ہیں، یہ اللہ کا خاص کرم ہے، اللہ یہ سکون اور اطمینان آپ کو بھی نصیب فرمائے۔ (آمین۔ سامعین) گناہ چھوڑ دیں، تعلق مع اللہ مضبوط کریں، ذکر والی زندگی بنائیں اور کسی کے معاملات میں دخل اندازی نہ کریں، پھر دیکھیں کہ کیسے ٹینشن فری زندگی آپ کو ملتی ہے! آپ کے ساتھ ایک ساتھی بیٹھا ہے، اس کا میسیج آئے تو اسے پڑھنے دو، وہ غلط ہے یا ٹھیک ہے تمہارا اس سے تعلق نہیں ہے، اگر ایک مرتبہ شک پڑا کہ غلط میسیج ہے تو پھر پیچھے پڑ جائیں گے، چھوڑو ان باتوں کو اور اپنے کام

سے کام رکھو! بدگمانی کر کے خوامخواہ گناہ اپنے ذمہ ضرور لینا ہے؟! میں اس لیے کہتا ہوں کہ گناہ چھوڑو! تعلق مع اللہ بناؤ اور اپنے کام سے کام رکھو! آپ کو کبھی تکلیف نہیں ہو گی۔ دنیا جہاں کی تکلیفیں آپ اپنے سر لے کر پھرتے ہیں اور اپنی فکر نہیں ہوتی۔ یہ کس درد کے ساتھ یہ بات میں آپ کو سمجھاؤں! بطورِ خاص تخصص والوں سے کہتا ہوں کہ یہاں تمہارے اب بہت تھوڑے دن باقی ہیں، صرف اپنے کام سے کام رکھو، اپنے قریبی ساتھی کو بھی بھول جاؤ تم زندگی بھر مجھے دعائیں دو گے اور اگر یہ چار مہینے تم نے دوستی میں اور کھانے پینے اور گپ شپ میں گزار دیے تو زندگی بھر تم پچھتاؤ گے لیکن اس وقت پچھتانے کا کچھ فائدہ نہیں ہو گا۔ لہٰذا وقت کو قیمتی بناتے ہوئے حدیثیں یاد کرو، عقائد یاد رکھو، مسائل یاد کرو اور ہر روز نمازوں کے بعد جو بیان کرتے ہو اس کی سخت پابندی کرو، جمعرات کو خطابت کی پابندی کرو، بیانات اپنی زبان پر بار بار کہو اپنی زبان پر جاری کرو، پھر ان شاء اللہ ثم ان شاء اللہ جب موقع آئے گا پھر تمہیں اندازہ ہو گا کہ ہم نے کتنا اچھا کام کیا ہے۔

کثرت ذکر کا اہتمام کیجیے!

﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿٤١﴾﴾

اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کرو۔ اللہ تعالیٰ بار بار ذکر کا نہیں بلکہ کثرت ذکر کا حکم فرما رہے ہیں۔ ہماری اس طرح کی آیات کی طرف توجہ نہیں ہوتی، تو ذکر کی طرف ذہن نہیں جاتا اس لیے علماء اور طلبہ کو ذکر کا خوب اہتمام کرنا چاہیے۔

حضور علیہ السلام کی پانچ صفات کا تذکرہ:

﴿يَآ أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿٤٥﴾ وَّ دَاعِيًا
إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿٤٦﴾﴾

یہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ صفتیں بیان فرمائی ہیں:

1: ﴿شَاهِدًا﴾.... آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن اپنی امت یا دیگر انبیاء علیہم السلام کی امتوں پر گواہی دیں گے جب گزشتہ امتیں اپنے نبیوں کی تکذیب کریں گی کہ انہوں نے ہمیں دین کی دعوت نہیں دی، ان کے خلاف امت محمدیہ گواہی دے گی کہ اللہ! یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں، ان کے پیغمبر نے ان کو دعوت دی تھی، اللہ تعالی پوچھیں گے کہ تمہیں کیسے پتا ہے؟ تم تو اس وقت نہیں تھے۔ وہ کہیں گے کہ ہمیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم گواہی دیں گے کہ میری امت بالکل ٹھیک کہتی ہے، ان کو میں نے بتایا تھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بطور سرکاری گواہ کے قیامت کے دن پیش ہوں گے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بین القوسین میں "شَاهِدًا" کا معنی سرکاری گواہ کیا ہے۔

یہاں شاھداً کا معنی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر روزانہ یا ہفتے میں دو مرتبہ امت کے اعمال اجمالاً پیش ہوتے ہیں، ان اعمال کے پیش ہونے کی وجہ سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کل قیامت کے دن امت کے حق میں گواہی دیں گے۔

2: ﴿وَّ مُبَشِّرًا﴾.... بشارت دینے والے۔

3: ﴿وَّ نَذِيْرًا﴾.... اور ڈرانے والے۔

4: ﴿وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ﴾.... اور اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف بلانے والے۔

5: ﴿وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا﴾ اور ایسے چراغ ہیں جو امت کو روشنی دیتے ہیں۔

عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

آپ حیران ہوں گے کہ بظاہر اس آیت کا عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت

کے تحت بھی عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم بیان کیا ہے کہ "تمام انبیاء خصوصا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے گزرنے کے بعد بھی اپنی قبروں میں زندہ ہیں"[141]

اور بعض حضرات کا تو کہنا یہ ہے جیسا کہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس طرح دنیا میں سورج کی روشنی سے پوری انسانیت منور ہوتی ہے اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر کی روشنی سے تمام اہلِ ایمان کے قلوب معطر اور منور ہوتے ہیں۔ اس لیے جتنا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق گہرا ہو گا اتنا انسان اپنے دل میں نورانیت کو محسوس کرے گا۔

رخصتی سے قبل طلاق کا حکم:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَیْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ۝۴۹﴾

یہاں اس عورت کا مسئلہ بیان کیا جس کا نکاح ہوا ہو اور بغیر خلوت صیحہ کے اس کو طلاق ہو جائے، خلوت صیحہ کی ایک صورت جماع ہے اور ایک صورت یہ ہے کہ ایسی جگہ میسر ہو جائے جہاں شوہر ہمبستری پر قادر ہو تو اس کو بھی جماع کے قائم مقام سمجھا جائے گا۔ فرماتے ہیں کہ اس عورت کی کوئی عدت نہیں ہے۔ طلاق کے فوراً بعد کہیں نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے، ﴿فَمَتِّعُوْهُنَّ﴾ اس کو کچھ نفع دو، بہترین سا جوڑا تحفہ میں دو۔ شلوار، قمیص، دوپٹہ اور اوپر چادر بھی ہو، ﴿سَرِّحُوْهُنَّ﴾ اور عزت کے

141۔ معارف القرآن: ج7 ص177، 178

ساتھ انہیں رخصت کرو۔

پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی چند خصوصیات:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِیْۤ اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَیْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِیْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۫ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِیِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾

یہاں پر اللہ رب العزت نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کچھ اعزاز بیان فرمائے ہیں:

1: چار سے زائد بیویاں

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِیْۤ اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ﴾

اے پیغمبر! ہم نے آپ کے لیے وہ بیویاں بھی حلال کیں جن کا آپ نے حق مہر ادا کر دیا ہے۔ اس پر سوال یہ ہے کہ حق مہر پیغمبر ادا کریں تو بیوی حلال ہو جاتی ہے اور جب حق مہر امتی ادا کرے تو اس کے لیے بھی تو حلال ہو جاتی ہے، پھر یہ پیغمبر کی خصوصیت کیسے ہے؟

جواب یہ ہے کہ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت اس طرح ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ کے نکاح میں چار سے زائد بیویاں تھیں، اس کا مطلب یہ تھا کہ چار سے زائد بیویاں جن کا آپ نے حق مہر ادا کر دیا ہے وہ آپ کے لیے حلال ہیں اور باقی امت کے لیے چار سے زائد حلال نہیں ہیں۔

2: مالِ فیئ میں اعزاز

﴿وَمَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَیْكَ﴾

جو مالِ فئی اللہ نے آپ کو دیا ہے اس میں سے جو باندی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت میں آچکی ہے وہ بھی آپ کے لیے حلال ہے۔

ایک ہوتا ہے مالِ غنیمت اور ایک ہوتا ہے مالِ فئی۔ کفر سے جنگ ہو اور مال ملے یہ مالِ غنیمت ہے، بغیر جنگ کے فتح ہو اور مال ملے تو یہ مالِ فئی ہے لیکن عام طور پر مالِ غنیمت اور مالِ فئی دونوں کو مال فئی کہا جاتا ہے، اس لیے یہاں پر دونوں شامل ہیں، حتی کہ اگر کوئی باندی آئے اور اس کو خرید اجائے تو وہ بھی اس میں شامل ہے۔ مقصود صرف باندی ہے۔ تو فرمایا: اور جو آپ کی باندیاں ہیں وہ بھی آپ کے لیے حلال ہیں۔ اب اس پر بھی وہی سوال ہے کہ باندی تو امتی کے لیے بھی حلال ہے تو یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز اور خصوصیت کیسے ہے؟ اس کا جواب سمجھیں کہ اس معاملے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزار تین طرح سے ہے:

(۱): ایک اعزاز تو یہ ہے کہ جو باندی میدانِ جنگ میں آئے وہ تقسیم ہونے سے پہلے سپہ سالار یا امیر نہیں لے سکتا جبکہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق حاصل تھا کہ مالِ غنیمت تقسیم ہونے سے پہلے آپ جو چاہیں لے لیں، آپ کسی باندی کا انتخاب کریں تو آپ کے لیے جائز ہے جس طرح حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو آپ نے اپنے لیے مخصوص فرمالیا تھا، یہ نبی کا اعزاز ہے۔

(۲): اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم بادشاہ کسی مسلمان امیر المؤمنین کو ہدیہ بھیجے تو وہ امیر المؤمنین کا ذاتی مال نہیں ہوتا بلکہ وہ بیت المال میں جمع ہوتا ہے لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز یہ تھا کہ اگر آپ کو غیر مسلم بادشاہ براہ راست کوئی ہدیہ بھیجے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق حاصل تھا کہ خود لیں اور مال بیت المال میں جمع نہ کریں جس طرح مقوقس بادشاہ نے حضور کی خدمت میں حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا بھیجی ہیں اور آپ نے ان کو اپنے حرم میں رکھا ہے تو یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا

اعزاز ہے۔

(۳): اور تیسرا آپ کا اعزاز اس طرح ہے کہ امتی کی باندی ہو اور امتی کی وفات ہو جائے یا وہ طلاق دے دے تو اس کے بعد اس باندی سے نکاح کرنا جائز ہوتا ہے لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی باندی کا معاملہ اس طرح نہیں ہے، جس طرح پیغمبر کی وفات کے بعد ان کی بیوی سے امتی کا نکاح نہیں ہوتا اسی طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیغمبر کی باندی سے بھی کسی امتی کا نکاح نہیں ہوتا۔ تو یہ تین اعزاز ﴿وَ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ﴾ میں شامل ہیں۔

3: خاندان کی عورتوں سے نکاح

﴿وَ بَنٰتِ عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ﴾

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چچا کی بیٹیاں، پھوپی کی بیٹیاں، ماموں کی بیٹیاں اور خالہ کی بیٹیاں حلال کر دی گئیں لیکن ان کے لیے ایک شرط ہے ﴿الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ﴾ کہ انہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو۔ اب اس پر بھی سوال ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز کیسے ہے؟ چچا، پھوپی، ماموں، خالہ کی بیٹیاں تو ہر مسلمان صحابی کے لیے حلال تھیں؟

یاد رکھنا! یہاں پر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز یہ ہے کہ عام مسلمان کے لیے ان رشتہ داروں سے نکاح کرنا جائز تھا چاہے انہوں نے ہجرت کی ہو یا نہ کی ہو لیکن حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کی جو عورتیں تھیں ان کے ساتھ نکاح کرنا تب حلال تھا جب وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئیں۔ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا آپ کے چچا ابو طالب کی بیٹی خود فرماتی ہیں کہ میرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے

نکاح کیوں نہیں ہو سکتا؟ اس لیے کہ میں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت نہیں کی اور طُلَقَاء میں شامل ہوں، طُلَقَاء وہ لوگ ہیں کہ جب فتح مکہ ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نہ قتل کیا نہ غلام بنایا بلکہ ویسے چھوڑ دیا۔ تو یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز ہے۔

4: بغیر مہر کے نکاح

﴿وَ امۡرَاَۃً مُّؤۡمِنَۃً اِنۡ وَّہَبَتۡ نَفۡسَہَا لِلنَّبِیِّ اِنۡ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنۡ یَّسۡتَنۡکِحَہَا﴾

ایمان والی عورت جو اپنے آپ کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہدیہ کرے بغیر حق مہر کے اور پیغمبر پاک اس سے نکاح کرنا چاہیں تو نکاح ہو سکتا ہے۔ اب یہ اعزاز تو بڑا واضح ہے کہ امتی کے نکاح میں حق مہر شرط ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز یہ ہے کہ بغیر حق مہر کے آپ کسی سے نکاح کرنا چاہیں تو آپ کو اجازت ہے۔ ہاں ﴿وَ امۡرَاَۃً مُّؤۡمِنَۃً﴾ یہ مؤمنہ کی قید اللہ کے نبی کے لیے ہے، کتابیہ عورت سے امتی کا نکاح ہو سکتا ہے لیکن کتابیہ عورت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح جائز نہیں ہے۔ ﴿خَالِصَۃً لَّکَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ﴾ یہ اعزازات اور خصوصیات خالص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہیں، دوسرے ایمان والوں کے لیے نہیں ہیں۔

﴿قَدۡ عَلِمۡنَا مَا فَرَضۡنَا عَلَیۡہِمۡ فِیۡۤ اَزۡوَاجِہِمۡ وَ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُمۡ﴾ ہم نے ایمان والوں کے لیے جو احکامات ان کی بیویوں اور کنیزوں کے بارے میں ان پر مقرر کیے ہیں وہ ہمارے علم میں ہیں، لیکن آپ کو عام مسلمانوں کے ان احکامات سے مستثنیٰ قرار دیا ہے کیوں؟ ﴿لِکَیۡلَا یَکُوۡنَ عَلَیۡکَ حَرَجٌ﴾ یہ سب اس لیے ہے تاکہ اس میں پیغمبر کے لیے حرج نہ ہو بلکہ پیغمبر کے لیے راحت ہی راحت

ہو جائے۔

حضور علیہ السلام پر باری مقرر کرنا واجب نہیں:

﴿تُرۡجِیۡ مَنۡ تَشَآءُ مِنۡهُنَّ وَ تُـٔۡوِیۡۤ اِلَیۡكَ مَنۡ تَشَآءُ ؕ وَ مَنِ ابۡتَغَیۡتَ مِمَّنۡ عَزَلۡتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡكَ ؕ ذٰلِكَ اَدۡنٰۤی اَنۡ تَقَرَّ اَعۡیُنُهُنَّ وَ لَا یَحۡزَنَّ وَ یَرۡضَیۡنَ بِمَاۤ اٰتَیۡتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَ اللّٰهُ یَعۡلَمُ مَا فِیۡ قُلُوۡبِكُمۡ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیۡمًا حَلِیۡمًا ﴿۵۱﴾﴾

یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر باری مقرر کرنے کی پابندی نہیں ہے، آپ جس بیوی کے پاس رات گزارنا چاہیں آپ کی مرضی، نہ گزارنا چاہیں آپ کی مرضی۔

لیکن رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد اور اس اجازت کے ملنے کے باوجود بھی ازواج مطہرات میں ہمیشہ برابری قائم رکھی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسۡمِیۡ فِیۡمَا أَمۡلِكُ فَلَا تَلُمۡنِیۡ فِیۡمَا تَمۡلِكُ وَلَا أَمۡلِكُ.[142]

اے اللہ! جس چیز میں میرا اختیار ہے اس میں تو میں نے تمام بیویوں میں برابری سے کام لیا ہے، دل تیرے اختیار میں ہے، یہ میرے اختیار میں نہیں ہے، اللہ! اس پر میرا مواخذہ نہ فرمانا! دل کی محبت کسی سے کم ہو کسی سے زیادہ ہو تو اس پر مواخذہ نہ فرمانا!

ہاں امتی کے لیے باری مقرر کرنا واجب ہے۔ ایک بات یاد رکھنا! اگر ایک

142۔ سنن ابی داؤد، رقم:2134

سے زائد نکاح ہوں تو مرد کے ذمہ باری مقرر کرنا تو ہے کہ ایک رات ایک کے پاس، دوسری رات دوسری کے پاس گزارے لیکن ہمبستری میں باری ضروری نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مباشرت کا تعلق بندے کے قلبی میلان کے ساتھ ہوتا ہے اور دل کا میلان ہر ایک کی طرف نہیں ہوتا۔ اس لیے اس میں برابری نہیں ہوتی۔

اچھا اسی طرح باری مقرر کرنا حضر میں تو شرط ہے لیکن سفر میں شرط نہیں ہے۔ ہر دفعہ شوہر ایک ہی بیوی کو سفر میں لے کر جائے اور دوسری کو نہ لے کر جائے تو اس کی بھی اجازت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سفر میں بنیادی چیز ہے راحت، اس راحت کی وجہ سے روزہ بھی معاف ہے کہ بعد میں رکھ لو، نماز مکمل نہیں بلکہ قصر ہے، اس کی بنیادی وجہ راحت ہے تو جس بیوی سے آدمی کا مزاج نہیں ملتا، اگر اس کو سفر میں رکھے گا تو راحت کے بجائے مشقت ہو گی۔ تو شریعت نے سفر میں باری کی پابندی ہی ختم فرما دی۔

میں اس لیے کہتا ہوں کہ لوگ یہ تو کہتے ہیں کہ عدل بہت مشکل ہے، عدل بہت مشکل ہے لیکن جو سہولتیں شریعت نے دی ہیں ان کی طرف کسی کی نظر نہیں جاتی، دیکھو! ہمبستری بھی شرط نہیں ہے، سفر میں باری بھی شرط نہیں ہے، باقی رہا کھانا پینا وہ تو آپ نے برابر دینا ہی ہے، رات گزارنے میں برابری تو آپ نے کرنی ہی ہے، اب بتاؤ اس میں عدل کرنا کون سا مشکل کام ہے؟

﴿وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ﴾

آپ نے کسی بیوی کو الگ کیا ہوا ہو، اس سے اجتناب کا ارادہ کر لیا ہو اور پھر واپس بلانا چاہیں تو بلا سکتے ہیں، آپ پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

ازواجِ مطہرات کی خوشی:

﴿ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَآ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ایسی چیز ہے کہ جس سے ازواجِ مطہرات کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی، وہ غمزدہ نہیں ہوں گی اور جو کچھ آپ دیں گے اس پر خوش ہو جائیں گی۔

اب یہاں ایک بات سمجھیں! آپ جس کو چاہیں باری دیں جس کو چاہیں باری نہ دیں اس سے اُن کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے اللہ رب العزت نے اپنے نبی کو اختیار دیا ہے کہ آپ کسی بیوی کو رات دیں یا نہ دیں آپ کی مرضی، تو جب ان باری اُن کا حق ہی نہیں ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی ہے، چاہیں تو باری دیں چاہیں تو نہ دیں۔ دکھ تو تب ہوتا ہے جب استحقاق ہو اور نہ ملے جبکہ یہاں تو استحقاق والا معاملہ ہی نہیں۔ دونوں صورتوں میں ازواجِ مطہرات کی آنکھیں ٹھنڈی ہی ٹھنڈی ہیں۔

نکاح کے متعلق ایک اور حکم:

﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَ لَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ۗ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ﴿۵۲﴾﴾

اس آیت کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات کو بلایا اور فرمایا کہ اگر تم دنیا چاہتی ہو تو میں تمہیں دنیا دے کر رخصت کر دیتا ہوں اور اگر دنیا چھوڑ کر میرے پاس رہنا چاہتی ہو تو میرے نکاح میں رہو! انہوں نے کہا کہ حضور! ہم آپ کے پاس رہنے کے لیے تیار ہیں۔ جب ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے یہ قربانی دی تو اللہ نے ان کو پھر اعزاز یہ بخشا کہ اپنے نبی سے فرمایا: ﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَ لَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ﴾ اے پیغمبر! جو ابھی آپ کی نو بیویاں نکاح میں ہیں ان کے بعد دسویں سے آپ نکاح نہیں کر

سکتے کیونکہ انہوں نے قربانی دی ہے اور آپ یہ بھی نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کسی کو طلاق دے دیں اور اس کی جگہ کسی اور سے نکاح کر لیں کہ نو کا عدد پورا ہو جائے، اور اسی طرح ازواج مطہرات کو بھی پابند کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تم بھی کسی سے نکاح نہیں کر سکتی، تو یہ دونوں کے لیے اعزاز ہے۔

اور بعض حضرات نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ جو رشتے ہم نے آپ کو بتائے ہیں ان کے علاوہ کسی اور جگہ آپ نکاح نہیں کر سکتے۔ کیا مطلب کہ اگر آپ اپنی کسی رشتہ دار عورت سے نکاح کرنا چاہیں تو اس کے لیے مہاجرہ ہونا شرط ہے، اگر رشتہ دار عورتوں کے علاوہ کسی اور عورت سے نکاح کرنا چاہیں تو اس کے لیے مؤمنہ ہونا شرط ہے، رشتہ دار ہو اور غیر مہاجرہ ہو تو آپ نکاح نہیں کر سکتے، عام عورت ہو اور مؤمنہ نہ ہو تو آپ اس سے بھی نکاح نہیں کر سکتے، یہ پابندی تھی۔ اب اس کا مطلب یہ ہے کہ جو پہلے آپ کے لیے نکاح کا مسئلہ بیان فرمایا گیا ہے یہ حکم اس کے لیے مزید توضیح اور تاکید ہے، یہ نہیں کہ کسی اور نکاح پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ تو بعضوں نے اس کو ترجیح دی ہے اور یہ بھی ٹھیک ہے۔

کھانے کی دعوت کے آداب:

﴿يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَدۡخُلُوۡا بُيُوۡتَ النَّبِىِّ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡذَنَ لَـكُمۡ اِلٰى طَعَامٍ غَيۡرَ نٰظِرِيۡنَ اِنٰٮهُ ۙ وَلٰـكِنۡ اِذَا دُعِيۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡا فَاِذَا طَعِمۡتُمۡ فَانۡتَشِرُوۡا وَلَا مُسۡتَاۡنِسِيۡنَ لِحَدِيۡثٍ﴾

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔ آپ نے ولیمہ کیا اور لوگوں کو بلایا تو بعض احباب کھانا تیار ہونے سے پہلے آ گئے۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر تو چھوٹا سا تھا، بٹھانے کی جگہ نہیں تھی تو

حضرت زینب دیوار کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئیں۔ کھانا کھا لیا گیا لیکن بعض لوگ نہیں اٹھے اور وہیں پر باتیں کرنے کے لیے جم کر بیٹھ گئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ناگوار گزرا تو آپ اٹھ کر باہر تشریف لے گئے۔ آپ جب واپس آئے تو دیکھا کہ لوگ پھر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس سے آپ کو ناگواری ہوئی تو ان لوگوں کو احساس ہوا اور وہ اٹھ کر چلے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر بعد گھر سے باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ یہ آیت ابھی نازل ہوئی ہے ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ﴾

ہمیشہ کے لیے یہ باتیں یاد رکھیں:

1: جن کو کھانے پر بلایا جائے کھانے پر صرف وہ آئیں۔

2: کھانے سے پہلے جا کر نہ بیٹھیں، اس سے میزبان کو مشغول ہونا پڑتا ہے۔

3: کھانا کھا کر چلے جایا کریں، وہاں بیٹھے نہ رہیں۔

ان تین آداب کا خیال رکھیں لیکن یہ اس وقت ہے کہ جب آپس میں بے تکلفی نہ ہو، بیٹھنے کی اور جگہ نہ ہو اور عرف یہ ہو کہ کھانا کھانے کے بعد چلا جانا چاہیے لیکن جس طرح آج کل ہمارے ہاں شادی ہالوں میں ٹینٹ لگے ہوتے ہیں، شادی ہال بُک ہوتے ہیں، گیارہ بجے تک بکنگ ہوتی ہے اب آپ بیٹھے رہیں نہ ٹینٹ لگانے والوں کو ٹینشن ہے نہ آپ کو ٹینشن ہے۔ تو یہ معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ بس اس کا خیال کیا کریں۔

﴿اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ﴾

اس سے حضور کو تکلیف ہوتی ہے لیکن اللہ کے نبی حیا محسوس فرماتے ہیں تمہیں زبان سے کہتے نہیں، اس لیے تم خود خیال کیا کرو!

حضور علیہ السلام کو تکلیف دینا جائز نہیں:

﴿وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا﴾

تمہارے لیے یہ بات جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف دو اور نہ یہ جائز ہے کہ پیغمبر کے جانے کے بعد ان کی بیوی سے کبھی بھی نکاح کرو۔

میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ ﴿وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ﴾ سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں امت کی مائیں ہیں لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ان سے نکاح کرنا حرام ہے۔ اس کی وجہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی اگر امت کی ماں ہے تو حضور امت کے باپ ہیں، اگر اس بنیاد پر نکاح حرام ہوتا تو امتیوں کا باپ ہونے کی بنیاد پر خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حرام ہوتا امت کی لڑکیوں سے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح جائز ہے۔ تو بنیاد وہ نہیں ہے بلکہ بنیاد یہ آیت ہے کہ پیغمبر کی بیوی سے نکاح نہ کرو اور نکاح نہ کرنے کی علت یہ ہے؟ ﴿وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ﴾ یہ طبعی اور فطری بات ہے کہ جو غیور آدمی ہے وہ اپنی منکوحہ کو خواہ طلاق دے دے کسی اور کو اس کا شوہر بننا اسے طبعاً ناگوار گزرتا ہے، تو عام بندے کی طبعی ناگواری کا خیال نہیں رکھا گیا لیکن پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طبعی تقاضے کا اللہ تعالیٰ نے خیال فرمایا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اعزاز دیا ہے، فرمایا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی سے کبھی نکاح نہ کرنا کہ اس سے نبی کو طبعاً ناگواری محسوس ہو گی۔

پردے کا حکم:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ

عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۹﴾

یہاں پردے کی بات فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: اپنی بیویوں سے فرماؤ، اپنی بیٹیوں سے فرماؤ اور ایمان والی عورتوں سے فرماؤ! اس سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی بھی ایک نہیں بلکہ ایک سے زائد ہیں کیونکہ "اَزْوَاجِكَ" فرمایا اور آپ کی بیٹیاں بھی ایک نہیں بلکہ ایک سے زائد ہیں کیونکہ "بَنٰتِكَ" فرمایا۔ اب یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ "بَنٰتِكَ" سے مراد پیغمبر کی حقیقی بیٹیاں نہیں بلکہ پیغمبر کی کلمہ گو بیٹیاں یعنی امتی عورتیں ہیں، تو یہ بات ٹھیک نہیں ہے اس لیے کہ آگے ان کے لیے ﴿وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ مستقل الفاظ موجود ہیں، اگر ﴿وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ نہ ہوتا تو پھر تو ان لوگوں کو کچھ اعتراض کی گنجائش تھی، جب ﴿وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ کا لفظ آگیا تو اب اعتراض کی گنجائش موجود نہیں۔

آیتِ مباہلہ کا صحیح مفہوم:

یہاں لفظ "نِسَآءِ" ہے۔ مجھے اس پر ایک واقعہ یاد آیا۔ اس گزشتہ جمعرات کو جو ہمارے ہاں طلبہ آئے تھے تو ان میں سے ایک طالب علم نے مجھ سے ایک سوال کیا کہ قرآن کریم سورۃ آل عمران میں ہے:

﴿فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ﴾[143]

143۔ آل عمران 61:3

کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ ہم اپنے بیٹوں کو لائیں اور تم اپنے بیٹوں کو لاؤ!

ہم اپنی بیویوں کو لائیں اور تم اپنی بیویوں کو لاؤ اور ہم خود آئیں اور تم خود بھی آؤ!

پھر اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بیوی ساتھ نہیں لائے کیونکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تو پہلے فوت ہو گئی تھیں، اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت خدیجہ کے علاوہ کوئی آپ کی بیوی تھی ہی نہیں! پھر اس میں حضرت علی، حضرت حسن، حضرت حسین اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہم کو لائے، کسی اور بیٹی کو بھی نہیں لائے، اگر آپ کی کوئی اور بیٹی ہوتی تو اسے بھی لاتے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی کوئی اور بیٹی تھی ہی نہیں!

میں نے کہا کہ قرآن کریم کی آیت پڑھو ذرا! آیت ہے: ﴿فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ﴾ کہ ہم اپنے بیٹے لائیں اور تم اپنے بیٹے لاؤ! تو بتاؤ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بیٹا لائے تھے؟ کہا جی نہیں! میں نے کہا: حضور نے بیٹے مانگے یا بیٹیاں؟ تقاضا بیٹوں کا تھا یا بیٹیوں کا؟ کہا: جی بیٹوں کا تھا۔ تو میں نے کہا کہ آپ تو کہتے ہیں کہ "اگر آپ کی کوئی اور بیٹی ہوتی تو اسے بھی لاتے" مباہلے میں تو بیٹیوں کا تقاضا ہی نہیں کیا تو لاتے کیوں؟

اہلِ رفض کا استدلال تو یہی ہے نا! وہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بیٹی ہے، کیونکہ جب آیتِ مباہلہ نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بیٹی کو لائے تھے اور بیٹیاں ہوتیں تو ان کو بھی لاتے۔ میں نے کہا کہ اور بیٹیاں تب لاتے جب بیٹیوں کا تقاضا ہوتا، یہاں تو "ابناء" کا لفظ ہے کہ بیٹے لاؤ! بیٹیوں کا تو مطالبہ ہی نہیں ہے تو پھر کیوں لاتے؟ تو پھر ایک کیوں آئی؟ اس لیے کہ موقع پر ایک موجود تھی تو اسے لے آئے، کیونکہ تقاضا تو تھا ہی نہیں۔

﴿وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ﴾ اب یہ سوال کہ "اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی حضرت خدیجہ کے علاوہ اور بیویاں ہوتیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لاتے" یہ سوال تب تھا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مباہلہ کے لیے آئے ہوں، نہ مباہلہ کا چیلنج ان عیسائیوں نے قبول کیا نہ دونوں طرف سے خود کو، بیٹوں کو اور بیویوں کو آنا پڑا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تھوڑا کہا تھا کہ میں بھی لے آیا ہوں تم بھی لے آؤ! بلکہ یہ کہا تھا کہ اگر تم مباہلہ کرتے ہو تو تم بھی لاؤ میں بھی لاؤں گا، وہ تو اتفاقاً اس موقع پر حضرت علی، حضرات حسنین کریمین اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھے تو انہی کے نورانی چہروں کو دیکھ کر وہ لوگ دوڑ گئے۔

﴿وَ اَنۡفُسَنَا وَ اَنۡفُسَکُمۡ﴾ میں نے کہا کہ یہاں ﴿وَاَنۡفُسَنَا﴾ ہے "نَفۡسَنَا" تو نہیں ہے، پھر بتاؤ حضور کتنے نفوس لے کر گئے تھے؟ کہتا ہے: جی چار لے کر گئے تھے۔ تو میں نے کہا: پھر ﴿اَبۡنَآءَنَا﴾ میں کون ہے؟ ﴿نِسَآءَنَا﴾ میں کون ہے؟ پھر تو ﴿اَنۡفُسَنَا﴾ کہنا کافی تھا، باقی کی ضرورت کیا تھی؟!

ستر عورت اور حجابِ نساء میں فرق:

یہاں حجاب کے متعلق سمجھیں! ایک ہوتا ہے ستر عورت اور ایک ہوتا ہے حجابِ نساء۔ ستر عورت الگ ہے اور حجاب نساء الگ ہے۔ ستر عورت کا معنی ہوتا ہے اپنے جسم کے پوشیدہ حصوں کو چھپانا، یہ مرد کے لیے بھی ہے اور عورت کے لیے بھی ہے۔ ناف سے لے کر گھٹنے تک یہ مرد کا ستر ہے اس کو چھپانا ضروری ہے اور یہ جلوت میں بھی ہے اور خلوت میں بھی ہے، جس طرح لوگوں کے سامنے جائز نہیں ہے اسی طرح بغیر ضرورت آدمی تنہا ہو تب بھی کھولنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح عورت کا ستر ہے۔ ایک ہے عورت کا ستر عورتوں سے اور ایک ہے عورتوں کا پردہ نامحرموں سے، یہ دو چیزیں بالکل الگ الگ ہیں۔ اب کتنا حصہ عورت کو چھپانا ضروری ہے؟ تو عورت کا

عورت سے وہی ستر ہے جو مرد کا مرد سے ہے اور اگر محرم ہو تو پھر عورت کا ستر الگ ہے، پھر فرق پڑ جاتا ہے۔ میں یہ اس لیے سمجھا رہا ہوں کہ ستر عورت الگ چیز ہے اور حجاب نساء الگ چیز ہے۔

اور عورت کا حجاب تین قسم کا ہے؛

(۱): ایک ہوتا ہے حجاب بالبیوت کہ عورت گھر میں رہے، پردہ کرے اور بالکل باہر نہ نکلے، ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ یہ حکم ہے۔

(۲): اور ایک ہوتا ہے عورت کا حجاب بالبرقعہ یعنی عورت ایک لمبی چادر لے جس سے اس کا پورا جسم چھپ جائے۔

(۳): اور ایک ہوتا ہے عورت کا حجابِ شرعی کہ عورت کا پردہ کیا ہے؟!

یہ تو طے شدہ ہے کہ عورت کو پورے جسم کا پردہ کرنا چاہیے۔ چہرے اور ہتھیلیوں کو بھی امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ ستر کا حصہ مانتے ہیں، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾[144] میں شامل کرکے فرماتے ہیں کہ فتنے کا اندیشہ نہ ہو تو چہرہ، ہتھیلیاں اور پاؤں کا اوپر والا حصہ کھول سکتی ہے، فتنے کا اندیشہ ہو تو پھر کھولنا جائز نہیں ہے، اور آج کے دور سے زیادہ فتنہ کس دور میں ہو گا؟ اس لیے عورت کا پورا جسم ستر ہے۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

مقتدا کی شرائط؛ عقل اور ہدایت

﴿وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿٦٧﴾﴾

کفار اور مشرکین یہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں

144۔ النور 31:24

اور اپنے بڑوں کی بات مانی اور انہوں نے ہمیں سیدھے راستے سے بھٹکا دیا۔

اس آیت کا تعلق کفار اور مشرکین کے ساتھ ہے اور غیر مقلدین اسے فِٹ کرتے ہیں اکابرین پر۔ یاد رکھنا! جہاں قرآن کریم نے آباء و اجداد کی بات ماننے سے منع کیا ہے ساتھ ایک جملہ ہے:

﴿اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾﴾[145]

کہ اگر آباء و اجداد میں عقل بھی نہ ہو اور وہ ہدایت پر بھی نہ ہوں تو پھر بھی ان کی بات مانو گے؟

اس سے معلوم ہوا کہ اگر عقل اور ہدایت موجود ہو تو پھر ان کی بات مان لینی چاہیے۔ یہ دو شرطیں ذہن میں رکھیں اور جن کی ہم بات مانتے ہیں ان میں عقل بھی ہے اور ان میں ہدایت بھی ہے۔

بنی اسرائیل کا الزام اور موسیٰ علیہ السلام کی براءت:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴿۶۹﴾﴾

صحیح البخاری میں روایت موجود ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کی عادت یہ تھی کہ ان کے مرد سب کے سامنے ننگے ہو کر نہاتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی بھی ہیں، معصوم بھی ہیں، حیا بھی ہے تو آپ اس طرح نہیں کرتے تھے۔ بنی اسرائیل نے ان پر تہمت لگائی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام میں کوئی جنسی بیماری ہے۔ بعض نے کہا کہ ان کے خصیتین بہت بڑھے ہوئے ہیں، کسی نے کہا کہ ان کا جو عضو ہے اس میں کوئی بیماری ہے، یہ الزام لگاتے اور مذاق

145۔ البقرۃ 170:2

بھی اڑاتے تھے۔ ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہانے کے لیے کپڑے اتار کر ایک پتھر پر رکھ دیے۔ معجز تاً وہ پتھر وہاں سے چل پڑا۔

موسیٰ علیہ السلام غسل کے بعد پتھر کے پیچھے پیچھے چلتے گئے اور یہ کہہ رہے تھے کہ "ثَوْبِيْ حَجَر، ثَوْبِيْ حَجَر" اے پتھر! میرے کپڑے دے دو، اے پتھر! میرے کپڑے دے دو! جہاں بنی اسرائیل کے لوگوں کا ایک بڑا مجمع تھا یہ پتھر وہاں آ کر رک گیا۔ تو اس وقت لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کے مبارک جسم کو دیکھا تو ان پر کوئی عیب موجود نہیں تھا۔ موسیٰ علیہ السلام جلالی نبی تھے۔ آپ نے کپڑے پہنے اور آپ کے ہاتھ میں جو لاٹھی تھی پتھر کو تین چار ماریں تو پتھر پر نشان پڑ گئے جیسے بندے کو مارنے پر پڑتے ہیں۔ تو موسیٰ علیہ السلام کا وہاں پر بے عیب ہونا واضح ہو گیا۔

فرمایا "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى" کہ اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ بننا جنھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف دی تھی، میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بھی تکلیف نہ دینا۔[146]

قولِ سدید اور قولِ صواب میں فرق:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿٧٠﴾ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿٧١﴾﴾

ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور درست بات کرو۔ تقویٰ اور درست بات کی وجہ سے اللہ تمہارے اعمال کی اصلاح فرما دیں گے کہ اعمال میں جو کمی رہ جائے گی اللہ اپنے کرم سے معاف فرما دیں گے۔

146۔ صحیح البخاری، رقم:3404

ایک ہوتا ہے قول سدید اور ایک ہوتا ہے قول صواب، دونوں میں فرق ہے۔ قولِ سدید اس قول کو کہتے ہیں جس میں کذب نہ ہو اور قولِ صواب اس قول کو کہتے ہیں جس میں خطا نہ ہو۔ اس لیے اجتہاد میں صواب اور خطا ایک دوسرے کے مقابلے میں آتے ہیں، صواب اور کذب مقابلے میں نہیں آتے۔

انسان؛ بارِ امانت کا حامل

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴿۷۲﴾﴾

"امانت" سے مراد شریعت ہے۔ اللہ رب العزت نے امانت یعنی عقائد اور اعمال دونوں پیش فرمائے آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر اور ساتھ اختیار دیا کہ تم چاہو تو لے لو اور تم چاہو تو نہ لو۔ اگر لو گے اور ان پر عمل کرو گے تو ہم تمہیں ثواب دیں گے اور اگر تم ان کو لے لو لیکن پھر اپنا نہ سکو تو تمہیں عذاب ہو گا۔ ﴿فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا﴾ تو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں نے اس بار کو اٹھانے سے انکار کر دیا، ﴿وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا﴾ اور ڈر گئے، ﴿وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ﴾ اور نوع انسانی نے اس کو اٹھا لیا، فردِ بشر نے نہیں بلکہ نوعِ انسانی نے اس کو اٹھا لیا، ﴿اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾ اس میں دو کوتاہیاں بیان کی ہیں: ایک علمی اور ایک عملی۔ عملی کوتاہی یہ ہے کہ یہ ظلوم ہے اور علمی کوتاہی یہ ہے کہ یہ جہول ہے۔ دونوں کوتاہیاں ہیں۔ عمل میں کمی کرتا ہے یعنی زیادتی کرتا ہے تو ظالم ہے اور علم کمزور ہے یعنی اعتقادات ٹھیک نہیں ہوتے تو جاہل ہے، اور یہ ہر ہر انسان کے بارے میں نہیں ہے بلکہ یہ اکثر نوع بشر کے حوالے سے ہے کہ عموماً ان میں سے اکثر ظالم اور جاہل ہی نکلے ہیں، سب نے اس امانت کو اٹھایا نہیں ہے۔

یہاں بات سمجھیں! اس آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آسمان اور زمین اور پہاڑ انہوں نے انکار کیا ہے۔ انکار کرنا عیب نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالی نے اختیار دیا تھا جس طرح حضرت لقمان کے بارے میں میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ تعالی نے انہیں اختیار دیا تھا کہ نبوت چاہیے یا حکمت؟ عرض کیا کہ حکمت۔ نبوت کیوں نہیں؟ کہا: خود اللہ تعالی دیتے تو میں لے لیتا، اب مجھے اختیار دیا ہے، جب میرے اختیار سے ملے گی تو ہو سکتا ہے کہ میں نباہ نہ سکوں۔ تو ان کو بھی اختیار دیا تھا اور انہوں نے انکار کر دیا۔ جبکہ قرآن کریم کے چوبیسویں پارے میں ہے:

﴿فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآىِٕعِيْنَ﴾[147]

اللہ نے آسمان اور زمین سے فرمایا تھا کہ جبراً ہو یا خوشی سے تم نے ہماری بات ماننی ہے تو آسمان اور زمین نے کہا کہ ہم خوشی سے مانتے ہیں۔

تو سورۃ حٰم السجدۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان اور زمین نے بات لی ہے اور یہاں سورۃ الاحزاب سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بات نہیں لی۔ بظاہر دونوں میں تعارض ہے۔ جواب یہ ہے کہ تعارض نہیں ہے کیونکہ یہ جو سورۃ حٰم السجدۃ میں ہے اس سے امور تشریعی نہیں بلکہ امور تکوینی مراد ہیں کہ جو تمہارے ذمہ کام ہے تم نے کرنا ہے۔ خوشی سے کرو یا مجبور ہو کر کرو، تم نے کرنے ہیں۔ تو ان دونوں نے کہا کہ ہم خوشی سے کریں گے، اور یہاں جو فرمایا کہ ہم نے امانت پیش کی اور انہوں نے انکار کر دیا تو یہ امور تکوینیہ نہیں بلکہ امور تشریعیہ ہیں، کہا کہ امور تشریعیہ ہمارے بس میں نہیں ہیں، ہم اس پر معذرت کرتے ہیں، ہم کمزور ہیں، ہاں تکوینی امور ہم کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اب ان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

147۔ حٰم السجدۃ 11:11

ایمان اور کفر کا انجام:

﴿لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ وَ يَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۳﴾﴾

نوعِ انسانی نے جو امانت کا بار اٹھایا تھا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ انسانوں کے دو گروہ بن جائیں گے، ایک اس امانت کا پاس رکھنے والے اور دوسرے اس امانت کو ضائع کرنے والے۔ امانت کا پاس رکھنے والے اور اس کے تقاضے پر عمل کرنے والے مومنین ہیں اور اس کو ضائع کرنے والے منافقین اور مشرکین ہیں۔ تو فرمایا کہ اس امانت کو ضائع کرنے والے منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو اللہ عذاب دے گا اور مومن مردوں اور مومن عورتوں پر اللہ متوجہ ہو گا، ان کی توبہ کو قبول کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ توبہ کو کیوں قبول کرتے ہیں؟ فرمایا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے، "غفوراً" صفت اول ہے اور "رحیماً" صفت ثانی ہے۔

عام طور پر قرآن کریم میں جب اللہ تعالیٰ دو صفتیں اس طرح جمع فرمائیں تو اس میں صفتِ اول دعویٰ ہوتی ہے اور صفت ثانی دلیل ہوتی ہے۔ تو "غفوراً" دعویٰ ہے اور "رحیماً" اس کی دلیل ہے۔ یہ کیوں فرمایا؟ تاکہ کوئی بندہ یہ نہ سمجھے کہ چونکہ میں نے توبہ کی ہے تو اللہ کے ذمہ ہے میری توبہ کو قبول کرنا، فرمایا کہ جب تم توبہ کرتے ہو تو ہم قبول کر لیتے ہیں لیکن قبول کرنا ہمارے ذمے نہیں ہے بلکہ قبول اس لیے کرتے ہیں کہ ہم رحیم ہیں اور ہماری رحمت کا تقاضا ہے کہ تمہاری توبہ کو قبول کر لیں۔

اللہ سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ سبا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ وَ لَہُ الۡحَمۡدُ فِی الۡاٰخِرَۃِ ؕ وَ ہُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱﴾ یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ فِی الۡاَرۡضِ وَ مَا یَخۡرُجُ مِنۡہَا وَ مَا یَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعۡرُجُ فِیۡہَا ؕ وَ ہُوَ الرَّحِیۡمُ الۡغَفُوۡرُ ﴿۲﴾﴾

تسبیحِ داؤدی میں پرندوں اور پہاڑوں کی شرکت:

﴿وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضۡلًا ؕ یٰجِبَالُ اَوِّبِیۡ مَعَہٗ وَ الطَّیۡرَ ۚ وَ اَلَنَّا لَہُ الۡحَدِیۡدَ ﴿۱۰﴾﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی طرف سے خاص فضیلت عطا کی تھی۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ ہم نے پہاڑوں کو حکم دیا تھا کہ اے پہاڑو! تم ان کے ساتھ تسبیح کرو اور پرندوں کو بھی یہی حکم دیا تھا۔

”اَوِّبِیۡ“ یہ ”اَوَّبَ، یُاَوِّبُ، تَاۡوِیۡبًا“ سے مشتق ہے، اس کا معنی ہے دہرانا، لوٹانا۔ حضرت داؤد علیہ السلام تسبیح پڑھتے تو ان کے ساتھ پہاڑ اور پرندے بھی تسبیح کرنے لگتے تھے اور اس کو دہراتے تھے۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام جب تسبیح پڑھتے تو پہاڑوں میں گونج کی آواز پیدا ہوتی کیونکہ تاویب کا معنی گونج نہیں

بلکہ مستقل دوسری آواز ہے۔ اسی طرح یہ جو پہاڑ تسبیح پڑھتے تھے یہ ایسی تسبیح تھی جس کے پڑھنے کو لوگ سنتے اور محسوس بھی کرتے تھے۔ اگر مطلق تسبیح پڑھنا مقصود ہو تو پھر یہ حضرت داؤد علیہ السلام کا اعزاز نہیں ہے کیونکہ تسبیح تو ساری چیزیں پڑھتی ہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾[148]

کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو لیکن تم اس کی تسبیح کو سمجھتے نہیں۔

تو سارے پہاڑ اور پرندے تسبیح تو کرتے ہیں لیکن لوگ اس تسبیح کو سمجھتے نہیں ہیں کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں اور حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ جو تسبیح کرتے تھے اس سے مراد ایسی تسبیح ہے کہ جس کو لوگ سنتے اور سمجھتے تھے کہ یہ کیا کہتے ہیں۔

اپنے بارے میں لوگوں کی آراء معلوم کرنا:

﴿وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ﴿١٠﴾﴾

حضرت داؤد علیہ السلام اپنے بارے میں لوگوں کی آراء معلوم کرتے تھے کہ لوگ مجھے کیسا سمجھتے ہیں؟ اس کا معنی یہ نہیں کہ لوگ میری تعریف کرتے ہیں بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر میرے اندر کوئی ایسی بات ہے جو پسند نہیں ہے تو میں اسے بدلوں گا۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی طریقہ تھا۔ آپ اپنے بارے میں معلومات لیتے تھے کہ لوگ میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ تو حضرت داؤد علیہ السلام بسا اوقات بازار میں جاتے باہر سے جو لوگ شہر میں آتے جو ان کو شکل سے نہیں جانتے تھے تو حضرت داؤد علیہ السلام ان سے پوچھتے داؤد کیسا آدمی ہے؟ تو ہر بندہ ان کی

148۔ الاسراء 44:17

تعریف کرتا۔

اللہ رب العزت نے ان کی تربیت کے لیے ایک فرشتہ بھیجا۔ اس سے پوچھا کہ داؤد کیسا آدمی ہے؟ فرشتے نے کہا کہ اپنی ذات کے لیے اور لوگوں کے لیے تو بہت اچھا ہے بس اس میں ایک تھوڑی سی کمی ہے کہ بیت المال سے وظیفہ لیتا ہے، اگر بیت المال سے نہ لے اور اپنا کما کر کھائے تو بہت اچھا آدمی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام آئے، اللہ کے سامنے روئے اور گڑگڑائے اور کہا کہ اے اللہ! بات تو ٹھیک ہے، مجھے ایسے اسباب عطا فرمادیں کہ میں اپنا کماؤں اور اپنا کھاؤں اور دین کا کام کروں، پہلے بیت المال سے وظیفہ لیتے تھے پھر جب داؤد علیہ السلام نے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے بطورِ معجزہ لوہے کو آپ کے ہاتھ پر نرم کر دیا جس طرح آدمی رسی کو موڑے تو آسانی سے مڑ جاتی ہے تو حضرت داؤد علیہ السلام بھی لوہا اپنے ہاتھ سے جدھر موڑتے وہ مڑ جاتا تھا، اس سے داؤد علیہ السلام محنت کرتے کمائی کرتے اور باقی وقت تبلیغ میں لگا دیتے۔

اس لیے علماء کو چاہیے کہ وہ دین کا کام کریں اور کوشش کریں کہ معاش ان کا اپنا ہو لیکن اپنا معاش ایسا نہ ہو کہ جس سے دین کا کام ختم ہو جائے۔ دونوں میں فرق سمجھیں۔ بعض لوگ تعلیم سے فراغت کے بعد اپنا مال کماتے ہیں کہ ہم لوگوں کا نہیں کھائیں گے، اپنا کما کر کھائیں گے اور دین کا کام کریں گے لیکن تجارت میں اتنا منہمک ہو جاتے ہیں کہ دین کا کام نہیں کرتے تو اس سے بہتر ہے کہ تنخواہ لے کر دین کا کام کرتے رہیں۔

باقی جو ہم علماء دین کا کام کرتے ہیں اور اس پر تنخواہ لیتے ہیں تو یہ جائز ہے لیکن جائز اس نیت سے ہے کہ آدمی اس نیت سے تنخواہ لے کہ اللہ تو مجھے اسباب عطا فرما تو میں تنخواہ لینا چھوڑ دوں گا اور بغیر تنخواہ کے دین کا کام کروں گا اور جب اسباب ملیں تو پھر تنخواہ چھوڑ دیں۔ یہ ہے عبادت! یہ نہیں کہ جب تک پیسے نہیں تھے تنخواہ

کے لیے کام کرتے رہے اور جب اللہ نے اسباب دے دیے تو پڑھانا چھوڑ دیا کہ مجھے اب ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ پیسوں کے لیے ہی پڑھاتے تھے۔ یہ گناہ ہے، یہ جائز نہیں ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی کاریگری:

﴿اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱﴾﴾

فرمایا کہ آپ اس سے زرہیں بنائیں- سر پر پہننے والی لوہے کی ٹوپی بنائیں جس سے تلوار سے بچا جاتا ہے، جسے خَود بھی کہتے ہیں- اور اس کی کڑیاں ٹھیک توازن اور تناسب سے جوڑیں۔

﴿وَّ قَدِّرْ فِي السَّرْدِ﴾... ''سَرْد'' کا معنی ہوتا ہے بُننا اور ''قَدِّرْ'' یہ تقدیر سے مشتق ہے جس کا ایک معنی ہے کہ زرہ کی کڑیاں بنانے میں روزانہ کا ایک وقت متعین کریں کہ میں نے اتنے وقت میں بنانی ہیں، سارا وقت اس پر صَرف نہ کریں تاکہ عبادت اور دیگر امور میں خلل نہ آئے۔ تو اس سے نظم ثابت ہوتا ہے کہ کام کرنے والے عالم کو نظم وضبط کا خیال رکھنا چاہیے۔ کچھ وقت معاش کے لیے اور باقی وقت دین کے لیے... اور ''قَدِّرْ'' کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ آپ کڑیاں خاص انداز اور تناسب سے بنائیں تاکہ ٹیڑھی میڑھی نہ ہوں سیدھی ہوں، چھوٹی بڑی نہ ہوں بلکہ ساری برابر ہوں۔ تو اس سے آرائش ثابت ہوتی ہے کہ جب آپ کوئی مکان بنائیں تو خوبصوتی کا خیال رکھیں، آپ کپڑا بنائیں تو اچھا ہو، جوتا ہو تو اچھا ہو، چیز بنائیں تو درست ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایسی خوب صورتی شریعت میں مطلوب ہے۔ آپ مکان بناتے ہیں تو اس میں کوئی ایسی چیز بنالیں کہ خوب صورت لگے، رنگ آپ نے لگانا

ہے تو ایسا لگائیں جو آپ کے علاقے سے میچ کرتا ہو تو اس میں حرج کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارے علاقے میں پہاڑیاں نہیں ہیں، یہاں پر سبزہ کم ہوتا ہے اس لیے یہاں گہرے رنگ نہیں چلتے بلکہ ہلکے چلتے ہیں۔ جب آپ کشمیر، مری اور ان علاقوں میں جائیں جہاں سبزہ بہت ہے تو وہاں ڈارک کلر چلتے ہیں، کلر میں اٹھان نہ ہو تو کلر خوب صورت نہیں لگتا، درخت گھنے ہوتے ہیں، سفیدی سیاہی کی طرح ہوتی ہے، اب سرخی خوب نہ نکلے تو مکان کھل کر سامنے نہیں آتا۔ اس لیے وہاں گہرے کلر چلتے ہیں۔

﴿وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ﴾ آپ نیک کام کرتے رہیں، میں آپ کے کاموں کو دیکھتا ہوں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے اعزازات:

﴿وَ لِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَ اَسَلْنَا لَهٗ عَیْنَ الْقِطْرِ ؕ وَ مِنَ الْجِنِّ مَنْ یَّعْمَلُ بَیْنَ یَدَیْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ؕ وَ مَنْ یَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِیْرِ (۱۲)﴾

حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس گھوڑے بہت تھے۔ ایک دن سلیمان علیہ السلام گھوڑوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے، آپ دیکھ بھال میں اتنے منہمک ہوئے کہ آپ کی عصر کی نماز قضا ہو گئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو بہت دکھ ہوا تو آپ نے سارے گھوڑے ذبح کر کے صدقہ فرما دیے۔ سلیمان علیہ السلام پر کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ ان کی شریعت میں جیسے بھینس اور بکری کو کھانا جائز تھا ایسے ہی گھوڑے کا کھانا بھی جائز تھا تو جائز کام کیا۔ پھر ان کا اپنا مال تھا کسی اور کا نہیں تھا۔ اس لیے ذبح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اللہ رب العزت نے سلیمان علیہ السلام کی اس قربانی کو دیکھ کر گھوڑے کے

بدلے میں ہوا ان کے لیے مسخر فرمادی۔ پہلے سفر گھوڑوں پر ہوتا تھا، اب اللہ تعالیٰ نے گھوڑوں کے بدلے میں ہوا دے دی اور ہوا ایسی تیز رفتار ہوتی تھی کہ ایک گھوڑا ایک مہینا مسلسل چلتا رہے تو جتنا سفر وہ ایک مہینے میں طے کرتا تھا اتنا سفر ہوا تخت کو لے کر صبح کے وقت طے کرلیتی تھی۔ اس لیے سلیمان علیہ السلام ایک دن میں اتنا لمبا سفر طے کرتے جتنا تیز رفتار گھوڑا مسلسل دو ماہ چلنے سے طے کرتا تھا۔ اب سلیمان علیہ السلام تخت سجا دیتے، گھر والے بھی اس پر ہیں، وزرائے سلطنت بھی اس پر ہیں، اپنی جماعت کے علماء بھی ساتھ ہیں اور صبح سلیمان علیہ السلام ملک شام میں ہوتے اور دوپہر کو اصطخر -جگہ کا نام ہے- وہاں پہنچ جاتے، ادھر قیلولہ کیا کھانا کھایا اور وہاں سے تخت اڑا تو رات کابل میں گزارتے تھے۔

شاہانہ زندگی تقویٰ کے خلاف نہیں!

اللہ نے کیسی شاہانہ زندگی عطا کی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی عالم کی شاہانہ زندگی شریعت کے خلاف نہیں ہے۔ میں اس لیے اکثر یہ بات کہا کرتا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں بات چلتی ہے کہ ہمارے شیخ صاحب بہت نیک آدمی ہیں کیونکہ پچیس سال سے صحیح بخاری پڑھانے کے لیے سائیکل پر آرہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ کہو کہ ہمارے شیخ صاحب بہت غریب آدمی ہیں پچیس سال سے سائیکل پر صحیح بخاری پڑھانے کے لیے آرہے ہیں۔ اگر سائیکل پر آنا تقویٰ کی علامت ہوتی تو صبح جو مزدور منڈی جاتے ہیں وہ بہت متقی ہیں، کیونکہ سب سائیکل پر جاتے ہیں۔ تو سواری کا نہ ہونا یہ تقویٰ کی علامت نہیں ہے بلکہ یہ غربت کی نشانی ہے۔ اس لیے یہ جو حضرات تقویٰ کا یہ معنی بیان کرتے ہیں یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔

اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں آپ کو یہ تو ملے گا کہ آپ کے گھر میں دو ماہ تک چولہا نہیں جلا لیکن آپ کو یہ نہیں ملے گا کہ آپ کی سواری کسی

اور صحابی سے کم تر ہو! اللہ کے نبی کی سواری مدینہ میں سب سے اچھی سواری ہوا کرتی تھی۔ مدینہ میں تھوڑا سا خطرہ ہوتا تو آپ گھوڑے کی پشت پر بیٹھتے اور پورے مدینے کا چکر ہوا کی طرح لگا لیتے، اچھی سواری کا ہونا یہ ہمارے پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اور براق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ سواری ہے کہ جس سے تیز رفتار سواری دنیا میں نہ آج تک پیدا ہوئی ہے اور نہ ہی قیامت کی صبح تک پیدا ہوگی۔ تو تیز رفتار سواری کا ہونا تو سنت ہے۔ تو جو علماء میں خوبیاں ہوتی ہیں ہم وہی چیزیں علماء میں عیب سمجھتے ہیں۔ اس لیے کسی عالم کے پاس اچھی گاڑی دیکھو تو اس کے لیے مزید دعا کرو کہ اللہ اس کو اور اچھی گاڑی دے، عالم کے لیے اچھی گاڑی کا ہونا، اچھی سواری کا ہونا، اچھی بود و باش کا ہونا یہ سنت کے خلاف نہیں ہے۔

سفید لباس کا اہتمام:

میں آپ کو مجبور نہیں کرتا کہ آپ پگڑی باندھیں لیکن میں بہت خوش ہوتا ہوں جب آپ کی پگڑی دیکھتا ہوں اور جب آپ کا سفید کپڑا دیکھتا ہوں۔ آپ طلبہ ہیں سفید کپڑا رکھنا بہت مشکل ہے، سفید کپڑا ہو پھر اسے کلف لگائیں پھر اس کو سنبھالیں یہ بہت مشکل ہے، اس لیے آپ کی مجبوری ہے لیکن پسند سفید کپڑے کریں اور جب اللہ توفیق دیں تو سفید لباس اختیار کریں۔ اچھی پگڑی پہننا یہ عالم کی شان کے لائق ہے۔ اس کا بہت خیال کیا کریں۔

تانبے کا چشمہ:

﴿وَاَسَلۡنَا لَهٗ عَيۡنَ الۡقِطۡرِ ؕ﴾

اور ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لیے تانبے کا چشمہ نکال دیا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے لوہا نرم کر دیا اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے تانبے کا چشمہ نکال دیا اور یہ چشمہ بہتا تھا اور ٹھنڈا ہوتا تھا

تاکہ اس سے برتن اور دیگر ضرورت کی اشیاء بنانے میں دقت پیش نہ آئے اور یہ چشمہ میلوں لمبا تھا۔

﴿وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۭ﴾

اور بعض جنات ایسے تھے رب تعالیٰ کے حکم سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے کام کرتے تھے۔ مثلاً سفر پر جاتے تو ہدہد کے ذمہ تھا کہ پانی دیکھے۔ اللہ نے ہدہد کو یہ صلاحیت دی تھی کہ وہ زمین پر کھڑا ہوتا تو اس کو پتا چل جاتا کہ پانی کتنا نیچے ہے۔ اس پانی کو جنات فوراً نکال لیتے اور تالاب بناتے اور یہ لشکر وہیں رات گزارتا تھا۔ اب بتاؤ! اتنی تیز رفتار دنیا میں کس کی سروس ہوگی جو اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی۔

تسخیر جن کا مسئلہ:

تسخیرِ جن کا مسئلہ ذہن میں رکھیں۔ جنات کو مسخر کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس پر علامہ بدرالدین ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ شبلی دمشقی حنفی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مستقل کتاب "آکام المرجان فی احکام الجان" ہے، اس میں بڑی تفصیل سے یہ مسئلہ لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر جنات انسان کے کسی عمل دخل کے بغیر مسخر ہو جائیں تو یہ اللہ کا فضل ہے اور ان سے کام لینا جائز ہے جیسے جنات من جانب اللہ سلیمان علیہ السلام کے تابع تھے تو یہ ان کا معجزہ ہے۔ اسی طرح بعض صحابہ کرام مثلاً حضرت ابوہریرہ، حضرت زید، حضرت ابی ابن کعب، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں بھی منقول ہے کہ جنات ان کے تابع تھے اور وہ ان سے کام لیتے تھے۔ جنات کا صحابہ کرام کے تابع ہونا بطور کرامت تھا۔

جنات کو تابع کرنے کے لیے اگر کفریہ کلمات یا کفریہ افعال کیے جائیں تو یہ عمل کفر ہے اور اس طرح تابع کرنا بھی ناجائز اور حرام ہے کیونکہ نافرمان یعنی کافر

جنوں کو تابع کرنے اور ان سے کام لینے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے کفریہ کلمات کہے جائیں کہ جن سے شیاطین جنات خوش ہو جائیں اور خوش ہو کر اس بندے کا کام کریں تو یہ حرام ناجائز ہے۔ جیسے کسی جن کو تابع کرنے کے لیے معاذ اللہ قرآن جلانا یا العیاذ باللہ قرآن پر کھڑے ہو کر غسل کرنا یہ جائز نہیں ہے، حرام ہے۔ اسی طرح کسی فاسق جن کو تابع کرنے کے لیے گناہ کا ارتکاب کرنا یہ بھی جائز نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص جنات کو تابع کرتا ہے، کلمات کفریہ کا ارتکاب بھی نہیں کرتا اسی طرح اعمال فسق کو بھی اختیار نہیں کرتا بلکہ شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے قرآنی آیات، اللہ تعالیٰ کے مبارک ناموں یا ایسے کلمات کے ذریعے تابع کرتا ہو جن کا معنی صحیح ہے تو اس طرح جنات کو تابع کرنا جائز ہے لیکن جنات کو تابع کرنا دفعِ مضرت کے لیے ہو جلبِ منفعت کے لیے نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے آزاد کو غلام بنانا لازم آتا ہے۔ آپ نے اعمال کی وجہ سے جو جن تابع کیا ہے تو اسے غلام بنایا ہے اس سے کام لینے کے لیے، یہ تو جائز ہی نہیں ہے۔ ہاں کسی نقصان سے بچنے کے لیے آپ اس کو تابع رکھیں تو یہ جائز ہے۔

تو سلیمان علیہ السلام جنات سے کام لیتے تھے۔

سرکش جنات کی سزا:

﴿وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿١٢﴾﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ جس جن نے ہماری بات نہ مانی اور ہمارے حکم سے ہٹ کر ٹیڑھا راستہ اختیار کیا تو ہم اس کو آگ کا سخت عذاب دیں گے۔

آخرت کا عذاب تو ہو گا ہی لیکن ایک روایت میں ہے کہ دنیا میں بھی ان جنات پر ایک فرشتہ متعین تھا جس کے پاس آگ کا کوڑا ہوتا تھا، جو جن سلیمان علیہ السلام کی اطاعت میں کوتاہی کرتا تو وہ فرشتہ اس کو آگ کے اس کوڑے سے مارتا تھا۔

اب اس پر اگر کسی کے ذہن میں سوال ہے کہ جنات تو خود آگ سے بنے تھے تو انہیں آگ کا کوڑا مارنے سے تکلیف کیسے ہو گی؟ اس کا جواب بہت آسان ہے کہ جیسے انسان مٹی سے بنا ہے لیکن مٹی کا ڈھیلا اسے مارو تو درد ہوتا ہے اسی طرح جن اگر چہ آگ سے بنے ہیں لیکن آگ کا کوڑا لگے تو انہیں بھی تکلیف ہوتی ہے۔

جنات کی ڈیوٹیاں:

﴿يَعۡمَلُوۡنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنۡ مَّحَارِيۡبَ وَ تَمَاثِيۡلَ وَ جِفَانٍ كَالۡجَوَابِ وَ قُدُوۡرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكۡرًا ؕ وَ قَلِيۡلٌ مِّنۡ عِبَادِىَ الشَّكُوۡرُ ﴿۱۳﴾﴾

جنات سلیمان علیہ السلام کے لیے وہ چیزیں بناتے جو سلیمان علیہ السلام چاہتے تھے جیسے اونچی اونچی عمارتیں، تصویریں، حوض کی طرح کے پانی بھرنے کے بڑے بڑے برتن اور ایسی بڑی بڑی دیگیں جو ایک ہی جگہ پڑی رہتی تھیں۔ اے داؤد کے خاندان والو! شکر بجالاؤ، میرے بندوں میں سے بہت کم ہیں جو شکر ادا کرتے ہیں۔

محراب کسے کہتے ہیں؟

مَحَارِیب: محراب کی جمع ہے، محراب کسی مکان کے اعلیٰ اور عمدہ حصے کو کہتے ہیں، محراب اس مخصوص کمرے کو بھی کہتے ہیں جو بادشاہ اور بڑے لوگ خاص اپنے لیے بناتے ہیں جس میں حکومتی امور سر انجام دیتے ہیں۔ محراب یہ حَرب سے مشتق ہے جس کا معنی جنگ ہے، بادشاہ لوگ جب اپنا خاص کمرہ بناتے ہیں تو اس تک عام بندے کی رسائی نہیں ہوتی اور جب کوئی شخص اس کمرہ خاص تک پہنچنے کی کوشش کرے تو اس سے جنگ بھی کرتے ہیں اس لیے اس کمرے کو محراب کہتے ہیں، اور محراب مسجد کے اگلے حصے کو بھی کہتے ہیں جس میں امام کھڑا ہوتا ہے۔ تو محراب کا معنی عام کمرہ بھی ہے اور محراب کا معنی اچھی عمارت بھی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں تصویر سازی:

﴿وَتَمَاثِيلَ﴾

تماثیل؛ تَمثال کی یا تِمثال کی جمع ہے، اس کا معنی ہے تصویریں۔

ایک تصویر ہوتی ہے ذی روح کی اور ایک تصویر ہوتی ہے جو ذی روح کی نہ ہو اور جو ذی روح کی نہ ہو تو اس کی دو قسمیں ہیں: ایک اس چیز کی تصویر جو جامد ہو جیسے پتھر ہے اور ایک اس چیز کی تصویر جو بڑھے جیسے درخت ہے۔ یہ تین قسم کی تصاویر ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں ذی روح کی اور غیر ذی روح کی دونوں قسموں کی تصاویر جائز تھیں اور وہ بنواتے بھی تھے۔ اس پر تو کوئی کلام نہیں ہے۔

موجودہ دور میں تصویر کا حکم:

ہمارے دور میں جو غیر ذی روح کی تصویر ہے جیسے درخت، پتھر اور مکانات وغیرہ اس کے جواز میں بھی کوئی اشکال نہیں ہے۔ ہاں البتہ جاندار کی تصویر ہو تو احادیث میں اس پر بہت زیادہ وعیدیں آئی ہیں۔ ایک حدیث پاک میں ہے:

"أَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْمُصَوِّرُونَ." [149]

کہ سخت ترین عذاب قیامت کے دن ان کو ہو گا جو تصویریں بناتے ہیں۔

اور ایک حدیث پاک میں ہے:

"كُلُّ مُصَوِّرٍ فِي النَّارِ." [150]

کہ یہ تصویریں بنانے والے سارے جہنم میں ہوں گے۔

تو مختلف قسم کی وعیدیں احادیث میں آئی ہیں۔

149۔ صحیح البخاری، رقم: 5954

150۔ صحیح مسلم، رقم: 2110

اب آج کے دور میں تصویر جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ تصویر جائز ہے کیونکہ پہلے لوگ تصاویر بناتے پھر ان کا احترام کرتے، عظمت دل میں آتی اور ان کی پوجا شروع ہو جاتی تھی اس وجہ سے حرام تھی اور آج کے دور میں چونکہ یہ وجہ نہیں ہے لہذا تصویر جائز ہے۔

تصویر کے جواز اور عدم جواز کا مسئلہ الگ ہے لیکن یہ دلیل ٹھیک نہیں ہے۔

حرمتِ تصویر کی وجوہات:

تصاویر کے حرام ہونے کی چار وجوہات ہیں:

1: ایک وجہ بت پرستی ہے کہ لوگ تصویر، مورتی بنا کر اس کی پوجا کرتے تھے اس لیے حرام ہے۔

2: دوسری وجہ کہ تصویر ایسی چیز ہے جو زینت ہے لیکن زینت زائد از ضرورت ہے۔ بعض لوگ اپنے گھر میں جانداروں کی تصاویر لٹکاتے ہیں اس لیے یہ جائز نہیں ہے۔

3: تصویر پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نفرت کا اظہار فرمایا ہے۔ فرمایا: ”لَاتَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيْهِ كَلْبٌ وَلَا تَصَاوِيْرُ“[151] ایسے گھر میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے جہاں کتا ہو یا تصویر ہو۔ تو تصویر کو کتے کے ساتھ شمار کیا ہے، جس طرح کتا قابل نفرت ہے اسی طرح تصویر بھی قابل نفرت ہے۔ اب کتے کی قباحت کی کیا وجہ ہے؟ جس طرح اس کی وجہ نہیں بتائی اسی طرح تصویر کے قابلِ نفرت ہونے کی وجہ بھی نہیں بتائی۔

4: ”مصور“ اللہ رب العزت کی خاص صفت ہے، ﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي

151۔ صحیح البخاری، رقم:5949

الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ﴾[152] وہی اللہ ہے جو ماؤں کے پیٹ میں تمہاری تصویریں بناتا ہے۔ جو بندہ تصویریں بناتا ہے گویا وہ اللہ کی صفتِ مصوری میں خود کو شریک کرتا ہے اور قیامت کے دن اللہ فرمائیں گے کہ تم تصاویر بناتے تھے مگر روح نہیں ڈال سکتے تھے، میں تصاویر بناتا تھا اور روح بھی ڈالتا تھا۔ اگر تم تصویر میں روح ڈال سکتے ہو تو ڈال لو! یہ نہیں ڈال سکے گا تو سخت عذاب کا مستحق ہو گا۔ اس لیے جائز نہیں ہے۔

تصویر کے بارے میں رائے:

مجھ سے کوئی بندہ بھی پوچھے تو میں کہتا ہوں کہ بھائی تصاویر حرام اور ناجائز ہیں، ہم تصویر کو جائز قرار دینے والوں میں شامل نہیں ہیں خواہ تصویر متحرک ہو خواہ تصویر جامد ہو۔ تصویر تصویر ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر ضرورت ہو تو آپ بنا لیں لیکن ضرورت بقدرِ ضرورت ہو اس سے زائد نہ ہو۔ اتنی بات میں ضرور کہتا ہوں کہ جو لوگ تصاویر بناتے ہیں اور حرام سمجھ کر بناتے ہیں اور بقدرِ ضرورت بناتے ہیں تو ان کی ضرورت پر ہم اعتراض نہ کریں کہ جی اس کی کیا ضرورت تھی؟! کیوں بنائی ہے! بھائی! یہ ہمارا مسئلہ ہے یا بنانے والے کا مسئلہ ہے؟ (بنانے والے کا۔ سامعین) تو ہم خواہ مخواہ اعتراض کیوں کریں! میں اس لیے کہتا ہوں کہ اپنے آپ کو مستقل ٹینشن میں مبتلا نہ کرو، خواہ مخواہ کسی کی نفرت اپنے دماغ میں مت بٹھاؤ!

مسئلہ عمومی بیان کریں لیکن فتویٰ نہ لگائیں:

میں نے آپ کو بتایا تھا کہ حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی صاحب دامت برکاتہم جب ہندوستان کے دورے پر تشریف لے گئے، میں ان کہ ہاں معہد الفقیر جھنگ گیا تو مجھے مولانا حبیب اللہ صاحب نے کہا: ہمیں دو باتوں پر بہت تعجب ہوا؛

152۔ آل عمران 6:3

ایک یہ کہ ہم مظاہر العلوم یا دیوبند جہاں بھی گئے ہیں مشائخ پوچھتے کہ مولانا الیاس گھمن صاحب کا کیا حال ہے؟ ہمارے ہاں آپ کی حیثیت ایک خطیب کی ہے اور بس! لیکن وہاں جا کر ہمیں احساس ہوا کہ آپ کی علمی حیثیت کیا ہے؟! دوسرا ایک جگہ ہم گاڑی پر جا رہے تھے تو مشائخ میں تصویر کی بات چلی تو سب نے کہا کہ ناجائز ہے، ان کا کہنا یہ تھا کہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے متحرک ڈیجیٹل تصویر پر دلائل پیش کیے تو ہم نے اس کا جواب انہیں بھجوا دیا ہے، مولانا حبیب اللہ صاحب کہتے ہیں کہ میں نے خود کہا کہ مولانا گھمن صاحب تو بناتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کی بات نہ کریں ان کو چھوڑیں۔

تو مشائخ کا ذہن ہے کہ عمومی مسئلہ بیان کریں، فرد پر فتویٰ نہ لگائیں۔

جنوں کی کاریگری بڑی بڑی دیگیں:

﴿وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ﴾

اور جنات پانی کے لیے بڑے بڑے برتن بناتے جیسے بڑے بڑے حوض ہوتے ہیں تالاب کی طرح کے اور دیگیں بناتے جو ایک جگہ پر جمی ہوتیں۔ اتنی بڑی دیگ ہوتی کہ اس کو اٹھانا مشکل ہوتا۔ ظاہر ہے کہ جنات اس کو بناتے تھے، جنات اس کو پکاتے تھے، عام بندہ اس کو کیسے اٹھا سکتا تھا۔ تو یہ بڑی بڑی دیگیں ہوتی تھیں جس میں کھانے پکاتے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات:

﴿فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ؕ﴿۱۴﴾﴾

حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کی تعمیر کا کام شروع کیا اور بیت المقدس کا جو بنیادی کام ہے وہ مکمل ہو گیا تھا۔ بنیادی کام کے مکمل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کی تعمیر ہونے کے بعد اللہ سے دعائیں مانگیں:

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعائیں:

- یا اللہ! جو گناہ گار مسجدِ اقصیٰ میں آکر توبہ کرے تو آپ اس کی توبہ کو قبول فرمالیں۔
- اگر کوئی بے امن شخص خوف اور خطرہ سے بچنے کے لیے اس مسجد میں آئے تو اس کو امن عطا فرمادیں۔
- جو مریض اس مسجد میں داخل ہو تو اس کو شفا عطا فرمادیں۔
- اگر کوئی فقیر اس مسجد میں آئے تو اس کو غنی فرمادیں۔
- جو اس مسجد میں داخل ہو جب تک وہ اس میں رہے آپ اس پر نظر کرم اور نظر رحمت فرما دیں سوائے اس شخص کے جو کسی بے دینی کے کام میں مشغول ہو یا کسی ظلم و ستم کا کام کر رہا ہو۔

یہ پانچ دعائیں سلیمان علیہ السلام نے مانگیں ہر اس بندے کے لیے جو بیت المقدس میں داخل ہو۔ تو تعمیر مکمل ہوئی تب ہی تو دعائیں مانگی ہیں۔

جیسے ہمارے مرکز اھل السنۃ والجماعۃ سرگودھا کی مسجد کے ہال کی تعمیر مکمل ہے، اب ہم چاہتے ہیں کہ پیسے ہوں تو اس کی سیلنگ کروائیں، پیسے ہوں تو اس کو رنگ کروائیں، پیسے ہوں تو اے سی لگوائیں۔ اب دیکھیں اصل کام تو مکمل ہو چکا ہے لیکن تھوڑا بہت کام جو اصل کام سے زائد ہے وہ باقی ہے۔ اسی طریقے سے بیت المقدس کا بنیادی کام تو مکمل تھا البتہ کچھ کام باقی تھا، اس پر تقریباً ایک سال لگنا تھا۔ اب سلیمان علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے وحی آئی کہ آپ کا دنیا سے جانے کا وقت آگیا ہے اور ان

جنات سے کام بھی لینا ہے۔ تو بحکمِ خداوندی سلیمان علیہ السلام نے شیشے کا ایک کمرہ بنایا۔ باہر سے بندہ اندر دیکھے اور اندر سے باہر دیکھے تو سب چیزیں نظر آتی تھیں۔ وہاں بیٹھ کر آپ علیہ السلام نگرانی کرتے رہے اور جنات بھی دیکھ رہے تھے کہ سلیمان علیہ السلام نگرانی فرما رہے ہیں۔

سلیمان علیہ السلام نے ایک دن مصلیٰ بچھایا اور اپنے ساتھ ایک عصا لے کر کھڑے ہو گئے۔ جنات دیکھ رہے تھے کہ آپ اب بھی ہماری نگرانی کر رہے ہیں اور اسی دوران ملک الموت نے باذن اللہ آپ کی روح قبض کر لی، آپ فوت ہو گئے لیکن دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ سلیمان علیہ السلام زندہ ہیں اور نگرانی کر رہے ہیں۔ ایک سال تک جنات اپنے کام میں لگے رہے۔ جب تعمیر کا کام مکمل ہوا اللہ نے دیمک کے کیڑے کو بھیجا، اس نے سلیمان علیہ السلام کے عصا کو کھایا، عصا گرا تو سلیمان علیہ السلام زمین پر گر گئے۔ پھر جنات کو پتا چلا کہ سلیمان علیہ السلام کو فوت ہوئے ایک سال گزر گیا ہے اور ہم کام میں لگے ہیں۔ ایسا کیوں کیا تھا؟ اس سے دو باتیں مقصود تھیں:

نمبر 1: بیت المقدس کا باقی ماندہ کام مکمل ہو جائے۔

نمبر 2: لوگوں کو اس بات کا پتا چل جائے کہ جنات عالم الغیب نہیں ہیں، یہ بے خبر اور بے بس ہیں، یہ اس لیے تاکہ میرے جانے کے بعد یہ لوگوں سے اپنی پوجا شروع نہ کروا دیں کہ ہم بڑے طاقت ور ہیں۔

منکرین حیات الانبیاء کے ایک شبہ کا جواب:

بعض لوگ اس سے استدلال کرتے ہیں کہ پیغمبر وفات کے بعد زندہ نہیں ہوتے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب لاٹھی گری تو سلیمان علیہ السلام فوراً گر گئے، اگر زندہ ہوتے تو نہ گرتے۔

ہم کہتے ہیں کہ لاٹھی کے گر جانے سے سلیمان علیہ السلام کا گر جانا اگر یہ دلیل ہو موت کی تو جب بندہ ٹیک لگا کر سو جائے اور ٹیک کو ہٹائیں تو بندہ گر جاتا ہے، یہ مردہ ہے یا زندہ ہے؟(زندہ۔ سامعین) تو ٹیک کے گرنے سے بندے کا گرنا اگر اس کی موت کی دلیل ہو تو سونے والے سارے مردے ہوتے کوئی بھی زندہ نہ ہوتا! اسی طرح ایک بندہ کمزور ہے جو لاٹھی کے سہارے پر چلتا ہے آپ اس کی لاٹھی کھینچیں تو وہ گر جاتا ہے، اب بتاؤ وہ زندہ ہے یا مردہ ہے؟(زندہ ہے۔ سامعین) اس کو تو کوئی مردہ نہیں کہتا! ایک سلیمان علیہ السلام ملے ہیں جن کو تم نے مردہ کہنا ہے العیاذ باللہ۔

میں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ ان لوگوں کی دلیل میں ضعف کتنا زیادہ ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ ماشاء اللہ یہ بہت قرآن بیان کرتے ہیں، ایسا اشکال پیش کیا کہ مزا آ گیا! میں نے کہا کہ گھر میں بیٹھ کر اشکال پیش کرنا کیا مشکل ہے! ان کے اپنے شاگرد ہیں، اپنے متبعین ہیں، واہ واہ لگی ہوئی ہے اور ان کو کیا چاہیے؟!

﴿فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۝۱۴﴾

جب سلیمان علیہ السلام گرے تو اس وقت جنوں کو معلوم ہوا کہ اگر ان کو غیب کا علم معلوم ہوتا تو وہ اس مشقت میں مبتلا نہ رہتے۔

﴿الْمُهِيْنِ﴾ کا معنی مشقت ہے، اس میں بہت سارے جنات ایسے تھے جو شوق سے کام نہیں کرتے تھے تبھی تو عذاب مھین فرمایا، اگر سارے شوق سے کام کرتے ہوتے تو ان کے لیے عذاب مھین نہ کہا جاتا۔ بہت سارے لوگ ہوتے ہیں جو دل سے کام کرنا نہیں چاہتے، مجبور ہوتے ہیں کہ بس اب پھنسے ہوئے ہیں تو کام کرنا ہی ہے۔

قوم سبا کا قصہ:

﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ﴾

"سبا" کسے کہتے ہیں؟ ایک حدیث پاک میں ہے کہ یمن میں ایک آدمی تھا جس کا نام سبا تھا، اس کے دس بیٹے تھے، چھ یمن میں رہے اور چار شام میں چلے گئے، ان کے آگے پھر ان کے بیٹوں کے ناموں ہی سے قبیلے چلے اور آگے نسل چلی۔

اور بعض کہتے ہیں کہ سبا؛ یمن کے بادشاہ اور اس ملک کے باشندوں کا لقب تھا۔

قوم سبا کے رہنے کی جگہ میں اللہ تعالی نے برکت عطا فرمائی تھی۔ ملک یمن کے دار الحکومت کا نام ہے "صنعاء" اس سے تین منزل کے فاصلے پر ایک شہر تھا "مآرب" اس میں یہ قوم آباد تھی۔ یہ ایک بہت خوبصورت جگہ تھی۔ ان کی سڑکوں کے دونوں طرف پھل دار باغات کے سلسلے تھے جو دور دراز تک چلے گئے تھے۔ پہاڑوں کے درمیان ایک وادی میں یہ شہر آباد تھا۔ یہاں کے بادشاہوں نے پہاڑوں کے درمیان میں ایک مضبوط ڈیم بنا دیا تھا جس میں پانی کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ پہاڑوں سے آنے والا پانی اور بارشوں کا پانی اس میں ذخیرہ ہوتا تھا۔ اس بند میں تین دروازے رکھے گئے تھے۔ ایک دروازہ اوپر تھا پھر نیچے، پھر نیچے۔ پہلے اوپر کا دروازہ کھولتے تو پانی آتا جس سے وہ لوگ اپنے استعمال کا پانی لے لیتے، کھیتوں کے لیے، اپنے استعمال کے لیے، جب اوپر کا پانی ختم ہو جاتا تو نیچے والا دروازہ کھولتے اور پانی استعمال کرتے اور اگر وہ بھی ختم ہو جاتا تو پھر نیچے والا دروازہ کھولتے تھے۔ اس ڈیم کے نیچے ایک تالاب بنا کر اس کے بارہ راستے بنا کر نہریں بنائی گئی تھی جن کے ذریعے شہر میں مختلف جگہوں پر پانی فراہم کیا جاتا تھا۔ ملکہ بلقیس جن کا واقعہ سورۃ النمل میں گزر چکا ہے تو وہ ملکہ بلقیس بھی اسی قوم میں سے تھیں۔

خیر میں خلاصہ عرض کر رہا ہوں کہ شہر کے دائیں بائیں جو دو پہاڑ تھے ان کے کناروں کی سڑکوں پر جو باغات لگائے گئے تھے ان میں پھل اتنی کثرت سے تھے کہ عورت خالی ٹوکری لے کر باغ میں داخل ہوتی تو پھل درختوں سے ٹوٹ کر خود بخود ٹوکری میں گرتے اور ٹوکری بھر جاتی۔ جب انہوں نے اللہ کی اس عظیم نعمت کی ناقدری کی تو اللہ نے ان کے بند کو توڑا، ان کو برباد کر دیا اور بند توڑنے کے لیے اس میں چوہے بھیجے، ان چوہوں نے بنیادوں کو کاٹا اور اس طرح ان کا وہ بند ٹوٹ گیا اور تباہی وبربادی ہوگئی۔ ان باغات کے بدلے میں اللہ نے ان کو اور باغات دیے، ان میں کیکر اور بیری کے درخت تھے۔ بعض بیری کے درخت اچھے ہوتے ہیں جن پر اچھا پھل لگتا ہے اور بعض کانٹے دار درخت ہوتے ہیں جن کا پھل بھی اچھا نہیں ہوتا۔

یمن سے لے کر شام تک ان کی بستیاں ملی ہوئی تھیں۔ جب یہ سفر کرتے تو ہر جگہ ان کو اچھا اسٹاپ ملتا لیکن بربادی کے بعد تو ایسے لگتا تھا کہ یہاں پر کوئی آبادی ہی نہیں تھی۔ اللہ ہمیں اپنی نعمتوں کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

رزق کی فراوانی قدرت کا انعام ہے:

﴿قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ وَ لٰـكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾﴾

آپ فرمائیں کہ میرا رب رزق کو پھیلاتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور کم کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اسی سورت کی آیت نمبر 39 میں ہے:

﴿قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ یَقْدِرُ لَهٗ﴾

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ تکرار ہے، وہی آیت پہلے ہے اور وہی آیت بعد میں ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ تکرار نہیں ہے۔ یہ جو پہلی آیت ہے اس کا تعلق کفار کے ساتھ ہے، کیونکہ اس سے پہلے ہے:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡهَآ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ کٰفِرُوۡنَ ﴿۳۴﴾ وَقَالُوۡا نَحۡنُ اَکۡثَرُ اَمۡوَالًا وَّ اَوۡلَادًا ۙ وَّ مَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِیۡنَ ﴿۳۵﴾﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس بستی میں ہم نے اپنا کوئی پیغمبر بھیجا تو اس بستی والوں میں سے خوشحال اور مال والے لوگوں نے کہا: ہم اس پیغام کا انکار کرتے ہیں جو تم لائے ہو! اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہمارا مال بھی تم سے زیادہ ہے اور ہماری اولاد بھی تم سے زیادہ ہے اور ہمیں عذاب بھی نہیں ہو گا!

کیونکہ اگر ہم اللہ کے پسندیدہ بندے نہ ہوتے تو اللہ دنیا میں ہمیں دولت نہ دیتا، جب دنیا میں دی ہے تو موت کے بعد ہمیں عذاب کیوں دے گا؟! تو اللہ فرماتے ہیں کہ ان کو سمجھاؤ کہ رزق اللہ جس کو چاہتے ہیں زیادہ دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں کم دیتے ہیں۔ تو مال اور اولاد کا زیادہ ہونا اللہ کے محبوب ہونے کی نشانی نہیں ہے۔ اس آیت کا تعلق کفار کے ساتھ ہے۔

اگلی آیت نمبر 39 کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ حکم اللہ نے اپنے خاص بندوں یعنی مؤمنین سے فرمایا ہے کہ دیکھو! تم ایمان والے ہو، تقویٰ والے ہو، تمہارا خدا پر اعتقاد ہے، اس لیے اگر مال مل جائے تو مال کی محبت کی وجہ سے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم صدقہ کرنا کم کر دو، مال زیادہ ملے تو خرچ کرنا کم کر دو بلکہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو کیونکہ میں جس کو چاہتا ہوں رزق زیادہ دیتا ہوں، جس کو چاہتا ہوں کم دیتا ہوں، ﴿وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَهُوَ یُخۡلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ ﴿۳۹﴾﴾ اگر تم نے مال راہِ خدا میں دے دیا تو مال کم نہیں ہو گا میں اس کے بدلے میں تمہیں اور مال دوں گا۔

تو پہلی آیت کا تعلق کفار کے ساتھ ہے اور دوسری کا تعلق مؤمنین کے ساتھ۔

اس کا ایک جواب یہ بھی ہے کہ پہلی آیت کا تعلق مختلف لوگوں کے ساتھ ہے کہ ہم نے بعض لوگوں کو رزق میں فراخی عطا فرمائی ہے اور بعض لوگوں کو رزق کی کمی دی ہے اور اس دوسری آیت کا تعلق ایک ہی بندے کے ساتھ ہے لیکن احوال کا فرق ہے۔ ایک بندہ ہے کبھی اس پر مال کی وسعت ہوتی ہے اور وہی بندہ ہے کہ کبھی اس پر مال کی تنگی ہوتی ہے۔ تو سمجھایا کہ اگر مال کی وسعت ہو تو وہ بھی ہماری طرف سے ہے اور کبھی مال کی تنگی ہو تو وہ بھی ہماری طرف سے ہے۔ اب کوئی تکرار نہیں۔

مال خرچ کرنے کی عادت ڈالیں!

﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ﴾

تم جو چیز بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تو اللہ اس کا بدل تمہیں عطا فرماتا ہے۔

حدیث پاک میں ہے کہ ہر روز صبح کے وقت دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں، ایک فرشتہ کہتا ہے: "اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا" کہ اے اللہ! جس نے مال خرچ کیا ہے اس کو اس کے بدلے میں اور مال عطا فرما، اور دوسرا فرشتہ کہتا ہے: "اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا" کہ اے اللہ! جو شخص مال خرچ نہیں کرتا اور بخل کرتا ہے اس کے مال کو ہلاک کر دے۔[153]

تو مال خرچ کرنے سے مال بڑھتا ہے، مال خرچ کرنے سے مال کبھی کم نہیں ہوتا۔ میں نے پرسوں بھی عرض کیا تھا آج پھر عرض کرتا ہوں کہ طلبہ بھی مال خرچ کرنے کی عادت ڈالیں، اللہ وسعت دیں گے اور آپ کا مال کم نہیں ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

153۔ صحیح البخاری، رقم: 1442

سورۃ فاطر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ جَاعِلِ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیۡۤ اَجۡنِحَۃٍ مَّثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ؕ یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱﴾﴾

ملائکہ اللہ کے قاصد ہیں:

ملائکہ کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ رب العزت نے ملائکہ کو اپنا قاصد بنا کر بھیجا ہے۔ قاصد کا معنی کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے درمیان فرشتے واسطہ ہوتے ہیں۔ یہ فرشتے کیسے ہیں؟ فرمایا: کسی کے دو پر ہیں، کسی کے تین پر ہیں، کسی کے چار پر ہیں، یہ دو تین چار میں حصر نہیں ہے کہ اس سے زائد پر نہیں ہیں کیونکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے بارے میں روایت میں ہے کہ ان کے چھ سو پر ہیں۔[154]

یہاں بتانا مقصود ہے کہ یہ پروں والے ہیں، دو دو، تین تین، چار چار اور اس سے بھی زائد پروں والے۔

حضرت عمر کے قبولِ اسلام کی دعا:

﴿اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَہٗ سُوۡٓءُ عَمَلِہٖ فَرَاٰہُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰہَ یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَ

154۔ صحیح البخاری، رقم: 4857

يَهۡدِيۡ مَنۡ يَّشَآءُ ۖ فَلَا تَذۡهَبۡ نَفۡسُكَ عَلَيۡهِمۡ حَسَرٰتٍ ۗ﴾

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ رب العزت سے دعا مانگی:

"اَللّٰهُمَّ أَعِزَّ الْإِسْلَامَ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَوْ بِأَبِيْ جَهْلِ بْنِ هِشَامٍ." [155]

یا اللہ! عمر بن خطاب یا عمرو بن ہشام جسے ابو جہل کہتے ہیں ان دونوں میں سے کسی ایک کی وجہ سے دین کو عزت دے دے۔

دونوں جرنیل ہیں، مضبوط ہیں، بہادر ہیں، ان میں سے کوئی ایک شخص کلمہ پڑھے گا تو اسلام کو ان کی شجاعت کی وجہ سے تقویت بہت ملے گی۔ اللہ رب العزت نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مقدر میں لکھا تھا تو انہوں نے کلمہ پڑھا۔ ان کے آنے سے اسلام بہت بلند ہوا۔ تو اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِيۡ مَنۡ يَّشَآءُ﴾ کہ اللہ جسے چاہتے ہیں ہدایت عطا فرما دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں گمراہ فرما دیتے ہیں۔

اس پر بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ جب گمراہ اللہ کرتے ہیں تو گمراہی میں بندے کے اختیار کو تو دخل نہ ہوا پھر بندے کو عذاب کیوں ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ رب العزت جو گمراہ کرتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اسبابِ ضلالت بندہ خود اختیار کرتا ہے، جیسے اسباب بندہ اختیار کرتا ہے اللہ ویسا نتیجہ عطا فرما دیتے ہیں۔

عزتوں کا مالک اللہ ہے:

﴿مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الۡعِزَّةُ جَمِيۡعًا﴾

155۔ المستدرک علی الصحیحین: ج4 ص35 رقم الحدیث 4542

دنیا میں کوئی شخص عزت حاصل کرنا چاہتا ہے مال کی وجہ سے، کوئی عزت حاصل کرنا چاہتا ہے اولاد کی وجہ سے، کوئی عزت حاصل کرنا چاہتا ہے لیڈر بن کر تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ عزت دینے والا تو میں ہوں، میری طرف سے جو عزت ملتی ہے وہ خالص عزت ہوتی ہے، باقی عزتوں میں ذلت ہوتی ہے وہ صرف دھوکہ ہوتا ہے۔

کلمات طیبات کا مصداق اور ان کی اہمیت:

﴿اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ﴾

اللہ رب العزت کی طرف پاک کلمات جاتے ہیں- پاک کلمات سے مراد کلمہ توحید اور اللہ کی ذات اور صفات کا علم ہے- اور نیک اعمال ان کو اوپر اٹھاتے ہیں۔ یہ ترجمہ اس صورت میں ہے کہ جب ﴿یَرۡفَعُہٗ﴾ میں ھُوَ ضمیر ﴿الۡعَمَلُ الصَّالِحُ﴾ کی طرف ہو اور "ہٗ" ضمیر یہ ﴿الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ﴾ کی طرف ہو، معنیٰ ہو گا کہ کلمات طیبات اللہ کی طرف جاتے ہیں اور اعمال صالحہ ان کلمات طیبات کو اوپر اٹھاتے ہیں یعنی اعمال صالحہ کی وجہ سے کلمات طیبات قبول ہوتے ہیں۔ اعمال صالحہ کے بغیر کلمات طیبات خواہ کلمہ توحید ہو یا کوئی اور ذکر و اذکار ہوں اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہوں گے۔

اب اس کو ذرا سمجھیں! یہاں پر بہت سارے حضرات نے لکھا ہے کہ عمل صالح کو تھوڑا سا وسیع کیا جائے تو اس میں تصدیقِ قلبی بھی آجاتی ہے اور دیگر اعمال مثلاً نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ بھی آجاتے ہیں۔ اب یہ جو کہا کہ اعمال صالحہ کے بغیر کلمات طیبات قبول نہیں تو عمل صالح سے مراد اگر تصدیق قلبی ہو یعنی دل سے انسان اللہ کی ذات پر اللہ کی صفات پر ایمان لائے تو یہ بات ٹھیک ہے کیونکہ اگر کوئی شخص زبان سے تو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہہ رہا ہے لیکن دل سے تصدیق نہیں کرتا بلکہ دل سے انکار کرتا ہے تو

اس کا یہ کلمہ قبول نہیں ہو گا۔

اور اگر اعمال صالحہ سے مراد نماز روزہ حج زکوٰۃ ہو تو اب مطلب یہ ہو گا کہ اعمالِ صالحہ کے بغیر کلمات طیبات قبول تو ہیں لیکن قبولیتِ تامہ کے لیے اعمال شرط ہیں۔ علماء کی زبان میں اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کلمات کی نفسِ قبولیت کے لیے تو اعمال شرط نہیں لیکن قبولیتِ تامہ کے لیے اعمال شرط ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک بندہ کلمہ بھی پڑھتا ہے، دل سے مانتا اور تصدیق بھی کرتا ہے لیکن اعمال نہیں کرتا۔ اب قیامت کے دن اس کا ایمان لانا قابلِ قبول تو ہو گا کہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب سے نجات ملے گی لیکن چونکہ عمل میں کوتاہی کر چکا ہے اس لیے اپنے گناہوں کی بقدر سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جائے گا۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ ﴿یَرۡفَعُہٗ﴾ میں ھُوَ ضمیر ﴿الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ﴾ کی طرف ہو اور "ہٗ" ضمیر یہ ﴿الۡعَمَلُ الصَّالِحُ﴾ کی طرف ہو۔ اب معنی بالکل برعکس بنے گا کہ کلمات طیبات اللہ کی طرف جاتے ہیں اور اعمال صالحہ کو یہ کلمات طیبات اٹھاتے ہیں یعنی کلمات طیبات کی وجہ سے اعمال صالحہ قبول ہوتے ہیں۔ مفسرین اس صورت میں معنی یہ کرتے ہیں کہ بندہ عمل صالح کرے لیکن ساتھ ساتھ ذکر اللہ کا بھی کثرت سے اہتمام کرے تو اس سے اس کے اعمال صالحہ مزین ہو جاتے ہیں اور اللہ کے ہاں جلد شرفِ قبولیت پا لیتے ہیں۔

ہر شخص کی عمر متعین ہے:

﴿وَ مَا یُعَمَّرُ مِنۡ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا یُنۡقَصُ مِنۡ عُمُرِہٖۤ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ﴾

کسی آدمی کو جو بھی عمر دی جاتی ہے یا اس کی عمر میں جو کمی ہوتی ہے تو وہ سب ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔

عمر کم ہونے کا معنی یہ نہیں کسی کی عمر دس سال ہے تو گھٹا کر نو سال کر دیں بلکہ کم ہونے کا معنی یہ ہے کہ جب عمر کا کچھ حصہ گزر جاتا ہے تو بندے کی کل عمر میں سے اتنی عمر کم ہو جاتی ہے مثلاً ایک بندے کی ٹوٹل عمر انیس سال ہے، نو سال اس نے گزار لیے اور دس سال باقی ہیں۔ تو گویا اس کی کل عمر میں سے جو نو سال کم ہو گئے ہیں یہ بھی اللہ کے علم میں ہیں اور جو دس سال باقی ہیں یہ بھی اللہ کے علم میں ہیں۔

عمر متعین ہے تو صلہ رحمی سے بڑھے گی کیسے؟

باقی جو حدیث پاک میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ وَيُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ" کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کے رزق کو بڑھا دیا جائے اور اس کی زندگی لمبی کر دی جائے تو "فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ" وہ رشتہ داروں کا خیال کرے، ان کے ساتھ نیک سلوک کرے۔[156]

تو بظاہر اس حدیث میں اور دیگر آیات میں تعارض ہے جن میں ہے کہ بندے کی عمر متعین ہے۔ سورۃ النحل میں ہے:

﴿فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٦١﴾﴾[157]

جب ان کی موت کا وقت آ پہنچے گا تو وہ ایک گھڑی بھی نہ اس وقت سے آگے ہو سکیں گے نہ پیچھے۔

تو عمر تو بندے کی متعین ہے، پھر اگر آدمی صلہ رحمی کرے گا تو عمر بڑھے گی کیسے؟ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: بندے کی عمر تو متعین

156۔ صحیح البخاری، رقم:5986

157۔النحل61:16

ہوتی ہے، جب مدت پوری ہوتی ہے تو اسے ایک گھڑی بھی مہلت نہیں دی جاتی لیکن عمر بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اس بندے کو اولاد دیں گے جو اس کے لیے دعائیں کرے گی تو انسان اپنی عمر میں جو نیک اعمال کرنا چاہتا تھا اس کی عمر تو نہیں بڑھی لیکن اس کی اولاد کی دعاؤں کا فائدہ اس کو پہنچے گا۔ گویا جس طرح زندہ رہنے سے انسان کو فائدہ ہوتا ہے اسی طرح اس کو موت کے بعد بھی فائدہ ملتا رہے گا۔ یہی مطلب ہے کہ اس کی عمر بڑھ گئی ہے۔

میٹھا اور کڑوا پانی:

﴿وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ؕ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾﴾

آگے بات سمجھائی ہے کہ دیکھو! دو دریا ہیں، دونوں برابر نہیں ہیں؛ ایک میٹھا ہے اس سے پیاس بجھتی ہے اور دوسرا کڑوا نمکین ہے۔ میٹھا حلق سے جلدی اترتا ہے اور کڑوا حلق سے جلدی نہیں اترتا۔

حدیث پاک میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب پانی پیتے تو پانی پینے کے بعد یہ دعا فرماتے تھے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ سَقَانَا عَذْبًا فُرَاتًا بِرَحْمَتِهٖ وَلَمْ يَجْعَلْهُ مِلْحًا أُجَاجًا بِذُنُوْبِنَا." [158]

تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں اپنی رحمت سے میٹھا پانی پلایا جس سے ہماری پیاس بجھ گئی اور ہماری بداعمالیوں کی وجہ سے اس پانی کو کڑوا نہیں بنایا۔

158۔ کنز العمال: ج7 ص42 رقم الحدیث 18222

منکرین حیات کی جہالت:

﴿وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيرُ ﴿١٩﴾ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّورُ ﴿٢٠﴾ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ﴿٢١﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَآءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۚ إِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُورِ ﴿٢٢﴾ إِنْ أَنْتَ إِلَّا نَذِيرٌ ﴿٢٣﴾﴾

اللہ نے یہاں کفر اور اسلام، شرک اور توحید اور مؤمن اور مشرک میں فرق بیان فرمایا ہے۔ فرمایا: اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں، ظلمات یعنی اندھیرے اور روشنی برابر نہیں، زندہ اور مردہ برابر نہیں۔ اللہ جس کو چاہتے ہیں سنا دیتے ہیں اور آپ نہیں سنا سکتے ان کو جو قبروں میں ہیں۔ آپ کا کام ڈرانا ہے۔

اب دیکھو! ان آیات سے یہ ثابت کرنا کہ انبیاء علیہم السلام نہیں سنتے یہ سراسر جہالت ہے، اس لیے کہ اس آیت میں قطعاً یہ نہیں ہے کہ میت سنتی نہیں ہے، اس میں تو یہ ہے کہ آپ سنا نہیں سکتے۔ ایک ہے کہ مردہ سنتا نہیں اور ایک ہے کہ آپ قبر والوں کو سنا نہیں سکتے۔ تو یہاں اِسماع کی نفی ہے سماع کی نفی نہیں ہے، سنانے کی نفی ہے سننے کی نفی نہیں ہے۔ اس لیے اس آیت کا سماعِ موتیٰ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض لوگ خواہ مخواہ کی بحث یہاں چھیڑ دیتے ہیں۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا وہاں سورت النمل کے درس میں کہ آگے سورت فاطر میں ایک آیت آئے گی اور اس کی وہ حضرات عموماً غلط تشریح کرتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے سماع کے قائل نہیں ہیں۔

چونکہ میری خود ان کے ایک مناظر سے -جو ابھی بھی زندہ ہیں- ملاقات اور بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آپ کا جو عقیدہ ہے کہ قبور میں انبیاء علیہم السلام سنتے ہیں یہ اکابر کا عقیدہ نہیں ہے، کیونکہ اکابر کی عبارات سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ قبر والا

مردہ نہیں سنتا۔ دلیل یہ آیت ہے: ﴿وَمَآ اَنۡتَ بِمُسۡمِعٍ مَّنۡ فِی الۡقُبُوۡرِ﴾ کہ اس آیت کے نیچے شاہ صاحب لکھتے ہیں:- یہ تفسیر عثمانی ہے موضح القرآن کا حوالہ دیا ہے؛

"تو نہیں سنانے والا قبر میں پڑے ہوؤں کو، حدیث میں آیا کہ مردوں سے سلام علیک کرو اور بہت جگہ مردوں کو خطاب کیا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ مردے کی روح سنتی ہے اور قبر میں پڑا ہے دھڑ، وہ نہیں سنتا"۔[159]

اب دیکھیں بظاہر یہ عبارت ہمارے خلاف ہے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ قبر میں جو دھڑ ہے وہ سنتا ہے اور شاہ صاحب کہتے ہیں کہ وہ نہیں سنتا۔

ہمارا ارادہ ہے ان شاء اللہ کہ دورہ تربیۃ العلماء میں اس قسم کی عبارات بھی پیش کریں اور اس قسم کی عبارات سمجھائیں جن سے دھوکہ دیا جاتا ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ اس کا جو مطلب آپ سمجھے ہیں وہ آپ بیان کریں، اس پر میں سوال کرتا ہوں اور جو میں سمجھا ہوں اس کو میں بیان کرتا ہوں اور اس پر آپ سوال کریں۔ اس نے کہا ہم تو یہ سمجھے ہیں کہ قبر والے نہیں سنتے، روح سنتی ہے اور وہ علیین میں ہے۔ میں نے کہا اس پر میرا سوال یہ ہے کہ مثال کے طور پر ہم یہاں پر ہیں، میرے والد صاحب کی قبر یہاں سے ایک ایکڑ کے فاصلے پر ہے، اس میں پڑا ہے دھڑ جس میں روح نہیں ہے روح علیین میں ہے، اب دیکھیں! علیین کا فاصلہ یہاں سے اور والد صاحب کی قبر سے برابر ہے، کوئی فرق نہیں ہے۔ علیین کدھر ہے؟ اوپر۔ اب والد صاحب کی قبر یہاں سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر بھی ہو تو فاصلہ علیین تک تو برابر ہے نا، فاصلے میں تو فرق نہیں ہے۔

تو میں نے کہا کہ ہم ہیں اپنے گاؤں میں اور والد صاحب کی قبر ہے قبرستان

159۔ تفسیر عثمانی: ج3 ص193

میں اور علیین اوپر ہے۔ اب آپ کا موقف یہ ہے کہ قبر میں پڑا ہے دھڑ وہ نہیں سنتا روح سنتی ہے۔ بتاؤ روح کہاں پر ہے؟ کہا جی علیین میں۔ میں نے کہا: آپ جو قبرستان میں قبر پر جا کر کہتے ہیں "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْقُبُوْرِ" وہ تو نہیں سنتا کیونکہ سننا تو روح نے ہے۔ تو آپ قبرستان جانے کے بجائے یہیں سے اوپر منہ کر کے کہا کریں "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْقُبُوْرِ" لوگ پوچھیں گے کہ یہ کیوں؟ تو آپ کہو کہ روح سنتی ہے اور وہ علیین میں ہے، قبرستان میں دھڑ پڑا ہے جو نہیں سنتا تو قبرستان میں جا کر مجھے سلام کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ اس لیے میں یہیں سے سلام کر رہا ہوں۔

میں نے کہا کہ ہمیں یہ بات سمجھائیں کہ روح اوپر ہے اور روح کا دنیا میں ہر جگہ سے فاصلہ مساوی ہے تو پھر اس کا معنی یہ ہوا کہ روح خاص جگہ سے سننے کے بجائے ہر جگہ سے سنے گی۔ تو میں نے کہا: آپ کا یہی عقیدہ ہے کہ روح ہر جگہ سے سنتی ہے؟ ادھر اگر اہلِ بدعت کہہ دیں کہ یہاں سے ہم صلوٰۃ پڑھیں تو حضور مدینہ میں سنتے ہیں تو آپ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شرک ہے، حضور اتنی دور سے کیسے سن لیتے ہیں! اور یہاں سے مدینے کا سفر کم ہے اور علیین کا سفر زیادہ ہے اور آپ کہتے ہیں دور سے مخلوق نہیں سنتی خالق کی صفت ہے دور سے سننا تو روح بھی تو مخلوق ہے یہ دور سے کیسے سنتی ہے؟! تو آپ جو معنی کرتے ہیں کہ روح سنتی ہے تو دنیا میں آپ کس کو سناتے ہیں؟ علیین کو سناتے ہیں؟ اگر علیین میں موجود روح کو سنائیں گے تو قبر پر کیوں جاتے ہیں؟، پھر گھر پر بیٹھ کر سلام کریں! کیونکہ سنانا جو علیین کو ہے۔

اور اگر آپ کہیں کہ ہم جو سلام کرتے ہیں اس کا معنی دعا ہے تو سوال یہ ہے کہ دعا کے لیے آپ قبرستان کیوں جاتے ہیں؟ وہاں تو وہ جسم ہے جسے آپ کے عقیدے کے مطابق نہ ثواب ہوتا ہے نہ اس کو عذاب ہوتا ہے اور آپ کے عقیدے کے مطابق نہ وہ سنتا ہے تو وہاں جا کر سلام کس کو کرتے ہیں؟ وہ دھڑ تو سنتے بھی نہیں

ہیں تو ان کو دعا دینے کا بھی فائدہ نہیں ہے۔ ہم اھل السنۃ والجماعۃ کے عقیدے کے مطابق تو جسم کو ثواب اور عذاب ہوتا ہے لیکن آپ کے عقیدے میں تو جسم کو ثواب اور عذاب نہیں ہوتا تو اس کو جا کر کیا دعا دیتے ہیں؟ دعا روح کو دینی چاہیے تو وہ گھر سے بیٹھ کر دے لیں، قبرستان جانے کی ضرورت کیا ہے؟

میں نے کہا کہ حضرت شاہ صاحب کی عبارت کا معنی اب میں کرتا ہوں، اس پر آپ سوال کریں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں احوال اَصالتاً اور اَصلاً جسم پر آتے ہیں اور تبعاً اور ضمناً روح پر آتے ہیں۔ دنیا میں کان سنتا ہے جو کہ جسم ہے اور کان کے واسطہ سے روح سنتی ہے، اسی طریقے سے دنیا میں زبان چکھتی ہے جو کہ جسم ہے اور زبان کے واسطہ سے روح مزے لیتی ہے، اور موت کے بعد احوال آتے ہیں اَصالتاً اور اَصلاً روح پر اور تبعاً اور ضمناً آتے ہیں جسم پر۔

اب اس کا معنی یہ ہے کہ جب آدمی دنیا میں زندہ ہوتا ہے تو جسم سنتا ہے اور جسم کے واسطہ سے روح سنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کے کان کاٹ دو تو روح نہیں سنتی، آنکھیں نکال دو تو روح نہیں دیکھتی تو اس کا معنی ہے کہ دنیا میں اصل جسم نے سننا ہے اور جسم کے واسطہ سے روح نے سننا ہے، اور موت کے بعد احوال براہِ راست روح پر آتے ہیں اور روح کے واسطہ سے جسم پر آتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ جو شاہ صاحب کا جملہ ہے کہ "حقیقت یہ ہے کہ مردے کی روح سنتی ہے" تو روح تو زمین پر نہیں ہے بلکہ وہ علیین میں ہے، اب یہ روح سنے گی کیسے؟ روح اس وقت سنے گی جب اس چیز کو سناؤ گے جس کا روح سے تعلق ہے اور وہ جسم ہے، "اور قبر میں پڑا ہے دھڑ، وہ نہیں سنتا" کیا معنی کہ اَصالتاً جسم نہیں سنتا بلکہ اَصالتاً روح سنتی ہے اور تبعاً جسم سنتا ہے۔

اس لیے ہم گھر سے "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْقُبُوْرِ" نہیں کہتے بلکہ قبر کے پاس جا کر کہتے ہیں، کیونکہ سننا تو روح نے ہے اور روح علیین میں ہے، اتنی دور سے

ہماری آواز سن نہیں سکتی تو ہم قبر پر جا کر مردے کو سلام کہیں گے جس کے ساتھ روح کا تعلق ہے تو روح اصلاً سنے گی اور مردہ تبعاً سنے گا۔

میں نے کہا: اس پر آپ اعتراض کریں اور اکابرین کی عبارات کو ہماری کسی بات کے خلاف ثابت کریں، اب اکابر کی عبارت ہمارے خلاف نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اکابر کی عبارات کی توضیح کی جائے تاکہ مطلب سمجھ میں آئے۔

نعمتِ باری تعالیٰ کا بیان:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ۭ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴿٢٧﴾ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ۭ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴿٢٨﴾﴾

فرمایا کہ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے مختلف رنگوں کے پھل اگائے اور پہاڑوں کے بھی مختلف رنگ ہیں سفید بھی ہیں، سرخ بھی ہیں، سخت سیاہ بھی ہیں اور اسی طرح انسانوں، جانوروں اور مویشیوں میں بھی ایسے ہیں جن کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ اللہ سے اس کے نیک بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں، علماء ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ غالب ہے اور مغفرت کرنے والا ہے۔

﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ اس جگہ "كَذٰلِكَ" کا تعلق یا "اِنَّمَا" کے ساتھ ہے کہ جس طرح پھلوں کے، پہاڑوں کے، انسانوں کے اور جانوروں کے رنگ مختلف ہیں اسی طرح علماء بھی اللہ سے ڈرنے میں مختلف ہیں، بعض کم ڈرتے ہیں بعض زیادہ ڈرتے ہیں۔ یا "كَذٰلِكَ" کا تعلق ﴿وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَ

﴿الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ﴾ کے ساتھ ہے یعنی جس طرح پھلوں کے رنگ مختلف ہیں، پہاڑوں کے رنگ مختلف ہیں اسی طرح انسانوں، جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔

خشیت کی بنیاد علم پر ہے، جتنا بڑا عالم ہو گا اتنی زیادہ اس کے دل میں خشیت الٰہیہ ہو گی۔ ﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ یہ مستقل بات ہے۔ پیچھے اللہ تعالیٰ نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا تھا: ﴿اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ﴾ کہ آپ کے ڈرانے کا نفع ان لوگوں کو ہوتا ہے جو اللہ سے بِن دیکھے ڈرتے ہیں، اب اسی مناسبت سے فرمایا کہ بن دیکھے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں، جن کا علم صحیح ہو وہ ڈرتے ہیں، باقی بندے ڈرنے والے نہیں ہیں۔

خشیتِ الٰہیہ عالم کی خصوصیت:

یہ جو ﴿اِنَّمَا﴾ کلمۂ حصر فرمایا تو بظاہر اس سے شبہ یہ ہوتا ہے کہ صرف علماء اللہ سے ڈرتے ہیں اور غیر علماء اللہ سے نہیں ڈرتے! حالانکہ علماء بھی ڈرتے ہیں اور غیر علماء بھی ڈرتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ﴿اِنَّمَا﴾ ہمیشہ حصر کے لیے نہیں آتا، بسا اوقات خصوصیت کے لیے بھی آتا ہے۔ تو یہاں یہ حصر کے لیے نہیں ہے بلکہ خصوصیت کے لیے ہے کہ اہلِ علم کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اللہ سے ضرور ڈرتے ہیں، اب غیر علماء ڈریں تو ڈریں، نہ ڈریں تو نہ ڈریں لیکن عالم ضرور ڈرتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ عالم ہو اور نہ ڈرے۔ اس کو ذہن میں رکھیں!

پھر خشیت دو قسم کی ہے: ایک ہے خشیتِ اعتقادی اور ایک ہے خشیتِ

حالی۔ خشیتِ اعتقادی کا معنی کہ بندے کا اعتقاد ہے کہ نہ مانیں تو اللہ سزا دیتے ہیں اور مانیں تو اللہ اچھی جزا دیتے ہیں، جو اعتقادی خشیت ہوتی ہے اس کے ساتھ عبادات تکلفاً ہوتی ہیں، جبراً ہوتی ہیں، شوق سے نہیں ہوتیں، رغبت سے نہیں ہوتیں اور جب خشیت صرف اعتقادی نہ ہو بلکہ خشیت حالی بھی ہو یعنی یہ خشیت آدمی کے دل میں یوں پختہ اور غالب آجائے کہ انسان کی حالت اور کیفیت بن جائے، اس وقت آدمی جو عبادات کرتا ہے تو وہ صرف تکلفاً نہیں ہوتیں بلکہ تقاضائے طبیعت بن جاتی ہیں۔

میں اس کی چھوٹی سی مثال دیتا ہوں کہ جیسے کوئی انسان دوا کھائے اور اس کا ذہن ہو کہ اس دوا کھانے سے بندے کو صحت ملتی ہے تو دوا پسند نہیں ہوتی کھاتا پھر بھی ہے اور اگر ایسی دوا ہو کہ بندے کا ذہن بھی ہو کہ اس سے شفا ملتی ہے اور وہ دوا بندے کو مرغوب بھی ہو تو پھر جب بندہ کھائے گا تو کھانے کا انداز اور ہو گا، اب مجبوراً نہیں کھائے گا بلکہ شوق اور رغبت سے کھائے گا۔ تو اللہ سے ڈرنا اگر صرف اعتقاداً ہو تو عبادت پھر تکلفاً ہوتی ہے اور اگر آدمی اللہ سے ڈرے اور صرف اعتقادا نہیں بلکہ حالاً بھی ڈرے تو پھر عبادت اس کا تقاضۂ بشریت بن جاتی ہے۔

امت کے تین قسم کے افراد:

﴿ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۚ فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ ۚ وَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ۚ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَيۡرٰتِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡفَضۡلُ الۡكَبِيۡرُ ﴿۳۲﴾﴾

اللہ نے اس امت کی خصوصیت بیان فرمائی ہے۔ فرمایا کہ ہم نے اس کتاب قرآن مجید کا وارث ان لوگوں کو بنایا ہے جن کو ہم نے چن لیا تھا لیکن اس امت کی پھر قسمیں ہیں؛ بعض ان میں ظالم ہیں، بعض ان میں معتدل ہیں اور بعض نیکیوں میں بہت

آگے بڑھے ہوئے ہیں اور یہ بہت بڑا افضل ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے یہ بات ثابت ہے کہ ظالم، معتدل اور سابق بالخیرات یہ تینوں امت محمدیہ کے منتخب افراد ہیں، اللہ نے اس کتاب کے لیے امت محمدیہ کو چنا ہے۔ جن کو چنا ہے ان میں ظالم بھی ہیں، ان میں معتدل بھی ہیں اور ان میں بہت اچھے بھی ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس امت کا جو سابق بالخیرات ہے یعنی ہر وقت نیک اعمال میں آگے بڑھنے والا ہے "يَدۡخُلُ الۡجَنَّةَ بِغَيۡرِ حِسَابٍ" وہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو گا، اور ان میں جو مقتصد یعنی معتدل ہے "يَدۡخُلُ الۡجَنَّةَ بِرَحۡمَةِ اللهِ" وہ اللہ کی رحمت سے جنت میں داخل ہو گا اور اس امت کے ظالم اور اصحاب اعراف "يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ بِشَفَاعَةِ مُحَمَّدٍ" یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی وجہ سے جنت میں جائیں گے۔[160]

ظالم، معتدل اور سابق بالخیرات کی تعریف:

ظالم، معتدل اور سابق بالخیرات کی تفصیل یہ لکھی ہے کہ...

- ظالم وہ ہے جو نیکیاں کرے اور گناہوں سے نہ بچے، حلال کام بھی کرتا ہے اور حرام بھی کرتا ہے۔
- اور معتدل وہ ہے جو حلال کام کرتا ہے اور حرام سے بچتا ہے لیکن مکروہات سے نہیں بچتا اور مستحبات کو نہیں کرتا۔
- اور سابق بالخیرات وہ ہے جو حلال کام کرتا ہے اور حرام سے بچتا ہے، مستحبات اپناتا ہے اور مکروہات سے بچتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض مباح

160۔ تفسیر ابن کثیر: ج5 ص285

چیزیں جن کے کرنے کی اجازت ہے وہ عبادت میں حد درجہ انہماک یا شبہات کی وجہ سے چھوڑ دیتا ہے۔

جنتی مردوں کا کنگن پہننا:

﴿جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَهَا یُحَلَّوۡنَ فِیۡهَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَهَبٍ وَّ لُؤۡلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمۡ فِیۡهَا حَرِیۡرٌ ﴿۳۳﴾﴾

یہ جو ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں ان میں مذکورہ لوگ داخل ہوں گے اور وہاں ان کو سونے کے کنگن اور موتیوں سے مزین کیا جائے گا اور ان باغات میں ان کا لباس ریشم ہو گا۔

بعض روایات میں ہے کہ دائیں ہاتھ میں سونے کے کنگن ہوں گے اور بائیں ہاتھ میں موتیوں اور جواہرات کے کنگن ہوں گے۔ یہ کبھی ذہن میں نہ لانا کہ زیورات پہننا تو عورتوں کا کام ہے تو جنت میں مرد زیور کیوں پہنیں گے؟ اس لیے کہ موت کے بعد جنت کے احوال الگ ہیں اور دنیا کے احوال الگ ہیں، اس لیے جنت والے معاملات کو دنیا پر قیاس کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ آدمی دنیا میں شراب پیتا ہے تو بالکل حرام ہے اور جب جنت میں شراب پیے گا تو بالکل حلال اور پاکیزہ ہے۔

کافر کے عذاب میں تخفیف نہیں ہو گی:

﴿وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَهُمۡ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا یُقۡضٰی عَلَیۡهِمۡ فَیَمُوۡتُوۡا وَ لَا یُخَفَّفُ عَنۡهُمۡ مِّنۡ عَذَابِهَا ؕ کَذٰلِکَ نَجۡزِیۡ کُلَّ کَفُوۡرٍ ﴿۳۶﴾﴾

جو لوگ کافر ہیں ان کا ٹھکانا جہنم کی آگ ہے اور جہنم میں ایسا نہیں ہو گا کہ ان کا فیصلہ ہی کر دیا جائے کہ وہ مر جائیں یعنی ان پر موت نہیں آئے گی اور نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا۔ ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ہر کافر کو۔

اس پر اعتراض یہ ہے کہ صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ ابو طالب جہنم میں جائیں گے اور ان کے عذاب میں تخفیف ہو گی کہ صرف ان کو آگ کے جوتے پہنا دیے جائیں گے جن کی وجہ سے ان کا دماغ ہنڈیا کی طرح ابلے گا۔ قرآن کریم کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب میں کمی نہیں ہو گی اور بخاری کی حدیث سے پتا چلتا ہے کہ عذاب میں تخفیف ہو گی۔ تو بظاہر یہ حدیث قرآن کریم کے خلاف ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جو فرمایا: ﴿وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا﴾ کہ ان کفار کے عذاب میں تخفیف نہیں ہو گی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر عذاب کے وہ مستحق ہوں گے اس میں تخفیف نہیں ہو گی۔ ابو طالب نے چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت ساتھ دیا ہے اس لیے ان کے لیے اتنا عذاب ہے کہ ان کے پاؤں میں آگ کے جوتے ڈال دیے جائیں گے، وہ اسی کے مستحق ہیں۔ ان کا عذاب اس سے کم نہیں ہو گا۔ اس میں پھر تخفیف کا لفظ کیوں استعمال ہوا ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا عذاب چونکہ عام کافروں کی نسبت کم ہے تو اس کمی پر صورت تخفیف کی تھی اس لیے وہاں تخفیف کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اب اشکال ختم ہو جائے گا۔

کافر اور مؤمن کی سزا میں فرق:

﴿كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ﴿٣٦﴾﴾

ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ہر کافر کو۔

اس سے پچھلی سورۃ سبا میں تھا:

﴿وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ﴿١٧﴾﴾[161]

کہ ہم صرف کافر ہی کو بدلہ دیتے ہیں۔

161۔ سبا 17:34

اب ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف کافر کو کفر کی سزا دیں گے باقی کسی اور کو سزا نہیں دیں گے حالانکہ مؤمن بھی اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے جہنم میں جائے گا۔ تو مؤمنوں کو بھی تو سزا ہو گی صرف کافروں کو تو نہیں ہو گی!

اس کا جواب اچھی طرح سمجھیں! ایک جواب تو یہ ہے کہ اللہ مؤمن کو ایسا عذاب نہیں دیتے جیسے قوم سبا کافر کو دیا ہے کہ ان کو تباہ و برباد کر کے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تھا، تو اس طرح کا عذاب اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو نہیں دیتے۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ کافر کو تو عذاب دیتے ہیں لیکن مؤمن کو جو سزا دیتے ہیں اس کو "عذاب" نہیں کہا جاتا کیونکہ عذاب کہتے ہیں "إِيلَامُ الْحَيِّ عَلٰى سَبِيْلِ الْهَوَانِ" کہ زندہ آدمی کو تکلیف دینا ذلیل کرنے کے لیے۔ کافر کو اللہ جہنم میں بھیج کر تکلیف دیں گے ذلیل کرنے کے لیے اور مؤمن کو اللہ جہنم میں بھیجیں گے تو وہ ذلیل کرنے کے لیے نہیں بلکہ پاک کرنے کے لیے بھیجیں گے کیونکہ اس نے جنت میں جانا ہے اور جنت میں ناپاک آدمی نہیں جاتا۔

اس بات کو ﴿وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٩٠﴾﴾[162] کے تحت حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر عثمانی میں لکھا ہے۔[163]، ﴿وَ يَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿٦٩﴾﴾[164] کے تحت حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں لکھا ہے[165] اور سورۃ سبا کی اس آیت ﴿وَ هَلْ نُجٰزِيْۤ اِلَّا الْكَفُوْرَ ﴿١٧﴾﴾ کے

162۔ البقرۃ 90:2

163۔ تفسیر عثمانی: ج 3 ص 95

164۔ الفرقان 69:25

165۔ بیان القرآن: ج 3 ص 23

تحت مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں لکھا ہے۔[166]

یہ جو بات میں کہہ رہا ہوں کہ کافر کو جہنم میں سزا ہو گی ذلیل کرنے کے لیے اور اہانت کے لیے اور اگر مسلمان کو جہنم میں بھیجا بھی گیا تو پاک کرنے کے لیے بھیجا جائے گا اگر اس کے خلاف اکابر کا کوئی حوالہ آپ کو ملے تو اس میں آپ کو تاویل کرنی پڑے گی۔ مثلاً سورۃ آل عمران میں ہے:

﴿رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ﴾[167]

یہاں اس آیت کے تحت تفسیر عثمانی میں علامہ عثمانی بھی لکھتے ہیں کہ

"جو شخص جتنی دیر دوزخ میں رہے گا اسی قدر رسوائی سمجھو۔ اس قاعدہ سے دائمی رسوائی صرف کفار کے لیے ہے۔ جن آیات میں عامۂ مومنین سے خِزی (رسوائی) کی نفی کی گئی ہے وہاں یہ ہی معنی سمجھنے چاہییں۔[168]

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حقیقتاً رسوا کرنے کے لیے نہیں ہو گا بلکہ صورتاً رسوائی ہو گی، اس لیے صورتاً رسوائی کی وجہ سے اس پر لفظ "خزی" کا اطلاق کر دیا گیا۔

بری تدبیر کا نتیجہ خود پر لَوٹتا ہے:

﴿وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ﴾

جو شخص کسی دوسرے کے بارے میں بری تدبیر کرتا ہے تو بری تدبیر کا نتیجہ خود اسی کو بھگتنا پڑتا ہے، دوسرے کا نقصان نہیں ہوتا۔ اس لیے کسی اپنے کے خلاف کبھی بھی کوئی بری تدبیر اختیار نہ کریں۔

166۔ معارف القرآن: ج7 ص284

167۔ آل عمران 192:3

168۔ تفسیر عثمانی: ج1 ص359

اس پر سوال ہوتا ہے کہ بسا اوقات کوئی انسان کسی کے خلاف بری تدبیر کرتا ہے اور جس کے خلاف بری تدبیر کرتا ہے اس کو نقصان بھی ہوتا ہے، تو اس کا کیا معنی کہ نقصان اسی کا ہوتا ہے جو کسی دوسرے کا نقصان سوچتا ہے حالانکہ جس کے خلاف تدبیر کی ہے نقصان تو اس کا بھی ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس شخص کے خلاف تدبیر کی ہے اس کا نقصان یقینی نہیں ہوتا، کبھی دنیا کا نقصان ہوگا کبھی نہیں ہوگا اور جس نے نقصان کیا اور دوسرے کے خلاف تدبیر کی اس کا اخروی نقصان یقینی ہے۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ جس نے تدبیر کی ہے اس کا بہت بڑا نقصان ہوگا جہنم میں اور جس کے خلاف تدبیر کی اگر اس کا کچھ نقصان ہو بھی گیا تو اس کے جہنم کے نقصان کے مقابلے میں اس کا دنیوی نقصان اتنا چھوٹا ہوگا کہ اس کو نقصان کہنا ہی نہیں چاہیے۔

اور تیسرا جواب یہ ہے کہ جس کے خلاف تدبیر کی ہے اور اس کا کچھ نقصان بھی ہو گیا تو اس کا یہ نقصان بہت کم ہے، اس ظاہری نقصان کے بدلے میں اس کو جنت میں جو نعمتیں ملیں گی، جو اس کو راحت ملے گی تو اس کو نقصان نہیں کہنا چاہیے۔ جیسے دنیا میں کسی شخص پر بیماری آجائے اور اس کے بدلے میں جنت کی نعمتیں ملیں تو یہ بیماری راحت اور رحمت بن جاتی ہے۔ اسی طرح اس شخص کا بظاہر نقصان ہے لیکن جب اس کا انعام ملے گا تو یہ نقصان بھی اس کو رحمت نظر آئے گا۔

کافر کے عذاب کے ساتھ جانوروں کی ہلاکت کیوں؟

﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾

یہاں ﴿النَّاسَ﴾ سے مراد کافر ہے اور ﴿بِمَا كَسَبُوْا﴾ سے مراد کفر ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اعمالِ کفریہ کی وجہ سے سزا دیں تو اس زمین پر کسی ذی روح کو نہ چھوڑیں، چاہے وہ جانور ہو یا انسان ہو۔

اس پر سوال یہ ہے کہ کافر کو اعمالِ کفر کی وجہ سے اگر سزا دی جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن اس کو سزا دیں اور کسی ذی روح کو بھی زندہ نہ چھوڑیں تو ذی روح کا کیا قصور ہے؟ اگر ذی روح مؤمن ہے تو اس کو تو سزا نہیں دینی چاہیے اور اگر جانور ہے تو وہ احکام کا مکلف ہی نہیں تو پھر اس کو سزا کیوں؟

اس کا جواب سمجھیں! جب اہل کفر بڑھ جائیں گے اور ایمان والے کم ہو جائیں گے تو پھر یوں سمجھو کہ دنیا کی بقاء کا مقصد ختم ہو گیا۔ دنیا کے پیدا کرنے کا مقصد تو یہ تھا کہ بندوں کا امتحان ہو، اللہ نے خیر کو بھی پیدا فرمایا اور شر کو بھی پیدا فرمایا، اب کوئی شر کو اختیار کرے گا اور کوئی خیر کو اختیار کرے گا تو یہ ان کا امتحان ہو گا۔ جب شر بہت غالب ہو گا اور خیر بالکل مغلوب ہو کر رہ جائے گی اب دنیا کو ختم کر دینا چاہیے کہ دنیا کا مقصد ہی ختم ہو گیا۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ جو مؤمن کو ختم کریں گے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ کافر کو کفر کی وجہ سے جو عذاب ہوا ہے مؤمن بھی اسی عذاب کی وجہ سے ختم ہو گا بلکہ بات یہ ہے کہ ختم مؤمن بھی ہو گا لیکن اس کے ختم ہونے کا سبب کوئی اور ہو گا کافر کو ملنے والا عذاب اس کا سبب نہیں ہو گا، اور یہ جو جانور زندہ نہیں رہیں گے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جانور انسانوں کے لیے ہیں، جب انسانوں کو نہیں رکھنا تو جانور کو رکھنے کا کچھ بھی فائدہ نہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.